واقعۂ کربلا

اور اس کا پس منظر

ایک نئے مطالعے کی روشنی میں

جدید ایڈیشن اہم اضافوں اور ضروری ترمیمات کے ساتھ

مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی

الفرقان بکڈپو ۳۱۔ نیا گاؤں مغربی (نظیر آباد) لکھنؤ ۲۲۶۰۱۸ انڈیا

واقعۂ کربلا

اور اس کا پس منظر

ایک نئے مطالعے کی روشنی میں

جدید ایڈیشن اہم اضافوں اور ضروری ترمیمات کے ساتھ

مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی

الفرقان بکڈپو ۱۱۴ نیا گاؤں مغربی نظیر آباد لکھنؤ

(حقوق طبع محفوظ ہیں)

پانچواں ایڈیشن —— ۲۰۰۸ء
صفحات —— ۳۱۶
کتابت —— محمد عبدالسمیع
کمپوزنگ —— پرنٹ لائن کمپیوٹرس، لکھنؤ
طباعت —— کاکوری آفسیٹ پریس، لکھنؤ
ناشر —— الفرقان بکڈپو، نظیر آباد لکھنؤ

قیمت: -/85 روپے صرف

یہ کتاب درج ذیل پتہ سے بھی حاصل کی جا سکتی ہے
FURQAN PUBLICATIONS
93B HANLEY ROAD
LONDON N4 3DW (U.K.)

انتساب

والد ماجد حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے نام

جن کے

فیضِ قلب و نظر کے لئے

میری ساری زندگی ممنون ہے

اور

اسی فیض کا اثر میری نظر میں یہ کتاب بھی ہے

جو انہیں کے ارشاد کی تعمیل میں لکھی گئی۔

فہرست

واقعہ کربلا اور اس کا پس منظر

عنوانات	صفحہ نمبر	عنوانات	صفحہ نمبر
دیباچہ طبع سوم	۱	اصلی بات جو کہنا تھی	۲۹
مکاتیب گرامی: ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب [illegible]	۷	سنی معاشرے پر شیعیت کے اثرات	۳۰
دیباچہ طبع دوم	۹	حضورؐ کی قرابت کا احترام یا عصمت کا عقیدہ	۳۱
افتتاحیہ از والد ماجد حضرت مولانا نعمانیؒ	۱۱	بے انصافی کی ایک مثال	۳۲
بچپن کی باتیں	۱۱	تکفیر کی تقریر یا طلب علم و تحقیق	۳۳
تحقیق کے اصول	۱۲	مومن کا معیار اور اس کی ذمہ داری	۳۷
مخدوم گرامی کے معمولات	۱۳	اس کام کی ضرورت	۳۹
اپنے گھر کی گھٹی	۱۳	کچھ حوالوں کے سلسلہ میں	۴۰
کچھ اپنا ماجرا	۱۳	تشکر و امتنان	۴۱
تبدیلی کا آغاز	۱۴	باب اول — ۱ شہادت عثمانؓ — خانہ جنگی — صلح حسنؓ	۴۳
شہرت عام کی تاثیر	۱۵	شہادت عثمانؓ اور خانہ جنگی	۴۳
ڈاکٹر [illegible] کا مضمون	۱۶	جنگ جمل اور صفین	۴۴
یہ کتاب	۱۷	حضرت علیؓ کی شہادت	۴۷
مقدمہ (از مصنف)	۱۸	حضرت حسنؓ کی خلافت	۴۷
[illegible] کا حال اور اس کی مثال	۲۱	عالی مقام بیٹا	۴۸
طبری کا اپنا اعتراف	۲۲	امن و یکجہتی کے بیس سال	۵۰
پھر کونسی بات عجیب ہے	۲۳	حضرت معاویہؓ اور حضرات حسنینؓ	۵۳
کربلا کے واقعہ میں غلط بیانی کے اسباب	۲۴	باب دوم — ۲ [illegible] — سبائی روایات اور حضرت حسینؓ	[illegible]
کام مشکل بھی اور ضروری بھی	۲۵		
ایک دلچسپ علمی بحث	۲۶		

قتل کوفہ ٦٣
حضرت حسینؓ کی رائے ٦٥
باب سوم — ٣
یزید کی ولیعہدی کی تجویز اور حضرت مغیرہ بن شعبہؓ ٦٩
ولیعہدی کی تجویز ٧٠
حضرت مغیرہؓ کا مقام صحابیت ٧١
حضرت مغیرہؓ خلفائے راشدینؓ کے دور میں ٧٣
روایتی انتقاص کا ایک اہم اصول اور حضرت مغیرہؓ ٧٥
حضرت مغیرہؓ کی دوسری خدمت ٧٦
ابو ہام کی روایت کا متن ٧٧
کچھ اور اس سے بڑھی ہوئی روایتیں ٨٠
حاصل کلام ٨١
ایک اور پہلو ٨٢
طبری کی روایت کا متن ٨٣
ایک اور سوال ٨٤
اور اب سند کی بات ٨٦
باب چہارم — ٤
ولیعہدی کی راہ میں زیاد کا وجود رکاوٹ؟ ٨٧
قرین قیاس بات ٨٨
ایک اور فائدہ ۔ ٩١
باب پنجم — ٥
ولیعہدی کی بیعت اور مخالفین کا قصہ ٩٢
نہ صرف ابن عباسؓ بلکہ ابن ابو بکرؓ بھی ٩٣
ابن کثیر کا بیان ٩٧
طبری کی روایت ٩٨
ایک سوال اور اس کا حل ١٠٠
وفود کی کہانی ١٠٢
سوالیہ نشان ١٠٣
ابن اثیر اور حضرت معاویہؓ کا سفر حجاز ١٠٩
ایک اور نظریہ ١١٣
واقعہ کی قرین قیاس صورت ١١٧
فیصلہ کن بات ١٢٣
باب ششم — ٦
یزید کی ولیعہدی پر حضرت معاویہؓ کو اصرار کیوں؟
اور دیگر حضرات کو اس سے اختلاف کیوں؟ ١٢٥
اصرار اور اس کی بنیاد ١٢٥
ابن خلدون کا کلام ١٢٨
اس کلام پر ایک تنقیدی نظر ١٣٢
اہل اختلاف کے اختلاف کی بنیاد ١٣٧
یزید اپنے ایک خطبے کے آئینہ میں ١٤٢
تنبیہ — ایک اہم فائدہ ١٤٧
باب ہفتم — ٧
حضرت امیر معاویہؓ کی وفات — عہد یزید کا آغاز — حضرت حسینؓ کی ہجرت ١٥١
یزید کو معاویہؓ کی وصیت ١٥١
مخالفین سے بیعت کا مطالبہ ١٥٥

اس واقعہ کی دوسری روایت ۱۵۴
تنقیح بحث ۱۵۸
مسعودی کی روایت ۱۵۹
کوفہ کی روانگی ۱۶۰
پورے کنبے کے ساتھ ۱۶۱
[illegible] ۱۶۲
خیرخواہوں اور خود غرضوں کے مشورے ۱۶۳
ایک اور روایت ۱۶۵
دونوں روایتوں کے نتیجے کا فرق ۱۶۶

باب نمبر-۸
[illegible] ۱۶۸
مسلم بن عقیل کا مشن ۱۶۹
مسلم بن عقیل کوفہ کو ۱۷۰
والی کوفہ حضرت نعمان بن بشیر کا [illegible] ۱۷۱
امیر یزید کو شکایت ۱۷۱
عبید اللہ بن زیاد کا تقرر ۱۷۲
کوفے میں تقریر ۱۷۲
[illegible] ۱۷۳
مسلم کی تبدیلی مکان ۱۷۳
ایک حملہ ۱۷۴
ایک اور حملہ ۱۷۵
[illegible] ۱۷۵
[illegible] ۱۷۶
شہادت مسلم کا اثر ۱۷۷
[illegible] ۱۸۹

باب نمبر-۹
[illegible] ۱۹۰
حج سے ایک دن پہلے روانگی ۱۹۰
خیر خواہ ایک بار پھر روکتے ہیں ۱۹۳
۱- حضرت عبداللہ بن عمر ۱۹۳
۲- ابو بکر بن عبد الرحمن ۱۹۴
۳- کوفی مخلصین ۱۹۵
عبداللہ بن جعفر کا خط ۱۹۶
والی مکہ کی طرف سے [illegible] کی دعوت ۱۹۷
[illegible] ۱۹۷
[illegible] ۱۹۷
[illegible]
[illegible] شہادت کی اطلاع ۱۹۸
فرزدق سے ملاقات ۱۹۸
[illegible] ۱۹۸
ساتھیوں کو آزادی ۱۹۹
واپسی کا مشورہ ۱۹۹
حضرت حر [illegible] ۲۰۰
سمت سفر کی تبدیلی اور منزل [illegible] ۲۰۱

باب نمبر-۱۰
کربلا کی سرگزشت
عمر بن سعد کی آمد ۲۰۳
صلح کی بات اور ناکامی ۲۰۳

ایک دوسری روایت سے تائید ۴۰۳
جنگ اور شہادت ۴۰۶
شمر کا چہرہ دوسری روایات میں ۴۰۸
دونوں روایتوں میں تطبیق ۴۱۰
عمر کے کردار کی کچھ اور تفصیلات ۴۱۰
اور یہ ہوا خود راوی کی اپنی کہانی ۴۱۳
حضرت حسینؓ اور رفقاء کی تقریریں ۴۱۵
معاملہ کا ایک اور پہلو ۴۲۲
زہیر بن قین کی تقریر ۴۲۳
ایک خاص نکتہ ۴۲۶
جنگ کی تفصیل ۴۲۷
مبارزت جنگ کے قصے ۴۲۷
[illegible] تک کے معرکے ۴۲۸
لمحہ وقت کے دامن میں لپٹے قصے ۴۳۰
داستان طرازی کے لیے تک ۴۳۲
سب سے بڑی مثال ۴۳۳
ایک تاویل کا حاصل ۴۳۳
قصہ مختصر ۴۳۸
بندش آب ۴۳۹
مسئلے کے کچھ اور پہلو ۴۴۰
روایت کی اندرونی شہادت ۴۴۲
خود راوی کے اوصاف ۴۴۳
خلاصہ کلام ۴۴۵
روایت حضرت باقرؓ کی خطا ۴۴۶
ناقابل انکار حقیقت ۴۴۸

باب یازدہم

[illegible]

خواتین کی بے حرمتی ۴۵۱
لاش کی بے حرمتی ۴۵۳
سر کی بے حرمتی
اور باقیات قافلہ سے بدسلوکی ۴۵۳
تنقید کی ایک نظر ۴۵۴
حمید بن مسلم کے تضادات ۴۵۴
قصر یزید میں ۴۵۷
حضرت محمد الباقر کی روایت اور یہ قصے ۴۵۹
امام ابن تیمیہ کا ارشاد ۴۶۴

باب دوازدہم

[illegible]

تو قصہ ختم ہو گیا؟ ۴۶۸
حضرت حسینؓ کا اقدام اور ابن تیمیہ ۴۶۸
قتل کی ذمہ داری کس پر؟ ۴۷۳
ابن زیاد کو سزا کیوں نہیں دی؟ ۴۷۳
ابن زیاد کیوں نامزد ہوا؟ ۴۷۶
آخر یہ بے توفیقی ۴۷۸
اختتامیہ ۴۸۱
اشاریہ ۴۸۵
کتابیات ۵۰۸

☆☆☆

دیباچہ طبع سوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن جنوری ۱۹۹۶ء میں نکلا تھا۔ مصنف کے لیے کوئی سوال اس گمان کا نہ تھا کہ چھ مہینے کے اندر ہی دوسرے ایڈیشن کی ضرورت پیش آجائے گی۔ اس لیے دوسرا ایڈیشن جولائی ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا تو اس میں نظر ثانی کا وہ ضروری کام بالکل نہ ہو سکا جس کے لیے کچھ مناسب مہلت درکار تھی۔ سوچ لیا گیا کہ جو کام رہ گیا ہے وہ ان شاء اللہ تیسرے ایڈیشن میں ہو جائے گا جس کی ضرورت پیش آنے میں شاید زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ مگر کتاب کی بحمداللہ مقبولیت کہ دوسرے ایڈیشن کے ساتھ ہی ساتھ مختلف مقامات پر — ہندوستان سے پاکستان میں — لوگوں نے مصنف یا پبلشر کی اجازت کے تکلف میں پڑے بغیر ہی اپنے طور پر اس کے ایڈیشن نکال ڈالے، جن میں سے چار تو خود مصنف تک بھی پہنچے۔ اس کے بعد ظاہر ہے کہ لکھنؤ کے تیسرے ایڈیشن کی نوبت کہاں جلدی آسکتی تھی۔ تاہم اب ضرورت پیش آگئی ہے اور یہ نیا ایڈیشن اب ان تمام اضافوں اور ترمیموں کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ جن کی ضرورت مصنف نے طبع اول کے بعد کتاب پڑھ کر خود محسوس کی یا بعض حضرات کے خطوط سے یہ ضرورت محسوس ہوئی۔

ترمیمات کا حصہ تو بہت معمولی سا، جزوی قسم کا ہے۔ البتہ اضافوں میں ایک تو مستقل ایک باب "اختتامیہ" کے عنوان سے آخر میں بڑھایا گیا ہے۔ اس کے بعد ایک مستقل ذکر ہے جس کی کمی خاص طور پر کتاب میں دلچسپی لینے والے اہل علم نے محسوس کی۔ ان دو مستقل اضافوں کے علاوہ باب اول اور باب دوم میں کئی صفحات کا اضافہ ہوا ہے اور بعض مقامات پر حواشی

(بقیہ صفحہ آئندہ پر)

بڑھائے گئے ہیں۔

انسان کا کوئی کام نقائص سے پوری طرح خالی تو کسی مرحلہ پر بھی نہیں ہو پاتا لیکن ان اضافوں اور ترمیموں کے ذریعے کوشش کی گئی ہے کہ کتاب علمی اور تحقیقی حیثیت سے مزید بہتر معیار کی ہو جائے اور پہلے سے زیادہ بہتر علمی و دینی خدمت ثابت ہو۔

کتاب کی اس پذیرائی کے پہلو بہ پہلو جس کی طرف اوپر کی سطروں میں اشارہ کیا گیا ہے دوسرے قسم کے تبصرے اور تاثرات بھی سامنے آئے۔ چنانچہ اس نئی اشاعت کے موقع پر ان کے بارے میں کچھ کہنا بھی مناسب ہوگا۔

یہ کتاب جیسا کہ اس کا نام بتا رہا ہے چودہ سو سالہ قدیم واقعے کے بارے میں بعض باتیں دہرانے کے بجائے [illegible] کہی گئی تھیں وہ باتیں مسلسل کہی جاتی رہی ہیں اور لوگوں کو ازبر ہیں ان کے اعادے کے علاوہ کتاب کے مقدمے سے اس کی ایک مختلف حیثیت کا ابھرنا لابدی بھی تھا۔ اس لیے پہلے ہی سے توقع تھی کہ کتاب کا طرز استدلال اور اس کا علمی اور تحقیقی انداز کتنا بھی مؤثر ہو جائے پھر بھی بہت سے روایتی تصور پر قائم ذہنوں کو اس سے ضرب پڑے گی اور بعض لوگ ضرور ایسے نکلیں گے جو ایک طرح کا غم و غصہ اور ردعمل کا اظہار کریں، بہرحال جو کچھ ہونے کا تھا۔ چنانچہ یہ دونوں ہی باتیں سامنے آئیں۔

بعض کے اس اظہار کرنے والوں نے یہ شکوہ کیا کہ اس میں زبان کی کچھ درشتی تلخی آگئی ہے۔ چنانچہ کتاب کی تحریر کا طرز تحسین کے ساتھ لیا گیا تھا اس سے کچھ زیادہ ہی قابل توجہ تھا لیکن تلخ نوائی

لہ [illegible]

کے لیے کتاب اول سے آخر تک بغور بلکہ بار بار پڑھی کہ اگر وہاں کوئی الفاظ اور کوئی عبارت ایسی رہ گئی ہو جس میں اس تاثر کی تصدیق کا پہلو نظر آتا ہو تو اس پر بھی نظرِ ثانی کر لی جائے۔ تاہم پڑھنے والے حضرات بھی کسی خاص مقام کی نشان دہی نہ فرما سکے۔ اصل یہاں کے اس تاثر کی بنیاد سوائے اس کے کچھ نہیں سمجھ میں آتا کہ یزید کے سلسلے میں جو سبائی اور حسینی تصور کے خلاف کافی صراحت اور وضاحت سے کام لیا گیا ہے۔ اس سے بعض حضرات کو یہ تاثر ہو گیا ہے۔ یعنی یزید کے خلاف حضرت حسینؓ کے موقف کے سلسلے میں جو یزید کے فسق و فجور کی بات لائی جاتی ہے اس کا کوئی ثبوت حضرت حسینؓ کی زبان سے بھی نہیں ملتا۔ یہ کہ اس کا ثبوت بھی کسی روایت میں دستیاب نہیں کہ ابن زیاد نے کربلا میں جو رویہ حضرت حسینؓ کے خلاف اختیار کیا جس سے تاریخ میں کربلا کا المیہ ثبت ہو گیا اس میں یزید کی مرضی بھی شامل تھی اور اس نے باقیات اہل بیت سے ان کو دمشق پہنچنے پر ناشائستہ برتاؤ بھی کیا۔ اس کی کچھ وضاحت بھی ہوئی اور اس کے خلاف بھی۔

ان دونوں باتوں کے بارے میں ہم نے اپنے موقف کی ضروری وضاحت اس ایڈیشن کے آخری باب "اختتامیہ" میں کی ہے جو انشاء اللہ قارئین کی نظر سے گزرے گی۔ یہاں البتہ اتنی بات بر محل مناسب ہوگی کہ یزید کے بارے میں بعض عجیب باتیں بھی لکھی گئی ہیں جس سے اس کی رواداری کے سمجھنے میں فرق پڑتا ہے۔ وہ مولوی اس بارے میں مصر ہیں کہ یزید کافر نہیں بلکہ ایسی ہستی ہے "قصہ در قصہ" لکھی گئی ہے چنانچہ ایک صاحب قلم پر یہ الفاظ بھی قلم سے نکل ہی گئے ہیں کہ:

> "یزید کا معاملہ اتنا نازک ہے کہ اس کے حق میں بالکل بے ضرر اور معقول بات کہتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔" ص ۱۰، ماہنامہ تجلی،

گو تجربہ و مشاہدہ کی حیثیت سے کہے جانے والے الفاظ میں جو بات واضح نظر آتی ہے وہ یہ کہ ایک فریق کے حق میں اس بے ضرر معقول بات کو بھی لوگ اس طرح بدگمان ہو جائیں کہ یہ کوئی ایسا معاملہ یا بات تو نہیں ہو سکتی۔ اس پر "رند کے رند رہے" کہی بات کا بھی الزام ہو جاتا ہے۔ اور سیدنا حضرت حسینؓ کی عزت اس پر موقوف ہے کہ یزید کے بارے میں ہر طرح کی بدگمانی کر کے مان لی جائے۔

جن لوگوں نے نظارہ [illegible] عمل کیا تھا ان میں سے خاص طور سے ایک کا اظہار اس بات کا ایک نشان ہوتا تھا کہ واقعۂ کربلا کے روایتی تصور سے محبت سے ہوتے ہوئے جب [illegible] لوگوں کی کسی تحریری شعبیت سے کس وجہ ہم آہنگ کر دیا ہے۔ یہ ہماری ایک مذہبی درسگاہ میں زیرِ تعلیم تھا مولانا کا منصب رکھنے والے ایک عالم فاضل تھے جنہوں نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے کتاب و صاحبِ کتاب کو توجہ کے بارہ اپنی نگاہ میں [illegible] صاف صاف لکھا کہ واقعۂ کربلا بدر کی شکست کا بدلہ تھا۔ اس کے الفاظ یہ تھے۔

> ۱۔ انھوں [illegible] مصنف نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا ہے کہ کوئی حادثہ یا واقعہ ماضی سے حال کے ایک اکائی کی شکل میں جدا نہیں کیا جا سکتا۔ کربلا کا واقعہ [illegible] کی ویرانی عداوتوں کا ایک منطقی نتیجہ (CONSEQUENCE) تھا یعنی [illegible] جو ظہور اسلام کے بعد [illegible] شکل میں ابھر کر سامنے آئیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ۲۳ سالہ دورِ نبوت میں [illegible] سال تک [illegible] قائم رہیں غزوۂ بدر میں مسلمانوں کے ہاتھوں [illegible] کو سب سے زیادہ [illegible] تھی جس کے سرغنہ ابو سفیان تھے اسی طرح غزوۂ احد میں [illegible] اور ان کی بیوی ہندہ نے جگر خوار [illegible] کا کردار [illegible] پس یہ وہ [illegible] فتح مکہ کے بعد یہ گروہ مسلمان [illegible] بقول سید قطب شہید کے مستسلم [illegible] مگر اس استسلام کے بعد اچانک [illegible] نفسانیت کو بھول گئے عقلاً محال بات ہے اور صحابہ کی مستند روایات سے ثابت ہے کہ چند [illegible] کے اظہار [illegible] ہوتے ہوئے بھی اپنے [illegible] غم اور [illegible] غضب کا اظہار کیا تھا۔
>
> ۔ . . . . اسلام کے پورے طور پر [illegible] ہونے کے بعد
>
> جب [illegible] تھیں [illegible] کی طرح

۱۔ [illegible] الاسلام [illegible]

کسی واضح دشمنی کا ثبوت دینے میں مضمر رہتا ہے۔ گزشتہ دور میں اگر یزید کے دن میں صلیبی جنگوں کا عظیم و خونساز جنگ موجود ہے اسی طرح اس گروہ میں بدر کے انتقام کا جذبہ سینے کے اندر بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح موجود رہا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خلافت سے ابتدائے اسلام کی طرف سے ان کے عناد کا تخم بیج گیا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے ان کا انکشاف نہیں ہوا۔؎۱"

اور پھر چند سطروں میں مصنف کو مزید تحقیق کا مشورہ دیتے ہوئے ان الفاظ پر اسے ختم کیا گیا ہے:

"اس مسودہ کا سرا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے سبب نہیں غزوۂ بدر کے واقعات سے مربوط کیا جائے تو تاریخی واقعات کی کڑیاں ایک دوسرے سے زیادہ پیوست نظر آئیں گی۔" ؎۲

اگر شیعی تبرا بازی دل و دماغ پر طاری نہ ہو چکی ہو تو آدمی اور کچھ نہیں تو یہ سوچ سکتا ہے کہ یہ کیا کہہ رہا ہوں! وہ لوگ جنہیں اہل سنت کے یہاں بلا شک و شبہ صحابیت کا درجہ حاصل ہے ان کے بارے میں یہ فتویٰ دے رہا ہوں کہ ان کے دل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عداوت رکھتے تھے کہہ رہا ہوں کہ بدر کے انتقام کی آگ ان کے سینوں میں بھڑکتی رہی تھی اور بدر کے ہی جذبۂ انتقام نے کربلا کے حادثے کی شکل اختیار کر لی! ذرا یہ بھی تو دیکھئے کہ آدمی اگر یہ سوچے تب بھی غزوۂ احد کا انتقام پورا لینے کے ساتھ تو معاملہ ختم ہو جانا چاہیے تھا کہ بدر کا انتقام تو اسی دوسرے غزوے میں ان لوگوں نے حالتِ کفر ہی میں لے لیا تھا اور اتنا لے لیا تھا کہ کلیجہ ٹھنڈا ہو جائے۔

ہم نے کتاب کے مقدمہ میں لکھا تھا کہ

"واقعۂ کربلا سے اور پیچھے جا کر دیکھا جائے تو شہیدِ مظلوم سیدنا عثمانؓ کی زندگی کا ایک ایسا باب ہے جو پھیلا ہوا ہے یہ پانچ رخ ہے جس کا پتہ نہیں چلتا۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ان حالات کو نئے رخ سے مطالعہ کر کے تحقیق کا حق ادا کیا جائے۔" ؎۳ مقدمہ ص

؎۱ گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام الگ الگ چیزیں ہیں۔ ؎۲ تعمیرِ حیات۔ لکھنؤ۔ ۱۰ مارچ ۱۹۷۱ء

لیکن یہ بات کہ شخصیت کے اثرات ہماری (یا میری) بعض فکری روش کا بھی ایک حصہ اس حد تک داخل ہو گئے ہیں اس کا اندازہ مقدمہ کی اس تحریر کے وقت ہی ہو سکا۔ ملاحظہ ہو صفحہ [illegible]۔

مصنف کے لئے نہایت اطمینان و مسرت کا مقام ہے کہ محترم ڈاکٹر محمد عبدالوہاب صاحب جیسے صاحب علم و فضل نے کتاب کو اپنی دلچسپی کے اظہار سے نوازا اور بعض گراں قدر مشورے بھی عنایت کر کے ممنون فرمائے۔

اس قابل مسرت بات کا ذکر بطور شکر نعمت یا تحدیث نعمت طبیعت کا تقاضا تھا مگر اس کے نتیجے میں ہمارے قارئین کی طبیعت کا تقاضا ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب موصوف کی تحریر بھی ان کے سامنے آئے اس لئے اس سلسلے کے دو خط کی نقول شامل ہیں۔ آخری صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔

عتیق الرحمٰن سنبھلی

لندن ۲۱ر اکتوبر ۱۹۹۹ء

نوٹ: گزشتہ سال بعض حلقوں میں کسی غلط فہمی سے ڈاکٹر صاحب کی خبر وفات شائع ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب بحمد اللہ بعمر ۱۰۱ر۹۹ بقید حیات ہیں۔ البتہ پیرانہ سالی کے عوارض کے ساتھ۔ قارئین سے دعائے خیر کی درخواست ہے۔

ملے ان دونوں خطوط کا بعینہٖ عکس شائع کیا جا رہا ہے مگر ڈاکٹر صاحب کا خط بہت باریک [illegible] سے لکھا ہوا ہے۔ جس سے عکس اچھا آنا ممکن نہ تھا اس لئے اسے پڑھنے کے قابل بنانے کیلئے ٹچ (TOUCH) کیا گیا ہے [illegible] ضرورت پیش آئی ہے۔

مکاتیب گرامی

محترم ڈاکٹر حمید اللہ صاحب (پیرس)

(۱)

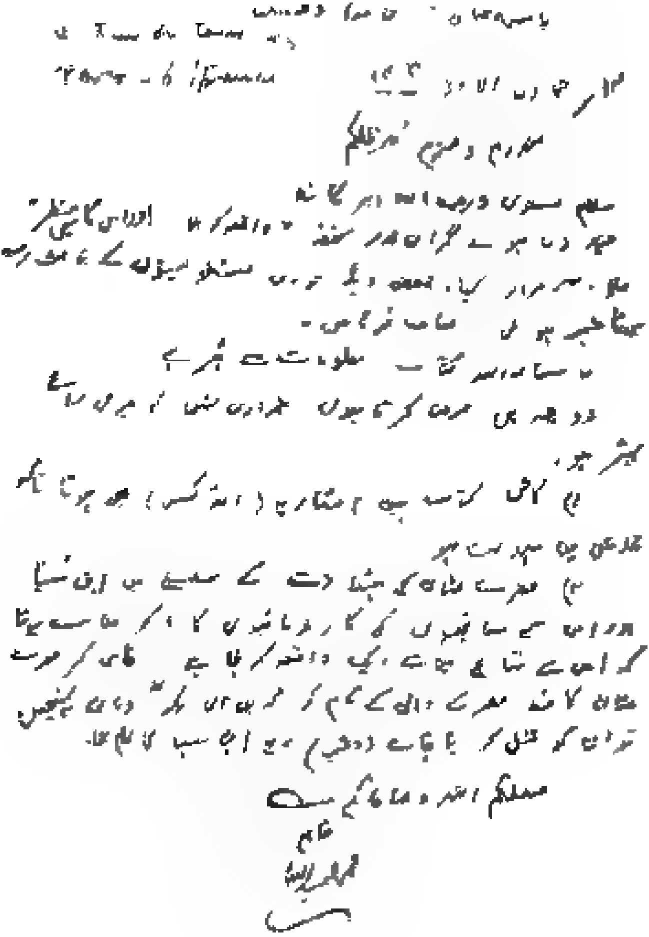

②

[illegible]
[illegible]
[illegible] پیرس

۱۹۹۳/۸/۱۷

مکرم محترم زید مجدکم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔ [illegible] کا عرصہ
ہوا آپ نے [illegible] کر بھیجا تھا [illegible] مجھے [illegible]
موصوف [illegible] جزاکم اللہ احسن الجزاء۔ [illegible]
مگر یاد نہیں کہ [illegible] بھیجی یا نہیں۔ میں بیمار رہا۔ تین
ہفتے شفاخانے میں [illegible] آپریشن ہوا۔ [illegible]
[illegible] گھر آ گیا [illegible] علاج اب تک
جاری ہے۔ ان حالات میں ادب سے ملتجی ہوں کہ میرا
قصور معاف فرمائیں۔ اب [illegible] میرا شکریہ قبول
[illegible] آپ کا [illegible]
گیا ہے

کیا آپ [illegible] "[illegible] صاحب [illegible]
کا [illegible] اگر ضرورت ہو تو [illegible]
انگریزی [illegible] ایڈیشن کا [illegible]
[illegible]

نیازمند
محمد حمید اللہ

دیباچہ طبع دوم

یہ کتاب امسال جنوری میں شائع ہوئی تھی، مصنف کو کسی بنا پر بھی یہ توقع نہیں کر سکتا تھا کہ صرف چھ ماہ کے اندر اس کے دوسرے ایڈیشن کی نوبت آ جائے گی۔ یہ محض اللہ رب العزت کا کرم ہے کہ جو اتنی مدت میں دوبارہ پیش کی جا رہی ہے۔

ناشر صاحب نے مجھ سے چاہا کہ اگر پہلے ایڈیشن کی طباعت میں کچھ غلطیاں رہ گئی ہوں یا کوئی ضروری ترمیم معمولی قسم کی ہو تو اس کی فہرست انہیں مہیا کر دی جائے میری نظر میں جو ایک دو سہو آئی تھیں ان کی فہرست تیار کر کے ناشر صاحب کے حوالے کی جا رہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ دوسرا ایڈیشن ان تصحیحات اور ترمیمات کے ساتھ ٹھیک تک پہنچے گا۔ بعض کچھ ضروری اضافے بھی ذہن میں ہیں لیکن اس وقت جو عجلت ناشر کے پیش نظر ہے اس کی بنا پر یہ کام آئندہ کے لیے مؤخر رہے گا۔

شکر اللہ کے کرم کے ساتھ اللہ ہی سے شکوہ بھی ہے کہ ایسے لوگوں کی طرف سے کتاب کے خلاف محاذ آرائی ہوئی ہے جن کے بارے میں کم از کم تو کبھی اس درجہ کی مخالفت کا اندیشہ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ جگہ جہاں رنج والم کی ہے وہاں اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کتاب کی جو ضرورت اس کے مقدمے میں بتائی گئی تھی وہ بصورت واقعی تھی بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ شدید اور گہرے درجے کی تھی جس درجے کی مقدمے میں ظاہر کی گئی تھی۔ الحمد للہ، لہٰذا اس پر مزید شکر

کتاب کے کسی اگلے ایڈیشن میں ڈالی جا سکے گی۔

والسلام!

عتیق الرحمٰن سنبھلی

یکم محرم الحرام سنہ ۱۴۱۳ھ

مطابق ۳ جولائی ۱۹۹۲ء

۴/۳۸ حوض رانی ایکسٹینشن نئی دہلی ۱۷

افتتاحیہ

از والد ماجد حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

یہ کتاب جیسا کہ اس کے صفحات سے معلوم ہوگا راقم مصنف کے والد ماجد حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی خواہش کا نتیجہ ہے۔ کتاب مکمل ہو جانے پر آپ سے گزارش کی گئی کہ اگر مناسب خیال فرمائیں تو چند ابتدائی کلمات املا ہو جائیں جن سے کتاب کا آغاز ہو۔ ذیل کی سطور اسی درخواست کا نتیجہ ہے۔ — عتیق الرحمٰن سنبھلی

[illegible]

اس عاجز محمد منظور نعمانی کا وطن سنبھل (مرادآباد، یوپی) ہے۔ ۱۳۲۳ھ (۱۹۰۵ء) سن پیدائش ہے۔ سنبھل مسلمانوں کی غالب اکثریت کی بستی ہے جس میں سب سنی ہی ہیں، صرف ایک محلہ میں شیعوں کے کچھ گھر ہیں [illegible] شیعہ صاحبان کی بھی کچھ آبادی ہے۔ یوں تو ہندوستان میں کہیں بھی شیعوں کے [illegible] روایت کیے ہوئے ہے لیکن میرا خیال ہے اور دوسرے لوگوں نے بھی اس کی تصدیق کی ہے کہ سنبھل کے شیعوں میں جو ہندوستان سے [illegible] رواداری باقی ہے اس شان کی رواداری شاید ہی کہیں اور ہو گی۔

بچپن کی باتیں

[illegible] سال کی عمر سے پہلا جو [illegible] چند برس کو چھوڑ کر جو تعلیم کے سلسلے میں باہر گزرے، تقریباً تیس سال کی عمر تک مستقل قیام وطن ہی میں رہا۔ ہمارا محلہ خاص سنی مسلمانوں کا محلہ ہے [illegible] کہے جاتے تھے [illegible]

سے دسویں تک برابر چڑھتے چڑھائے جاتے تھے۔ جن گھروں میں بچے کم نہ رہتے تھے ان گھروں میں امام حسینؑ کا فقیر بنایا جاتا تھا اور یہ بچے سبز کپڑے پہنے ہوتے تھے۔ ہمارا ننھیال اس معاملے میں بہت آگے تھا۔ ایک تو یوں رشتے کے ماموں فقیرو کے نام سے مشہور تھے۔ میں بڑا ہو کر بھی ایک مدت تک یہ سمجھتا رہا کہ ان کا نام اصل میں فقیر الدین یا فخر الحسن ہوگا اور فقیرو کہا جانے لگا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اصل نام تو فدا حسین ہے لیکن بچپن میں امام حسینؑ کے فقیر بنائے گئے تھے اسی سے فقیرو کہے جانے لگے۔

سنبھل کے ڈھول

سنبھل کی تعزیہ داری کی بعض خصوصیتیں شاید اپنا جواب نہ رکھتی ہوں گی۔ ایک تعزیے کی اونچائی دیکھو تو تقریباً چالیس فٹ اونچے ہوتے تھے اور دوسرے ڈھولوں کا سائز۔ سنبھل کے ڈھول تو اتنے بڑے ہوتے تھے کہ ان کے لیے گینڈے یا بھینس کی بہت بڑی کھال تلاش کرنا پڑتی تھی۔ ان میں سے بعض کے اندر سے آدمی کھڑا نکل جاتا تھا۔ لوگ تقریباً بیس ڈھولوں کے اندر سے اسی طرح نکل جاتے تھے۔ ہمارے پاس محلے میں کئی ایسے ڈھول تھے مگر ایک ڈھول جو چوک کا ڈھول کہلاتا تھا وہ ان سب سے بڑا تھا اور چونکہ ہمارے نانا کا مکان چوک میں واقع تھا اس لیے اس کو ہم اپنا ڈھول سمجھتے تھے اور اس پر فخر کیا کرتے تھے۔

عشرۂ محرم کے معمولات

محرم کا چاند ہوا اور روز کے انتظامات گھروں میں لازم ہو گیا کہ پہلی سے دسویں تک روزانہ کوئی میٹھی چیز پکے۔ عموماً میٹھے چاول یا حلوہ یا ملیدہ۔ اور شربت کی نذر سے کچھ پہلے یا بعد میں گھر کا کوئی آدمی گھر کے دروازے پر وہ میٹھا یا چاول لے کر کھڑا ہوتا اور بچوں میں تقسیم کرتا۔ دسویں محرم کے ان دس روز کے معمول سے جدا اور گھرانوں میں مختص ہوں گے۔ انھیں میں سے ایک ہمارے گھر میں بھی تھا ہمارے

گھر جو کچھ ہوتا تھا اس کا ذکر آگے آئے گا۔

محلے کا ایک گھرانہ [illegible] کا گھرانہ بھی کہلاتا تھا۔ اگرچہ تھے وہ سُنّی۔ ان کے یہاں عاشورہ خاص دنوں میں ایک کاغذ کا تعزیہ رہتا تھا۔ ان کے یہاں ان دس دنوں میں وقت کی مجلس ہوا کرتی تھی۔ اختتام مجلس پر حاضرین کو قیمہ کی بھری ایک روٹی اور آدھ سیر شکر بطور تبرک ملتی تھی۔ دس دن برابر یہ سلسلہ چلتا تھا۔ ان دس دنوں مجلس کے علاوہ محرم کی ایک رات تو اس محلے کی بس گھر گھرانوں میں ہوا کرتی تھی۔ خود ہمارے گھر میں بھی یہ مجلس ہوا کرتی۔ اکیسویں شب یعنی ۲۱ کی شب شہادت ہی ہوا کرتی۔

ہمارے گھر کی مجلس

والد صاحب مرحوم تعزیہ داری کے سلسلے کی چیزوں میں تو شرکت نہیں کرتے تھے بلکہ ایک حد تک اسے صحیح بھی نہیں سمجھتے تھے۔ مگر وہ محرم کو شب کی مجلس بڑے اہتمام سے کرتے تھے جیسے کہ ربیع الاول بارہ ربیع الاول کو مجلس میلاد شریف بڑے اہتمام سے ہوتی تھی۔ میلاد میں تو مٹھائی جلیبی یا لڈو گھر ہی میں حلوائی بٹھا کر بنوائی جاتی تھی۔ بازار سے اس موقع کے لیے مٹھائی خریدنا والد صاحب پسند نہیں فرماتے تھے اور مجلس شہادت کے لیے ایک بکرا خود خرید کر لاتے تھے اور اس کا پلاؤ پکایا جاتا تھا جو اس مجلس میں حصوں میں تقسیم ہوتا۔ اس ضمن میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہمارے یہاں بکرے کے گوشت کا رواج شادیوں تک میں بھی رہتا تھا۔ عام طور سے گائے کا گوشت ہی استعمال ہوتا تھا لیکن مجلس شہادت کے لیے بکرا خصوصی اہتمام سے لایا جاتا تھا۔ ایام عزا کی مجلسیں ہمارے حقیقی ماموں حافظ سید احمد مرحوم اپنی پارٹی کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ ان مجلسوں کا ایک شعر اب تک مجھے یاد ہے کہ —

خدا کے نور سے پیدا ہوئے پنجتن محمد علی و فاطمہ حسین و حسن

کچھ اپنا رونا رُلانا

میں اکیس برس کا ہو گیا۔ مجھے وہ سال گھر میں پڑا رہنا کھلتا تھا مجلسوں میں جو کچھ

سنتا تھا اسے سچا سمجھتا تھا۔ واقعۂ شہادت کو سن کر خوب رویا کرتا تھا بلکہ اتنی دلچسپی اس واقعہ سے ہو گئی تھی کہ عشرۂ محرم کے علاوہ بھی جو اس دلچسپی کا تقاضا معلوم ہوتا ہے میں نانا کے گھر جاتا اور جس کتاب سے واعظ صاحب شہادت کے واقعات پڑھا کرتے تھے اس کتاب کو لے کر پڑھتا اور رویا جاتا تھا۔

یہ بات ۸، ۱۰ سال کی عمر کی ہے۔

جہاں تک یاد کرتا ہوں میرا خیال ہے کہ حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ و دیگر صحابہ کرام کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ دنیائے اسلام کی سب سے بڑی شخصیت میں حضرت حسینؓ کو سمجھتا تھا اور سب سے بڑا خبیث یزید کو جانتا تھا۔ اس سلسلے کا ایک لطیفہ بھی ہے۔ غالباً عمر کا آٹھواں سال تھا جبکہ میں قرآن مجید ناظرہ پڑھ رہا تھا پندرہویں پارہ میں سورۂ بنی اسرائیل کی جب وہ آیت آئی جس میں وَلَا يَزِيدُ الظَّالِمِينَ إِلَّا خَسَارًا آگیا ہے تو میں نے دل میں سوچا کہ خود یزید بھی خبیث تھا اور اللہ میاں نے اس کو ظالمین — یعنی بہت بڑا ظالم — کہا ہے۔ یہ بھی بچپنے کا اس پر دل میں یہ شبہ پیدا ہوا کہ حضرت حسینؓ کی شہادت کا واقعہ تو بہت بعد کا ہے قرآن مجید میں اس کا ذکر کیسے آگیا؟ اور پھر اس کا جواب بھی دل میں یہ آگیا کہ اللہ میاں تو سب کچھ جانتے ہیں انہیں خبر تھی کہ یزید اتنا بڑا ظالم ہوگا اس لیے انہوں نے مسلمانوں کو پہلے ہی سے خبردار کر دیا۔

تبدیلی کا آغاز

میرے ایک قریبی رشتے کے نانا حضرت مولانا کریم بخش صاحب سنبھلی تھے حضرت شیخ الہندؒ کے تلامذہ میں سے تھے اور صاحبِ درس تھے۔ میری عمر جب ۸، ۱۰ سال ہوئی تو تعلیم کے سلسلے میں مجھے ان کے سپرد کر دیا گیا اور پھر تین سال تک جہاں وہ بھی مدرسی کی ذمہ داری کے سلسلے میں رہے میں ان کے ساتھ رہا۔ یہ پہلی صحبت تھی جس کی بدولت مجھے دین کی کچھ سمجھ آئی اور جو باتیں دوسروں کے ذریعے وراثتاً یا تقلیداً ذہن میں جم گئی تھیں ان کی حقیقت کھلنی شروع ہوئی اس کے بعد تعلیم کی تکمیل کے لیے دو سال دارالعلوم دیوبند میں رہنا نصیب ہوا۔ الحمدللہ میری

تعلیم کے اس پانچ سالہ دور تک اور اس کے بعد کے خیالات میں بہت کافی تبدیلی آ گئی۔ اب ہمارے گھر میں بڑی مجلس میلاد کی جگہ بیانِ سیرت یا سیرت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس ہوتی تھی اور عشرہ کی مجلس میں شہادت نامہ کے بجائے جیسا کہ بڑے بھائی مولوی محمد حسن صاحب مرحوم تاریخ ابن خلدون کے اردو ترجمے سے واقعہ کربلا کا بیان پڑھتے اور میں کچھ زبانی بیان کیا کرتا تھا۔ لیکن واقعہ کے سلسلے میں تصور وہی تھا جو محض سنائی باتوں سے قائم ہو گیا تھا۔ کبھی خود براہ راست تاریخی کتابوں کا مطالعہ کر کے جانچنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ قصے کی واقعی حقیقت کیا تھی۔

شہرت عام کی تاثیر

۱۳۵۱ھ و ۱۹۳۲ء میں دہلی میں قیام اختیار کرنے کے اقرباء ہماری ایک عرفان کے جمادی الاول کے شمارہ میں اکثر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کچھ لکھا تھا اس کے لیے میں سیرت اور احادیث کی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ لیکن واقعہ کربلا کے سلسلے میں جہاں تک یاد ہے میرا سب سے بڑا ماخذ بس مولانا آزاد کا مضمون شہید کربلا تھا جو الہلال کے فائل میں میرے پاس موجود تھا۔ اس سے زیادہ تاریخی مطالعہ کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی۔ یا یوں کہیے کہ شہرت عام کے اثر سے جو ذہن اس مسئلہ میں بن گیا تھا اس نے یہ ضرورت محسوس ہی نہ ہونے دی اور واقعہ یہ ہے کہ شہرت عام ایسی ہی زبردست چیز ہے خواہ وہ کسی کے حق میں ہو یا کسی کے خلاف۔ اس کی ایک بہت زبردست مثال شیخ محمد بن عبد الوہاب نجدی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کی جماعت کے بارے میں بہت سے بے بنیاد الزامات کا برسوں ورد زبان رہنا ہے۔ الا ماشاء اللہ

؎ میرے ان واقعات کے حوالہ مرحوم مولانا [illegible] صاحب تھے اور انہوں نے لکھا تھا کہ ان سے واقعہ کربلا کے بیان میں اصل کتاب تاریخ ابن خلدون [illegible] صرف چند صفحات [illegible] بیان [illegible] اب مولوی [illegible] الرحمٰن [illegible] جا بجا ابن خلدون سے صفحات [illegible] کی اردو ترجمہ [illegible] حکیم احمد حسین [illegible]۔

مکہ مکرمہ کے مشہور عالم و محدث و محقق شیخ احمد زینی دحلان۔ نیز خود ہمارے اکابر میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ — شرک و بدعت کے خلاف شیخ محمد بن عبدالوہاب کے بے لاگ مجاہدانہ جہاد نے عرب یا سیاسی میدان میں آل سعود کے لیے ان کی حمایت نے مخالفانہ پروپیگنڈہ کا وہ طوفان اٹھایا کہ بہت سے بڑے بڑے اہل حق تک ان سے بدگمان ہو گئے۔ اس کی تفصیل کے لیے اس عاجز کی کتاب "شیخ محمد بن عبدالوہاب کے خلاف پروپیگنڈہ اور علمائے حق پر اس کے اثرات" دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ شیخ احمد زینی دحلان نے اپنی کتاب "خلاصۃ الکلام" اور "الدرر السنیۃ فی الرد علی الوہابیۃ" میں ان کی طرف ایسی تمام باتیں منسوب کی ہیں جن کی بنیاد پر ان کو بلکہ کافروں سے بھی بدتر کافر قرار دینا صحیح اور برحق ہوگا۔ اور اسی طرح کی باتیں ہمارے حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنے رسالہ "رجوم المذنبین" میں تحریر فرمائی تھیں لیکن بعد میں حضرت مدنیؒ نے ایک اخباری بیان کے ذریعہ اعتراف فرمایا کہ انہوں نے "رجوم المذنبین" میں جو کچھ اس سلسلے میں لکھا تھا وہ عام شہرت ہی کی بنیاد پر لکھا تھا۔

الفرقان ۷۳ھ کا مضمون

الغرض واقعہ کربلا کے سلسلے میں یہ پہلی ہی ذاتی تحریر تھی جو اس عام اور روایتی تصور سے بہت مختلف تھی جس کا کچھ ذکر اوپر کی سطروں میں آیا ہے۔ یاد پڑتا ہے ۷۳ھ کی بات ہے کہ میں کہیں سفر پر جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ ایک اجنبی اور غیر معروف پٹنہ کے ایک صاحب کا خط آیا جو الفرقان کے بہت قدردان تھے انہوں نے لکھا تھا کہ محرم کا مہینہ آنے والا ہے اس کے لئے پہلے سے عبارت نہ لکھی گئی تو پھر وہی غلط سلط روایتیں دہرائی جاتی ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ الفرقان میں اس موضوع پر کوئی مستند قسم کا مضمون آ جائے اور اس کی کوشش کی جائے کہ وہ محرم سے پہلے مجلسوں میں پڑھا جائے گا۔ میں یہ ذمہ داری مولوی عتیق الرحمن کے سپرد کر کے سفر پر روانہ ہو گیا تھا۔ مولوی عتیق الرحمن نے کتاب مذکور کے متعلق سے مضمون لکھا اور وہ ذی الحجہ ۷۳ھ کے الفرقان میں شائع

ہو گیا۔ میں سفر سے واپس آیا اور یہ مضمون پڑھا تو اس کی تمام باتوں کی وجہ سے تن بدن میں آگ سی تو لگ گئی۔ مضمون سے یہ بیان تھا کہ رسالہ مقدمہ ابن خلدون سے ایک بات کو بنا حسینؓ کے اقدامات کے لیے بغاوت کا لفظ اس عصر میں استعمال کیا گیا تھا۔ دوسری بات مضمون کا یہ بیان تھا کہ جب حضرت حسینؓ کوفے کے قریب پہنچ کر اس حقیقت سے آگاہ ہوئے کہ کوفے والے غداری کر گئے ہیں اور پھر یزیدی لشکر کے بیچ میں سے آپ کے لیے واپسی کا راستہ بھی مسدود ہو گیا تو یزیدی سالار عمر بن سعد سے کہلے آپ نے تین شرطیں رکھی تھیں کہ ان تین میں سے کسی کو قبول کر لیا جائے جن میں سے ایک یہ تھی کہ انہیں یزید کے پاس جانے دیا جائے تاکہ وہ براہ راست اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیں۔"

میں یزید کو جتنا ظالم، خبیث اور نابکار سمجھے جاتا آ رہا تھا اس کی بنا پر میرے نزدیک یہ ناممکن بات تھی کہ حضرت حسینؓ ایسی تجویز پیش کرتے۔ حضرت حسینؓ کے لیے بیعت سوچی بھی جا سکے یہ محال تھی۔ میں غصے میں اٹھا اور مولوی عتیق کے گھر کی طرف روانہ ہوا کہ ان سے باز پرس کروں کہ یہ کیا لکھ دیا ہے؟

سوء ظن کے قریب پہنچا ہوں گا لفظ بغاوت کے بارے میں یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے ہر جگہ یہ معیوب نہیں ہے بلکہ اگر ایک غاصبانہ اقتدار و نظام کے خلاف ہو تو ایک طرح کا جہاد ہے۔ آخر سنہ ۱۸۵۷ء میں ہمارے بزرگوں نے انگریز حکومت کے خلاف جو کچھ کیا تھا وہ بغاوت ہی کہلاتی تھی جس پر ہم آج بھی فخر کرتے ہیں۔ بعد یزید کے ہاتھ میں ہاتھ دینے والی بات کچھ ناقابل تسلیم رہی۔" میں اسی حال میں مولوی عتیق کے گھر پہنچا اور اس مضمون کے ساتھ ان سے پوچھا کہ تم نے یہ بات کیسے اور کہاں سے لکھ دی ہے۔ مولوی عتیق کے پاس اس طرح کے سوالات کے جواب پہلے ہی سے تھے اور وہ اس سلسلے میں ایک دوسرے مضمون کی تیاری کر چکے تھے۔ ان کے لیے انہوں نے تاریخ کی مستند کتابوں سے عبارتیں اور حوالے نقل کر کے رکھے ہوئے تھے۔ انہیں پڑھ کر مجھے بھی ماننا پڑا کہ یہ غلط نہیں لکھا ہے۔

پہلی کتاب اس واقعے پر تقریباً تیس سال گزر گئے تھے کہ آج سے دس سال پہلے جب میری

کتاب "ایرانی انقلاب امام خمینی اور شیعیت" شائع ہوئی تو بعض مخلص دوستوں نے توجہ دلائی کہ جس مقصد سے یہ کتاب لکھی گئی ہے اسی مقصد کی خدمت کے لیے یہ بھی مفید ہوگا کہ مولوی عتیق الرحمٰن صاحب کا مضمون "سانحۂ کربلا" رسالہ کے بعد کا وضاحتی مضمون بابت محرم ۹۸ھ بھی کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے۔ میں نے اس عنوان کو پسند کیا اور ۸۶ء میں جب عزیزی عتیق الرحمٰن کا ہندوستان آنا ہوا تو میں نے ان سے کہا کہ وہ رسالہ الفرقان سے اپنے وہ دونوں مضمون نکال کر ایک نظر ڈال لیں اور کتب خانہ الفرقان کے حوالہ کر دیں۔ مگر ان کی رائے یہ ہوئی کہ اس مسئلہ پر تو اب بالکل از سر نو لکھا جانا چاہیے۔

یہ کتاب جو اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے اس کا کچھ حصہ انہی دونوں مضامین کے مطابق ہیں لیکن عزیز مصنف نے ان پر نظر ثانی میں جو محنت کی ہے اس نے اسے ایک بالکل نئی چیز بنا دیا ہے۔ کتاب کے مشتملات میں سے مجھے خاص طور پر اس کے آخری باب میں آنے والے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے اقتباس کی بابت یہ عرض کرنا ہے کہ اس اقتباس نے خود مجھے بڑا اہم فائدہ پہنچایا ہے۔ حضرت مسلم بن عقیلؓ کی شہادت کی خبر ملنے پر واپسی کے ارادے کے بعد بھی صرف بعض برادران مسلم بن عقیلؓ کی دلداری میں حضرت حسینؓ کے سفر جاری رکھنے پر مجھے ایک خلش سی تھی۔ اللہ تعالیٰ شیخ الاسلام کو اور اس کتاب کے عزیز مصنف کو جزائے خیر دے کہ شیخ الاسلام کے اس اقتباس میں میری اس خلش کے رفع ہونے کا سامان مل گیا۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو اپنے بندوں کے لیے نافع بنائے اور اگر اس میں کوئی بات غلط آ گئی ہو تو اس کے اثر سے سب کی حفاظت فرمائے نیز عزیز مصنف کو اس سے رجوع کی توفیق بخشے۔ واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔

مقدمہ[1]

(طبع اول)

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بڑا کام رفو کا نکلا

سنہ ۶۳ء یا ۶۴ء کی بات ہے، ماہنامہ الفرقان لکھنؤ کی ترتیب و ادارت کی کچھ ذمہ داری متعلق تھی۔ ایک صاحب کی فرمائش آئی کہ محرم کا مہینہ قریب آ رہا ہے سانحۂ کربلا اور شہادت حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے سلسلے میں غلط سلط روایات والے شہادت نامے اس ماہ میں پڑھے جاتے ہیں جن سے کچھ غلط اور عجیب خیالات و عقائد پھیلتے ہیں۔ الفرقان[2] میں اگر کوئی مستند مضمون اس موقع پر واقعۂ کربلا کے متعلق چھپ جائے تو مفید ہوگا۔ غالباً یہ فرمائش الفرقان کے مدیر اعلیٰ میرے والد ماجد مولانا محمد منظور نعمانی کے نام آئی تھی۔ مجھے حکم ہوا کہ لکھو۔

والد ماجد کے کتب خانے میں بعض ایسی کتابیں مل گئیں جن کی مدد سے یہ فرمائش پوری کی جا سکے۔ ایک مصری مصنف کی کتاب ہاتھ آئی جو بہت قرین اعتماد اور قابل بھروسہ معلوم ہوئی۔ افسوس کہ نام کتاب کا یاد ہے نہ مصنف کا۔ اس کتاب کی روشنی میں "واقعۂ کربلا" کے عنوان سے ایک مضمون تیار کر کے ذی الحجہ سنہ ۸۳ھ اگست ۶۳ء کے الفرقان میں دے دیا گیا۔

مضمون میں کوئی بہت خاص بات نہ تھی۔ واقعے کا سادہ سا بیان تھا اور اس سلسلے میں بعض غلط عمل سے اعتقادیات شیعیت کے اثر سے اہل سنت کے دلوں کے اندر پیدا ہو گئی ہیں اُن کے سلسلے میں کچھ

---

[1] ترتیب و ادارت کے بعد۔ [2] ماہنامہ الفرقان مصنف کے والد ماجد نے ۱۹۳۴ء میں ہندوستان کے شہر بریلی سے جاری کیا تھا، ۱۹۴۲ء میں لکھنؤ منتقل کر دیا اور آج بھی وہیں سے شائع ہو رہا ہے۔

اس کے مطابق نقطۂ نظر سے "ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ تاہم ایک بات نے اس کو "شکوک انگیز" بنا دیا اور وہ ایک روایت تھی، جس کے مطابق حضرت حسینؓ نے یہ دیکھ کر کہ اب صورت حال یہ ہو گئی کہ جن لوگوں کی خواہش اور بلاوے پر آپ نے ادھر کا سفر کیا تھا ان میں کے بھی لوگ اس فوج میں تو شریک ہیں جو آپ کے خلاف کارروائی کے لئے کوفے کے یزیدی گورنر ابن زیاد نے بھیجی ہے مگر آپ کی حمایت کے لئے نکل کر آنے والا کوئی نہیں ہے" یزیدی فوج کے سردار عمر بن سعد کو تین باتوں کی پیشکش کی تھی جن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ آپ کو دمشق پہنچ جانے دیا جائے جہاں آپ اپنا ہاتھ یزید کے ہاتھ میں دے دیں۔

"یزید کے ہاتھ میں ہاتھ دینے والی" یہ بات بہت سے لوگوں کے لئے ناگواری کا باعث بنی جیسے کہ اپنی طرف سے گھڑ کر کہہ دی گئی ہو۔ چنانچہ بہت سے خطوط کچھ استعجاب اور کچھ احتجاج کے اس سلسلے میں آئے۔ اور ان ہی کی بنا پر الفرقان کی آئندہ اشاعت میں اس مسئلے پر باقاعدہ علمی حوالوں کے ساتھ تفصیل سے لکھا گیا جس سے یہ حقیقت بالکل بے غبار ہو گئی کہ حضرت حسینؓ کی پیشکش کے بیان میں کوئی ذرا کسی قسم کی غلط بیانی یا بے احتیاطی نہیں تھی بلکہ ایک حقیقت تھی جو شیعی اثرات کے ماتحت چھپا دی گئی یا آدھی کر دی گئی تھی۔ خطوط لکھنے والے بعض حضرات نے اس دوسرے مضمون کے بعد یہ لکھ کر اپنا اصلاحی عرض بھی ادا کیا کہ بے شک تم نے حضرت حسینؓ کی پیشکش کے بیان میں کوئی بے احتیاطی یا غلط بیانی نہیں کی تھی۔

اس قصے پر ۲۲-۲۳ برس گزر گئے تھے اور مجھے اب وطن سے نکل کر لندن میں بسا رہا تھا کہ ۱۹۷۶ء میں لکھنؤ آنا ہوا تو والد ماجد نے ان دونوں مضامین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ تمہارا مضمون "واقعۂ کربلا" کتابی شکل میں چھپ جانا چاہئے، کچھ نظر ثانی کی ضرورت سمجھو تو ایک نظر ڈال لو اور کتب خانہ الفرقان کے حوالے کر دو۔ مضمون پر نظر ڈالی تو محسوس ہوا کہ نئے سرے سے لکھنے کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ ۲۰ برس پہلے کے مقابلے میں اپنا علم اور اپنے خیالات دونوں بہت بدل چکے ہیں۔ مگر یہ سارا کام ان دنوں ممکن ہو رہا تھا نہ

وقت کے بے سود گزرنا ہو۔ حتیٰ کہ گذشتہ سال [illegible] کے علاوہ اعمال کی اطلاعات پر
کسی کے ذہن کا خیال پیدا ہوا، کہ یہ موضوع کسی کام بھی آتا اور مضمون لکھنے کے سبب سے قسمت کے لیے تاریخ
طبری وغیرہ کا مطالعہ شروع کیا۔ اس مطالعہ سے اس نتیجہ پر پہنچا جس کا اظہار مقالے کے شروع میں ہوا
بجائے اس کے مضمون کا سلسلہ کتابی شکل [illegible] ہے لیکن جس ضرورت کے تحت لکھا گیا تھا
اس کا تقاضا تھا اور [illegible] ہے کہ تاریخ کے اس حصے کو مکمل درست رکھنے کی ضرورت ہے جو
کربلا اور اس کے پس منظر والے واقعات کی روایتوں پر مشتمل ہے۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش
کی گئی تو اس کے نتیجے میں یہ کتاب تیار ہوئی جو آپ کے ہاتھ میں ہے۔

تاریخی روایتوں کا حال اور اس کی مثال

میں نے تاریخ کا مطالعہ جس پہلو سے کیا، کسی بھی حیثیت سے تاریخ دانی کا دعویٰ نہیں۔ بالکل ممکن ہے کہ میں نے اس مطالعہ میں جو کچھ محسوس کیا اور جو نتائج نکالے وہ اہل فن کی نگاہ میں قابل اتفاق نہ ہوں۔ مگر میں جو محسوس کر رہا ہوں بالکل اسی نوعیت کا احساس ہے جیسے کسی بدیہی چیز کا، احساس ہوتا ہے اور جس نوعیت کے احساسات کو کوئی دور کر سکتا ہے نہ خواہ مخواہ شک کی نگاہ سے دیکھ سکتا ہے۔ میرا احساس ہے کہ ہماری تاریخ کا ایسا نازک حصہ جس قدر احتیاط اور جس قدر احساس ذمہ داری کے ساتھ قلمبند کیے جانے کی ضرورت تھی اسی قدر بے احتیاطی اور غیر ذمہ داری کا پہلو کار فرما نظر آتا ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو۔

طبری ج ۶ ص ۲۳۲ پر ایک روایت بتاتی ہے کہ حضرت حسینؓ کربلا میں اترے تو وہ جمعرات کا دن اور محرم سنہ ۶۱ھ کی دوسری تاریخ تھی۔ پھر ص ۲۳۳ پر ایک روایت آتی ہے کہ جمعرات کا دن [illegible] کی نویں تاریخ تھی کہ دن ڈھلے لشکر کے سالار عمر بن سعد [illegible] کے ایک فوجی دستے کے ساتھ حملے [illegible] سے کر حضرت حسینؓ پر حملہ کرنے کے لیے پہنچ گئے مگر یہ مہلت دے دی گئی

آٹھ محرم تک کے لیے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد آٹھ تاریخ جمعرات ہو تو وہ جمعرات کی شب ہوگی۔ جب محرم کی آٹھ جمعرات بتائی گئی پھر دس محرم کو جمعرات ہی بتائی گئی تو دس محرم کیسے جمعہ کے علاوہ کوئی دوسرا دن ہو سکتا ہے لیکن صفحہ ۲۲۲ پر دیکھیے طبری نے روز عاشور کی عمر بن سعد کی روانگی کا حال لکھتے ہوئے حرکت میں آنے کا بیان آگے چل کر کن الفاظ سے کیا ہے۔

فلما صلی عمر بن سعد الغداۃ	ہفتہ کے روز جب صبح کی نماز عمر بن سعد
یوم السبت وقد بلغنا ایضا انہ	پڑھ چکا نماز فجر سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوا
کان یوم الجمعۃ وکان ذالک	ہے کہ وہ جمعہ کا دن تھا۔ عمر بن سعد
الیوم یوم عاشوراء خرج فیمن	عاشورہ کا دن یوم عاشور کا تھا تو ابن سعد
معہ من الناس۔	اپنے لوگوں کے ساتھ نکلا۔

ملاحظہ کیجیے صفحہ ۲۲۲ اور صفحہ ۲۲۳ والی روایتوں کے پیش نظر جب آٹھ تاریخ کو جمعرات کا دن اور پھر دس تاریخ کو جمعرات کا دن بتایا گیا ہے لیکن اس صفحہ ۲۲۲ کی اس روایت کے لحاظ سے جمعہ کا یا دس تاریخ کو ہفتے کا دن بتایا گیا ہے؟

ابھی ہمیں معلوم ہوا کہ "وقد بلغنا ایضا" کے الفاظ کے ساتھ یہ بھی روایت لکھی ہے کہ جمعہ کا دن تھا یعنی جمعہ کے یا ہفتہ کے۔ اگر ہفتہ کے دن ہو تو طبری نے کہاں کہی غیر ثابت کیا ہے؟ اور اگر جمعہ کے دن طبری کے بقول تب بھی ایک شخص کا بیان [illegible] کے کہ [illegible] وقد بلغنا ایضا انہ سے کیا ہو سکتا ہے اور یوم جمعہ کا دن ایک مشکوک دن بن جاتا ہے۔ حالانکہ گزشتہ بیانات کی رو سے تو طبری کے جمعہ کا دن ہی سمجھنے کی بات ہے کہ یہ دن ہفتے کا نہیں جمعہ کا ہونا چاہیے اور اگر ہفتہ ہی ثابت ہے تو پھر گزشتہ دونوں بیانات غلط ہیں۔

طبری کا اپنا اعتراف

یہ مثال سامنے لا کر ہم طبری کے بارے میں کوئی ایسی بات نہیں کہہ رہے ہیں کہ اگر

اُن کی زندگی میں لکھی جاتی تو شاید وہ کوئی فیصلہ کن بات کہہ سکتے۔ اُن کا صاف اعتراف ہے کہ اُن کے قاری کو ایسی روایات مل سکتی ہیں جو کسی طرح صحیح نہ ہو سکتی ہوں اور ایسی بھی جو کسی طرح بھی غلط نہ ہو سکتی ہوں۔ کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ۔

> میں نے اس کتاب میں جو کچھ ذکر کیا ہے اس میں میرا اعتماد اپنی اطلاعات اور راویوں کے بیانات پر رہا ہے نہ کہ عقل و فکر کے نتائج پر۔ کسی قاری کو اگر میری جمع کردہ خبروں اور روایتوں میں کوئی چیز اس وجہ سے ناقابلِ فہم اور ناقابلِ قبول نظر آئے کہ نہ کوئی اس کی تک بنتی ہے نہ کوئی معنی بنتے ہیں تو اُسے جاننا چاہیے کہ ہم نے یہ سب اپنی طرف سے نہیں لکھا ہے بلکہ اگلوں سے جو بات ہمیں جس طرح پہنچی ہے ہم نے اس طرح نقل کر دی ہے۔ (ج ۱ جلد اول ص ۷)

پھر کونسی بات عجیب ہے؟

مؤرخ طبری کا دامن جب اتنا وسیع ہو کہ اس میں قریبی اور دور سے نظر آنے والی ناہمواری کے ساتھ بھی جیسی کہ مذکورہ بالا مثال میں پائی جاتی ہے۔ ایک روایت کو اس کے بیان میں جہاں جا بجا جگہ مل سکتی ہے تو پھر راویوں کی روایت کی غلطی یا ان کا ازالہ یا غلط بیانی رہ جاتی ہے جس کی توجیہ ہمیں اب ان مؤرخین کی کتابوں میں تلاش کرنی چاہیے؟ نا ممکن کر کے جیسے حقائق کہ جن سے بیانات متعلق ہو سکے گئے، تعقیبات متعلق ہوتے ہیں اور مثبت و منفی (POSITIVE & NEGATIVE) مقالات بھی متعلق ہو جاتے ہیں[1]

---

[1] کہنا تو یہ چاہیے کہ [illegible]
[illegible]
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم [illegible]
[illegible] کی تفسیر میں ملتا ہے۔

چنانچہ اسی وقت سے واقعۂ کربلا اور اس کے پس منظر کے واقعات کے سلسلے میں جہاں بعض صحیح اور قابلِ قبول روایات موجود ہیں، وہیں نہایت مُنکَر اور ناقابلِ قبول روایات کا بھی ڈھیر لگ گیا ہے اور فی الواقع یہ صورت پیدا ہو گئی ہے کہ کسی روایت کو صحیح مانتے ہوئے بھی یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ گو فلاں صحیح متعارض ہے مگر ہو سکتا ہے کہ واقعہ میں یہ بھی صحیح ہو۔ روایت کی اس صورتِ حال کا اندازہ آپ کو آگے چل کر کتاب میں ہوگا، خاص کر کربلا کے میدان والی روایات تک۔ اور اسی لیے ہم نے اگرچہ کچھ روایات کو عقل، عادت، حالات، ماحول اور دوسرے خارجی ماخذوں کی روشنی میں قابلِ قبول اور کچھ کو ناقابلِ قبول ٹھہرایا ہے۔ کچھ کو ترجیح دی ہے اور کچھ کو رد کر دیا ہے، مگر جس کو صحیح ٹھہرایا ہے اور جس کو ترجیح دی اس کو بھی فی الواقع اور سو فیصد صحیح کہنے کی ذمہ داری ہم نہیں اٹھا سکتے۔ جھوٹ اور سچ اور من گھڑت روایات کی وہ آمیزش نظر آتی ہے کہ اللہ کی پناہ۔

کربلا کے واقعے میں غلط بیانی کے اسباب

اور اس کی وجہ وہی ہے کہ کربلا کا سانحہ جس شکل میں بھی ہوا ہو، اور تو جانے خود بہت جذبات انگیز ہے اور پھر اس کے پیچھے سیاسی صف آرائی کی ایک بیس [illegible] اور کم ۱۵ سالہ تاریخ ہے جو، گروہ بندی پر دھڑے، تعصبات کو بھی جنم دے چکی ہے اور عقائدات میں دلچسپی رکھنے والے حصے بھی بنا چکی ہے۔ مزید کوفیوں کی جس بے وفائی اور غداری نے یہ سانحہ کرایا اس کا بھی تقاضا ہے کہ قبائلی عداوتوں کے تحت ایک دوسرے کو الزام دیں اور اپنے آپ کو اندر سے بالکل نکالنے والی روایتیں گھڑی جائیں، خاص کر جبکہ واقعہ کے چند سال بعد ہی یزید کی وفات سے حالات نے ایک دم پلٹا کھایا تھا۔ پھر ان سب باتوں سے اوپر بہت سے راویوں اور مقتل نگاروں کا وہ "شیعی جذبہ" جو اگرچہ نہایت قیمتی موقع کو اپنی وفاداری کی مدد کر دیا اور شیعیت کے مفاد کے لیے حسبِ ضرورت اور حسبِ استطاعت

رنگ آمیزی اور روایت گڑھی کی مذمت انجام دیتا تو یہ ایک غیر فطری بات ہوتی۔ غرض بات مختلف قسم کے محرکات و عوامل نے مل کر واقعۂ کربلا اور اس کے پس منظر سے تعلق رکھنے والے واقعات کے بیان میں وہ غضب ڈھایا ہے کہ حقیقت کی بازیافت مشکل بن گئی۔ نہایت بے لاگ طریقے سے روایتوں کا تجزیہ کیا جائے تبھی ممکن ہے کہ صداقت تک رسائی ہو سکے۔

کام مشکل بھی اور ضروری بھی

اس قضیے میں صداقت تک رسائی اور اس کا اظہار کس قدر مشکل اور کتنا پُرخطر کام ہے، اس کا اندازہ کسی اور کو ہو یا نہ ہو، اس عاجز کو تو اسی وقت سے ہے جب اس موضوع پر پہلے پہل چھپنے والے مضمون میں اتنی سی بات کہتے ہوئے کہ کسی چھپائی گئی صداقت کا اظہار ہونا چاہیے، وہ روایت نقل کر دی گئی جس کے مطابق حضرت حسینؓ نے یہ آرزو ظاہر کی تھی کہ

> (یا یہ) میں یزید کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دوں پھر وہ جو مناسب سمجھے میرے اور اپنے معاملے میں فیصلہ کرے[1]

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ اس بیان کی بنا پر یہ مضمون بڑا ہنگامہ خیز ہو گیا اور آئندہ ماہ کے شمارے میں جب پانچ چھ کتابوں کے حوالے سے یہ بیان مدلل کر دیا گیا تب بات قابو میں آئی۔ لیکن وہ بھی صرف سچے علم دوست اور صداقت پسند لوگوں کی حد تک۔ باقی جن لوگوں کے لیے ایک "دور کی" حقیقت کے مقابلے میں یہ شاعری جزو ایمان بن چکی تھی کہ

سر داد و نداد دست در دستِ یزید

وہ اپنے بے دلیل ایمان پر اس کے بعد بھی قائم اور سرگرم ہے۔

---

[1] تاریخ طبری جزو ۶ صفحہ ۲۳۵ ۔ البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۷۰

ایک ناگزیر ضمنی بحث

اگرچہ یہ موقع کسی بحث اور تفصیل کا نہیں ہے تاہم اس اندیشے کے پیش نظر کہ آج کل ان سطروں کو پڑھ کر بھی بے نام حضرات کو گرانی لاحق ہو اس قدر بات یہاں کہہ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یزید کے ہاتھ میں ہاتھ دینے اور فیصلہ اس پر چھوڑنے کی بات طبری، ابن کثیر اور البدایہ والنہایہ وغیرہ سب کے صفحات میں اس قدر روشن حقیقت ہے کہ جو لوگ اس کے بیان پر ناراض ہوتے ہیں وہ سچائی سے ناخوش ہونے کے سوا اور کچھ نہیں کرتے۔ طبری نے اس واقعہ کے سلسلے کی سب سے پہلی روایت یہ دی ہے کہ حضرت حسینؓ نے عمر بن سعد سے ملاقات کی اور کہا کہ دونوں لشکروں کو یہیں کربلا کے میدان میں چھوڑ کر ہم خود یزید کے ہاں چلیں۔ مگر عمر بن سعد نے اس کو قبول کرنے سے معذرت کی، اس کے بعد طبری میں دوسری روایت ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے۔

قال ابو مخنف و اما ما حدثنا به	ابو مخنف نے کہا لیکن مجالد بن سعید
المجالد بن سعید والصقعب بن	اور صقعب بن زہیر وغیرہ محدثین کا قول
زهیر الازدی وغیرهما من المحدثین	جو سب محدثین کی جماعت کا قول ہے
فهو ما علیه جماعة المحدثین	وہ کہتے ہیں کہ حضرت حسینؓ نے کہا تھا
قالوا انه قال اختاروا منی خصالاً	کہ میری تین باتیں قبول کرو میں
ثلاثاً اما ان ارجع الی المکان الذی	اس جگہ کو لوٹ جاؤں جہاں سے آیا
اقبلت منه واما ان اضع یدی فی	ہوں یا یزید کے ہاتھ میں ہاتھ دے دوں
ید یزید بن معاویة فیری فیما بینی	وہ پھر جو میرے اور اپنے مابین
وبینه رأیه واما ان تسیرونی	جو کچھ فیصلہ کرے اور یا تم مجھے مسلمانوں
الی ای ثغر من ثغور المسلمین شئتم	کے کسی سرحدی مقام پر بھیجو جہاں تم
فاکون رجلاً من اهله لی	چاہو پہنچا دو اور میں وہیں کا ایک

ما لهم وعلیه ما علیهم۱	آدمی ہو کر رہیں گے جیسے وہ سب ایسا

ہیں۔

سب سے پہلی روایت کی طبری نے جو ابو مخنف ہی سے لی گئی۔ اس روایت میں ابو مخنف نے ایک فرد واحد ہانی بن ثبیت کے بیان کے طور پر دی تھی۔ بعد ازاں یہ دوسری روایت تھی جس پر وہ محدثین کا اتفاق بتاتا ہے۔ اس کے بعد ہی ابو مخنف کی ایک تیسری روایت طبری میں آتی ہے جو حضرت حسینؓ کے قافلے کے ایک باقی ماندہ فرد و خانہ کے غلام عقبہ بن سمعان کا بیان ہے کہ میں اول سے آخر تک آپ کے ساتھ تھا۔ آپ نے کہیں کوئی اس طرح کی بات نہیں فرمائی جو لوگ بیان کرتے ہیں۔ آپ نے صرف یہ فرمایا تھا کہ:-

دعونی فلأذهب فی هذه الارض	مجھے چھوڑ دو کہ میں کہیں اس وسیع چوڑی
العریضة حتی ننظر ما یصیر	زمین میں نکل جاؤں حتیٰ کہ یہ بات ہو جائے
امر الناس۔۲	کہ کیا ہوتا ہے آخر ان لوگوں کا معاملہ کیسا

اور پھر چوتھی روایت اسی ابو مخنف سے دوسری روایت کی تکمیل کے طور پر ہے کہ کوفہ سے آپ کی ملاقات (وصال کے سمجھوتے کے لیے آپ نے شروع کی تھی) جس میں یقیناً بار بار یہی بات اس کے نتیجے میں عمر نے ابن زیاد کو خط لکھا کہ اللہ کا شکر ہے حالات سدھرنے کی صورت نکل

آئی ہے اور حسینؓ نے مجھ سے پیش کش کی ہے کہ	یا تو وہ اسی جگہ لوٹ جائیں جہاں سے
ان یرجع الی المکان الذی منه	آئے تھے یا ہم ان کو سرحدوں کے کسی
اتی او ان نسیّره الی ای ثغر من	کسی سرحدی مقام پر بھیج دیں جہاں
ثغور المسلمین شئنا فیکون رجلا	وہ ایک عام مسلمان کی طرح رہیں
من المسلمین له ما لهم وعلیه	گے اور یا پھر وہ امیر المومنین یزید کے
ما علیهم او ان یاتی یزید	پاس چلے جائیں اور اپنا ہاتھ ان کے

۱؎ جزو ۶ صفحہ ۲۳۵۔ ۲؎ ایضاً

امیر المومنین یزید فیضع یدہ فی	یا مجھ کو یزید کے پاس جانے دو، وہ
یدہ فیری فیما بینہ و بینہ	[illegible] اور اپنے معاملے کا جو مناسب
رأیہ ۔	سمجھیں کریں۔

عقبہ بن سمعان کا بیان اگر اس معاملے میں مان لیا جاتا تو اس قضیے کی ایک بڑی گتھی حل ہو سکتی تھی۔ جو عقدہ کہ ان کے برخلاف دوسری روایات ماننے سے پیدا ہوتا ہے کہ حضرت حسینؓ نے تین والی شرائط پیش کی تھیں جن میں سے ایک یہ تھی کہ یزید کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دینے کو تیار ہیں۔ اس بیان کو ماننے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر ابن زیاد کو کیا سبب تھا کہ [illegible] یک بیک صورت قتال کی صورت پیدا کی؟ تاریخ کی روایات میں اس کا جواب یہ ملتا ہے کہ شمر ذی الجوشن نے [illegible] (طبری ص ۲۲۲) مگر [illegible] ہے۔ ابن زیاد کی [illegible] نظر نہیں آتا جو ایسی حماقت کسی کے کہہ دینے سے کر لے [illegible] اس صورت کا بیان بھی سامنے رکھا جائے کہ [illegible] ابن زیاد کا اپنا رویہ نہایت سخت اور بے لچک تھا۔ جہاں تک عمر بن سعدؓ کا تعلق ہے ان کی نظر میں [illegible] کوئی احتمال [illegible] ہے۔ اور عقبہ بن سمعان کا بیان مان لیا جائے تو پھر سرے سے کوئی اشکال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ابن زیاد کی بات بالکل سمجھ میں آتی ہے۔ ابن زیاد کے [illegible] ہاتھ سے نکل جانا چاہتے تو [illegible] شمر ذی الجوشن والی روایت [illegible] عقبہ بن سمعان کی شہادت کے [illegible] شمر ذی الجوشن والی روایت [illegible]

---

[1] طبری جلد ۶، [illegible] [2] [illegible]

حضرت حسینؓ کی توہین نظر آتی تھی

اس روایت کے ضمن کا سب سے پہلا جواب تو ابو مخنف کا یہ بیان ہی ہے کہ جماعت محدثین کا اس پر اتفاق ہے۔ دوسرے یہ کہ ابو مخنف و طبری دونوں عقبہ بن سمعان کی بات نقل کرنے کے بعد آگے چوتھی روایت، پانچویں روایت اور چھٹی روایت میں مسلسل وہ باتیں بیان کر گئے جو سرکار حسینؓ کی گفتگو کے نتیجے میں پیش آتی چلی گئیں۔ گویا ابن سمعان کی بات کو ناقابل اعتنا قرار دے دیتے ہیں۔ اور تیسری بات یہ ہے کہ اثنائے تاریخ کے واقعات میں حضرت حسینؓ کے ساتھیوں کی زبان پر ابن سعد اور اس کے ساتھیوں کو خطاب کرتے ہوئے بار بار یہ بات ملتی ہے کہ :

أفما لكم في احدٍ من الخصال   کیا حضرت کی پیش کی ہوئی باتوں میں سے
التي عرض عليكم رضی ؟   کوئی ایک بھی تم کو قبول نہیں ؟

طبری جز ۶ کے صفحات ملاحظہ ہوں ص ۲۴۴ اور ۲۴۵، جہاں جگہ جگہ یہ بات آتی ہے اور اس کے بعد تک آتی چلی جاتی ہے۔ اس لیے کوئی گنجائش ہی نہیں کہ اس روایت کو مانا جائے۔

اصل بات جو کہنا تھی

یہ ضمنی بات ناگزیر ہو کر درمیان آ گئی تھی ورنہ اصل بات یہ کہنا رہی تھی کہ اس قصے میں اصل حقیقت اور صحیح واقعات کی یافت بھی مشکل اور اس سے زیادہ اس کا اظہار مشکل۔ اس لیے کہ اس میں لوگوں کو یا حضرت حسینؓ کی (معاذ اللہ) توہین نظر آتی ہے اور یا یزید و ابن زیاد کی طرفداری۔ لیکن ہے یہ ایک ضروری کام۔ اس لیے کہ یہ "توہین" نظر آنا اور "طرفداری" نظر آنا، یہ دونوں باتیں ہم سب کی نظروں میں (الا ماشاء اللہ) شیعیت کا رنگ آجانے کا نتیجہ ہیں۔ اور یہ رنگ کوئی اچھا رنگ نہیں ہے۔ واقعہ کربلا سے اور جو کچھ ہوا ہو!

1— SPIRIT OF ISLAM P 301 Delhi (1978)

زیر اہو شیعیت کو اپنی دوکان چمکانے اور اپنے اثرات پھیلانے کا وہ بے پناہ موقع ملا جس کا کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ اس لیے ضرورت ہے کہ نہایت ٹھنڈے دل سے پورے معاملے کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

سنی معاشرے پر شیعیت کے اثرات

میں اس کو کیا کہوں؟ اپنے والد ماجد کا ایک اعتراف اور ایک بیان نقل کرتا ہوں۔ سنی اہل سنت کے اخیر زمانے میں میرا مضمون حادثہ کربلا شائع ہوا تو والد ماجد کچھ باہر کہیں سفر میں تھے۔ میری عادت یہ رہی تھی کہ جو کچھ بھی لکھتا بالعموم اُن کو دکھا کر ہی اشاعت میں دیتا تھا۔ مگر یہ مضمون اُن کی حالت سفر کی وجہ سے نہیں دکھایا جا سکا تھا۔ تاہم اگر پڑھا تو میرے یہاں تشریف لائے۔ جو لکھنؤ میں محلے میں گھر سے لگے تھے۔ فرمایا اس بات پر کہ حضرت حسینؓ کے اقدام کو "بغاوت" سے تعبیر کیا اور اس سے بڑھ کر یہ کہ یزید کے حق میں "انعقاد بیعت" یعنی بیعت یا پھر بیگی تعلق کے لیے یہ کلمات تم نے کہاں سے لکھ دی! لفظ "بغاوت" کی غلطی کے بارے میں تو خود ہی فرمایا کہ وہ آج کل کے معنی میں استعمال ہو گئی کہ یہ لفظ ہمارے قدماء کے یہاں بے شک برا لفظ ہے لیکن آج کل کا ہندوستانی تو اس لفظ کو اپنے بیان کے آج کے استعمال کے مطابق لے گا اور آج کے استعمال میں خصوصاً تحریک آزادی ہند کے پس منظر میں تو یہ لفظ ایک پسندیدہ معنے کے لیے بولا جاتا ہے کہ کوئی گروہ منظم ہو۔ لیکن دوسری غلطی والی بات اس وقت درج ہوئی جب پانچ چھ کتابوں کے بیان سے کہ جو ایک الاسلام صاحب حق حضرت کے پہنچائے گئے تھے۔

یہ بات تو تقریباً ۳۲ برس پہلے کی ہے۔ زیر نظر کتاب کا جب وہ باب تیار ہوا اور والد ماجد نے سنا جو حضرت عمرو بن عبداللہ یزید کے حال اور عہد کے متعلق ہے تو بیان فرمایا کہ ہمارے بچپن میں عشرہ محرم میں ہمارے گھر مجلس ہوتی تھی جس میں بھائی صاحب تاریخ ابن خلدون

احترام سے حضرت حسینؓ کی شہادت کا بیان سناتے تھے جب بھی حضرت مغیرہؓ کا ذکر آ جاتا تھا تو بعض بڑے بوڑھوں کا ان کے متعلق یہ کہنا یاد ہے کہ "[illegible] وہ تو مغیرہ بن شعبۃ الفتن تھے" یعنی فساد کا بیج تو انہوں نے ہی بویا تھا۔ [illegible] وہ بھی جب فضائل و مناقب صحابہؓ کے متعلق کس بے تکلفی سے کتنی بڑی بات کہہ دی جاتی تھی! ــــ [illegible] کے پرانے لمبے بوڑھوں کی ہی یہ باتیں کہی جاتی تھیں جن کے پاس کوئی خاص علم نہ تھا اور جن کے زمانے تک اس موضوع پر کوئی بڑا اصلاحی کام ہندوستان میں نہ ہوا تھا لیکن ہمارے زمانے کے ایسے اہل علم تک جن کے متعلق اس طرح کے کسی تعصب کا احتمال بھی ان کے علمی و تحقیقی مذاق کی بنا پر نہیں کیا جا سکتا تھا ان کے قلم سے ہم بعض ایسی ہی نسبت شکنی ہوتی دیکھتے ہیں۔ یزید کی ولی عہدی کے قصے میں ایک ضعیف سی روایت پر اعتماد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حضرت مغیرہؓ نے اپنی گورنری بچانے کے لیے یزید کی ولی عہدی کا خواب حضرت معاویہؓ کو دکھایا جو ان کے لیے اتنا خوش کن تھا کہ حضرت مغیرہؓ سے لی جانے والی گورنری بحال کر دی گئی۔ کس ناشائستہ انداز میں لکھا ہے کہ:

> "یزید کی ولی عہدی کے لیے ابتدائی تحریک کسی صحیح جذبے سے نہیں ہوئی تھی بلکہ ایک بزرگ نے اپنے ذاتی مفاد کے لیے دوسرے بزرگ کے ذاتی مفاد سے اپیل کر کے اس تجویز کو جنم دیا۔"

حضورؐ کی قرابت کا احترام یا عصمت کا عقیدہ؟

"حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت بے شک قابل صد لحاظ اور واجب الاحترام شئی ہے۔ وہ آدمی بدنصیب ہے جو آپ کی قرابتوں کا لحاظ اور احترام نہ کرے۔ لیکن لحاظ و احترام الگ چیز ہے اور معصومیت محض کا اعتقاد کسی کو بالکل الگ چیز ہے۔ شیعیت حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے

---

[1] [illegible]
[2] خلافت و ملوکیت از سید ابوالاعلیٰ مودودی صفحہ [illegible]

کے ساتھ حضرت فاطمہ، حضرت علی اور حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہم اور اپنے دیگر افراد کو بھی عصمت کے سبب پیدا نہ کر تی ہے۔ نتیجے میں ان محترم حضرات سے کسی خطا اور بھول چوک کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جبکہ ان سے اختلاف کی صورت میں اختلاف کرنے والا لازماً ہی خطاکار و گنہگار قرار پائے گا۔

ہم اہل سنت بطور عقیدہ عصمت صحابہ نہیں مانتے مگر بہت تھوڑے لوگوں کو چھوڑ کر ہمارا عمل اسی ذہنی رویے کی شہادت دیتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانے سے حضرت عثمان غنیؓ کے زمانے تک کے معاملات میں بعض دوسری اختلافی قسم کی روایات ملتی ہیں۔ اس رویے کے اظہار کی اجازت نہیں دیتیں۔ لیکن اس دور کے ختم ہوتے ہی جونہی دور حضرت علیؓ کا آتا ہے تو ہمارے اس رویے کے اظہار کا دور بھی شروع ہو جاتا ہے۔ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے اختلاف کی کہانی میں ہم ذرہ برابر بھی انصاف پسندی کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ نصرت کے بجائے حضرت معاویہؓ کو بس کچھ رعایت کی شکل دیتے ہیں۔ اگر ہم سب بھی انصاف پر آ جائیں تو اس قضیے کی صورت ہماری نظر میں یقیناً بہت کچھ مختلف ہوتی۔ ہم نے اس رویے کو کتاب میں بہت بے جھجک اختلافات سے ابھرتے ہیں۔ گو کہ ہمیں اس کا ردِ عمل الشیعی اثرات کا نام دیا ہے جن سے اہل سنت کا کوئی طبقہ بھی مشکل ہی بچ سکا ہے۔

بے انصافی کی ایک مثال

بے انصافی کی صرف ایک مثال لیجیے ـــــ اس لیے کہ یہاں اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں نکل سکتی ـــــ کہ جن تاریخی کتابوں سے ہم حضرت معاویہؓ کی طرف سے حضرت علیؓ پر سب و شتم کی روایتیں پاتے ہیں انھیں کتابوں کی شہادت یہ بھی ہے کہ:۔

• وکان علی اذا صلی الغداة	اور وہ اقامت کے بعد علیؓ جب فجر کی
یقنت یقول : اللھم العن	نماز پڑھتے تو قنوت پڑھتے اے اللہ

معاویۃ وعمرا وابا الاعور وحبیبا	کہ اے اللہ لعنت کر معاویہ پر عمرو پر
وعبد الرحمٰن بن خالد والضحاک	پھر ابو الاعور پر حبیب ابن مسلمہ پر ،
بن قیس والولید فبلغ ذالک	عبد الرحمٰن ابن خالد ابن ولید پر ضحاک پہ
معاویۃ فکان اذا قنت لعن	قیس پر ولید پر۔ جب یہ اطلاع معاویہ
علیا و ابن عباس والحسن	کو معلوم ہوئی تو وہ بھی جب قنوت کرتے تو
والحسین والاشتر [1]	علی ابن عباس حسن حسین اور اشتر پر لعنت کرتے

لیکن اس صاف و صریح بیان کے باوجود ہمیں صرف اتنا یاد ہے کہ معاویہؓ اور ان کے ساتھی حضرت علیؓ پر سب و شتم کرتے تھے[2]۔ یہ تو حضرت علیؓ کے اس احترام کا نتیجہ ہے جو از روئے کتاب و سنت ہم پر واجب ہے کیونکہ کتاب و سنت بہ نفسانی نہیں ہو سکتی بلکہ اس احترام کا نتیجہ ہے جو شیعیت والے عقیدۂ معصومیت سے لازم آگیا ہے۔ اہل سنت کے اصل مذہب کا تقاضہ تو یہ تھا کہ اگر یہ روایت حضرت علیؓ کے حق میں قابل یقین یا قابل بیان نہیں تھی تو ایسا ہی حضرت معاویہؓ کے حق میں بھی سمجھا جاتا کہ وہ بھی صحابی ہیں۔

تاہم حضرت علیؓ کے مقابلے میں یہ کہا گیا تھا کہ حضرت معاویہ بھی ایک صحابی تھے۔ اس لئے ہم اپنے علم کلام کے ماتحت مجبور ہیں کہ ان کے ساتھ کچھ رعایت برتیں۔ لیکن جب ان کے بیٹے یزید کا سوال آتا ہے تو اس کے اور حضرت حسین ابن علیؓ کے معاملے میں ہم میں اور شیعوں میں کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا۔ اس لئے کہ یزید کو ایسا کوئی تقدس حاصل نہیں تھا جیسا کہ اس کے والد حضرت معاویہ کو حاصل تھا۔ شیعوں نے "مسئلہ" کو حق و ناحق کا بنا کر اس لڑائی کو جو تمام تر خلافت پر اس کا جھگڑا تھی۔ تو ہم لوگ بھی حضرت حسینؓ کی حمایت کرنے لگے

---

[1] طبری ج ۵ ص ۴۰ [2] اور یہاں سے معلوم ہوا کہ طبری کی روایت میں معاویہ کا نقل کیا گیا ملاعنہ کے حضرت علی کا لفظ ہے اس کو ابن جریر نے اپنی کتاب میں درج کیا جبکہ حضرت معاویہ کے ساتھ صحب کے لفظ صحابی ہے جس کا ترجمہ ہم سب و شتم کرتے ہیں۔

گئی تھی اس لیے بالکل ناممکن ہے کہ پہلی ہی بار اسے شروع کر دیا۔ پھر جس کو جب آیا کہ اس سے تو حضرت معاویہؓ پر بڑا الزام آتا ہے، تب یوں کر دیا گیا کہ حضرت معاویہؓ کی زندگی میں تو وہ ایسا نہیں تھا لیکن بعد میں ہو۔ حد یہ ہے کہ ابن خلدون جیسا آدمی بھی یزید کی ولی عہدی کی زبردست وکالت اپنے مقدمۂ تاریخ میں کی ہے۔ وہ بھی ذرا اس نکتے پر گئے کہ جب یزید اور حضرت حسینؓ کے قصے پر آتا ہے تو نہ جانے یہ بات کیسی شروع کر دیتا ہے یعنی یہ کہ وہ ناہنجار و فاسق ہو گیا تھا کب ہو گیا تھا؟ اور سب اس بات کا پتہ چلا؟ تاریخ تو کوئی سی بھی اٹھا کر دیکھ لیجیے ہر جگہ یہی بیان ہے کہ جیسے ہی مدینے کے گورنر نے حضرت حسینؓ کو یہ اطلاع دی کہ حضرت معاویہ انتقال فرما گئے اور ان کے ولی عہد یزید بن معاویہ آپ سے بیعت چاہتے ہیں ویسے ہی حضرت حسینؓ نے مدینہ چھوڑنے کا ارادہ فرمایا اور آپ نے اسی رات میں سارے تمام خاندان کے ساتھ مکے کی راہ لی۔ اس کے بعد جب اس کی اطلاع شیعان علی کو پہنچی تو وہ بھی اپنے خطوط بھیجنے کے عادی ہو گئے اور حضرت مسلم بن عقیلؓ کی مدت میں یہ طے کیا گیا کہ وہاں میں حالات کی جانچ پڑتال اور ضروری پیش بندی تیار ہوں گے۔ یہ مسلم بن عقیل کو کوفہ روانہ کر دیے گئے۔ تو کیا یہ سمجھا جائے کہ یزید نے تخت خلافت پر بیٹھتے ہی والد کے انتقال کی خبر سنتے ہی فسق و فجور کا وہ عالم برپا کیا کہ حضرت معاویہ کے انتقال کی خبر سے پہلے یزید کے فسق و فجور کی خبریں پھیل گئیں؟ حالانکہ سچائی یہ ہے کہ اس بات کے لیے سوا مہینہ بالکل ناکافی تھا کہ ایک مسلمان خود کو بیچارہ کرے کی طرح فسق و فجور میں بدنام ہوا ہے۔[1]

لکیر کی فقیری یا طلب علم و تحقیق؟

اب ایک طرف تو یہ ہے کہ جب ابن خلدون جیسے آدمی نے بھی یہ لکھ دیا تو پھر حضرت بہت سا ہو جو سمجھ میں آ گئے وقت کے ماننے کی کیا گنجائش ہے؟ یہ وہ طریقہ اور طرز عمل ہے

---

[1] کتاب ہٰذا میں آگے چل کر اس پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

جس نے بڑی بات یہ ہے کہ جمود افکار خراب کیا ہے اور علم کے نام سے علمی جمود بیمار اشتعال کیا ہے۔ اکابر کی توقیر و تعظیم کے نام پر طلب علم و تحقیق کی راہ بند کرنے والا یہ طرز فکر اگر ہمارے یہاں عام نہ ہوا ہوتا تو ہمارا علم دین کے حلقے سے بہت مختلف ہوتا۔ بھلا اس کے پیچھے شیعیت یہاں اس وقت گھس آئی تھی جب اس نے ایک باقاعدہ تحریک کی شکل اختیار نہیں کی تھی۔ یہ بعد کے دور میں علمی طور سے نکالی جا سکتی تھی اور نکال دی جاتی اگر طالب علمانہ ذہنیت کی جگہ یہ متعصبانہ ذہنیت ہم پر حاوی نہ ہو گئی ہوتی کہ جو لوگ ہمارے بڑے کہہ گئے اور لکھ گئے وہ حرف آخر ہے اور اس لکیر کی فقیری ہم کو کرنا ہی ہے ؎

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید

اللہ ہی جانے کہاں سے یہ طرز فکر اس امت کے اسلام میں آیا جس کا [illegible] خود فکر کی دعوت سے اٹھایا گیا تھا اور آباء و اجداد اور رہبان و احبار کی اندھی تقلید کو ضلال و خسران بتایا گیا تھا؟ کھلی ہوئی بات ہے اور ہم سب جانتے ہیں کہ کوئی آدمی عالم کل نہیں ہوتا۔ پھر ہر ایک کا کچھ خاص زاویہ نظر ہوتا ہے اور ایک اپنے زمانے اپنے ماحول اور ماحول کے مناسب چیزوں سے متاثر ضرور ہوتا ہے۔ اس لیے کوئی کتنا ہی بڑا عالم اور محقق ہو کہیں نہ کہیں ٹھوکر ضرور کھائے گا۔ کسی ذکی الحس یا منصف نہیں کا شکار ضرور ہو گا والاتفاق و اللہ۔ اس لیے اگر اس کے احترام کے ساتھ ساتھ علم کے حق کا احترام بھی ملحوظ ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی باتوں کو تقلیداً لینے کے بجائے تحقیقاً لینے میں کوئی حرج سمجھا جائے۔ خذ ما صفا ودع ما کدر۔ جو ٹھیک ہے اسے لے لو اور جس میں گرفت ہے وہ چھوڑ دو اور کسی کے دوسرے حصے پر عمل نہ کیا جائے۔ کسی بڑے آدمی کے حوالے ہی کی ضرورت اگر اس کھلی ہوئی بات کو بھی قبول کرنے میں ہو تو حضرت امام مالک کے بارے میں نقل ہوا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

کل واحد منہ مردود علیہ سوائے اس قبر والی ذات گرامی کے ہر کسی کا

ہر انسان کی اس محدودیت اور امکانیات کے علاوہ ایک دوسری کمی یہ ہوتی بات یہ ہے کہ کسی گذشتہ زمانے کو ہم اخلاق و کردار اور عادات و اطوار کے لحاظ سے اس کے بعد والے زمانوں کے مقابلے میں خواہ کیسا ہی بہتر سمجھیں مگر وسائل کے معاملے میں ہر بعد والا زمانہ پچھلے زمانوں کو پیچھے چھوڑتا آ رہا ہے۔ وسائل علم کا بھی یہی حال ہے کہ وہ برابر ترقی پذیر ہیں۔ کتنے ہی ہو اگلی صدیوں میں یا تو مدون ہی نہ تھے اور مدون ہو گئے تھے تو ان کے مجموعے آسانی سے دستیاب نہ تھے، جبکہ زمانے کی ترقیوں نے ان کو اب نہایت منقح شکلوں میں ہر کہ و مہ کی دسترس میں کر دیا ہے۔ پھر علمی تحقیقات کو آسان بنانے کا نت نئے نئے طریقے اور وسیلے ایجاد کے نئے کرشمے دکھا رہا ہے۔ نتیجے میں نئی علمی تحقیقات کا بھی ایک سلسلہ قائم ہو چکا ہے۔ ایسے حالات میں ہمارا علم پچھلوں کا قول اور مجموعہ [illegible] کا نمونہ بنا رہا ہے۔ جس معاملے میں یہ بیان اگلے لوگ دے گئے تھے اور جو ان سے ظاہر کر گئے تھے اس سے نئے اور بہتر وسائل کی روشنی میں پرکھ کر دیکھنے اور پھر رد کر دینے یا قبول کر لینے کا اپنا فیصلہ کرنے کی جرأت کے بجائے ہر پچھلے کے قول اُسی رائے پر قائم رہتے ہیں اور ہر نئی آگاہی اور نئی روشنی سے دور بھاگنے ہی کو اپنی سعادت سمجھیں۔ بے شک حسن نیت کے ساتھ یہ اخروی سعادت ضرور ہو سکتی ہے مگر دنیوی سعادت کی قیمت پر ہو گی — اور چھوٹی سی ہے — جبکہ ہمارا دین بیک وقت دونوں سعادتوں کا کفیل ہے اور دونوں کی بیک وقت طلب ہی راہ دکھا سکتا ہے۔[1]

دوسرا طریقہ جو ابن خلدون سے اہل علم کا اصل طریقہ ہے، یہ ہے کہ اگر حضرت حسینؓ کی زندگی میں یزید کے فسق و فجور کی کوئی معتبر شہادت نہیں

---

[1] بالکل، اعتراف ہے کہ ہر چیز کا تعلق [illegible] معلوم ہوتا ہے ہے بہت کچھ ناقدرانہ [illegible] کے ادبی و دینی معاملے میں ایک حد تک وہ اپنا حال بھی رکھتا ہے۔ بہ افسوس ہوتا ہے کہ [illegible] حصہ، مگر نہیں کی [illegible] کی زندگی کے [illegible] ہے۔

حتیٰ کہ زیر بحث ساری روایت کے بشرط لا مخصوصات کہے تب بھی اس قول اور بیان کو بس اسی پر محمول کرنا چاہیے کہ بعض باتیں بڑی شہرت کی بنا پر اس درجہ یقینی اور تسلیمی بن جاتی ہیں اور ایک مدت تک یہی بار آتی ہیں کہ ان کی واقعیت میں کسی شک اور التباس کے بارے میں کسی تحقیق کی ضرورت کا سوال ہی ذہن میں نہیں آتا۔ اور یہی چیز اس معاملے میں بھی پیش آئی ہے۔ حضرت حسینؓ جیسی شخصیت کا یزید کے آدمیوں کے ہاتھوں قتل اور پھر شیعہ پروپیگنڈہ کی تیزی جس نے پروپیگنڈہ کے زور پر حضرت عثمانؓ جیسے عظیم المرتبت صحابی کو ملک کا مورد عتاب بنا دیا تھا، ان دو چیزوں کی طاقت مل کر یزید کے بارے میں کیا کچھ نہیں باور کرا سکتی تھی؟ اس تہمت کا پردہ جب تک حائل رہا تھا اور پروپیگنڈے کا سحر نہ ٹوٹا تھا تب تک یہ سب حکایات بھی رواں چلتی رہیں۔ مگر کیا وجہ ہے کہ جب اصل حال ہی معلوم ہو گیا ہے اور حقیقت کھل جانے پر بھی ان کے ساتھ حقیقت پسندانہ معاملہ نہ کیا جائے؟

مومن کا معیار اور اس کی ذمہ داری

یزید سے ہماری کوئی رشتہ داری نہیں ہے۔ اور اگر ہے تو پہلے حضرت حسینؓ سے ہے حضرت معاویہؓ سے ہماری کوئی رشتہ داری نہیں۔ اور اگر ہے تو پہلے حضرت علیؓ سے ہے۔ مگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جن کی ذات اللہ کی طرف سے تمام رشتہ داریوں سے اوثق ہیں۔ ان کی مبارک تعلیم نے ہمارا رشتہ سب سے پہلے حق اور صداقت کے ساتھ قائم کر دیا ہے باقی تمام رشتہ داریاں ثانوی درجہ

لہ صرف ایک عبارت ہم معلوم کر سکے ہیں جس میں ہے کہ حضرت معاویہؓ نے یزید کی ولی عہدی کے سلسلے میں اپنے عامل بصرہ زیاد سے مشورہ مانگا۔ اس نے یزید کے شوقِ شکار اور کچھ آزادہ روی و سہل انگاری کا تذکرہ کر کے پیش نظر یہ کام کچھ موخر کر دینا مناسب سمجھا اور ساتھ ہی یزید سے کہلوا دیا کہ وہ اپنے حالات کی اصلاح کرے چنانچہ اسی روایت کے مطابق اس نے اپنی حالت میں بہت کچھ اصلاح کر لی (طبری ج ۶ صفحہ ۱۷۰) یعنی جو کچھ بھی خرابی تھی وہ حضرت معاویہؓ کی زندگی میں تھی اور انہی کے زمانے میں ختم ہو گئی۔

اس کے بعد کہا ہے۔

یا ایھا الذین امنوا کونوا قوامین	اے ایمان والو مضبوط کھڑے ہو انصاف کے
بالقسط شھداء للہ ولو علی	ساتھ گواہ رہو اللہ کی طرف کے اگرچہ گواہی تمہارے
انفسکم او الوالدین والاقربین۔[1]	اپنے خلاف ہو یا تمہارے والدین اور قرابتداروں
	کے خلاف ہو۔

یا ایھا الذین امنوا کونوا قوامین	اے ایمان والو کھڑے ہو مضبوط اللہ کے لیے
للہ شھداء بالقسط ولا یجرمنکم	انصاف کے گواہ بن کر اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں
شنان قوم علی الا تعدلوا اعدلوا	بے انصافی پر آمادہ نہ کرے۔ انصاف کیا
ھو اقرب للتقوی۔[2]	کرو کہ یہ قرین تقویٰ ہے۔

اسلام کی اس واضح اور صریح تعلیم کو دھیان میں رکھتے ہوئے ہمیں تو اس کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی کہ یزید کے لیے اور حضرت حسینؓ کے لیے ہمارے پاس الگ الگ ترازو اور الگ الگ باٹ ہوں بلکہ،

العین تدمع و القلب یحزن	آنکھ اشکبار ہے اور دل ہے غم گریاں
ولا نقول الا ما یرضی بہ ربنا۔[3]	لیکن زباں پہ کچھ نہ ہو جو ہو رب کو ناپسند۔

حضرت حسینؓ اور یزید کے قضیے کا مطالعہ اگر اللہ و رسول کی ان تعلیمات کی روشنی میں اور اس اسپرٹ سے کیا جائے جس اسپرٹ سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ایک یہودی ملزم کے ساتھ تنازعہ کی طلبی پر اپنے قاضی کی عدالت میں پیشی قبول فرمائی۔ جس اسپرٹ کے ساتھ قاضی نے حضرت علیؓ کے خلاف فیصلہ دیا اور صرف اس بنا پر فیصلہ دیا کہ گواہی معتبر شرائط پر پوری نہیں اترتی) اور جس اسپرٹ کے ساتھ حضرت علیؓ نے یہ فیصلہ بلا تامل قبول فرما لیا۔ انصاف

---

[1] القرآن سورۃ النساء رکوع ٢٠ آیت ١٣٥۔ [2] القرآن سورۃ المائدہ رکوع ٢ آیت ٨

[3] یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جو آپ نے اپنے صاحبزادے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے انتقال پر فرمایا جب وہ جان آفریں کے سپرد کر رہے تھے اور آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

کی اس اہمیت کے ساتھ ہم اگر سارے لٹریچر کو جانچنے کی کوشش کریں تو اس تنقیح میں جس حد تک عمو
تصور چلا آرہا ہے اس کے باقی رہنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ اور اگر ساتھ ہی ایک دیانتدارانہ
اور غیر جانبدارانہ مطالعہ اس تصور اور تاثر کو باقی رکھنے کی اجازت نہیں دیتا جو اس معاملہ میں
اب تک عام طور سے رہا ہے تو صرف یہی نہیں ایک دیانتدارانہ فریضہ ہے کہ اس معاملہ کو سامنے
لایا جائے اور ان تمام حلقوں تک اسے پہنچانے کی امکان بھر سعی کی جائے جو اب تک کے
تصور کو ایک ایمانی سعادت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس طرح حقائق کے ساتھ بے انصافی
جیسی غلط چیز ایمان کا تقاضہ بن جاتی ہے۔

اس کام کی ضرورت

راقم کو پورا احساس ہے بلکہ تجربے نے جس کا اوپر اظہار ہو چکا ہے کہ ایسے معاملات میں جن کا
تعلق آدمی کے مذہب کے جذبات سے جڑ گیا ہو ایک مدتوں اور سلسلوں سے چلے ہوئے تاثر اور تصور
کو چھیڑنا ایک پرخطر کام ہے۔ مگر یہاں یہ بھی ایک دشوار کام ہے کہ خدا کی غیبیات کی
دنیا بھی انسان کی ایمانداری کے امتحان کی جگہ جگہ آنا کانی میں پڑتی ہے۔ اس لیے اب تک کا
وہی تصور کچھ دیکھ ہم کسی کو دھوکے میں ڈالتے ہیں۔ مگر یہ معاملہ جیسا کہ اوپر بھی گزر چکا ہے جن معاملات
میں سے ہے جنہوں نے ہمارے موجودہ دینی فکر کو کلی طور سے بہت متاثر کیا ہے۔ یہ ان
معاملات میں سے ہے جن معاملات نے ہمارے اندر ایمانداری اور غیر جانبداری کے تصور کو
مجروح کیا ہے۔ ان معاملات نے شخصیت پسندی کی بے لاگ اسلامی روح کو بے جان کر دیا ہے
حقیقت بینی اور حقیقت پسندی جو اسلام کی سب سے بڑی امتیازی شان تھی اس سے امت کو کافی حد تک
محروم کیا ہے۔ امت کا وہ طبقہ جو اکابر کی عقیدت میں محفوظ حلقہ جماعت اپنے آپ کو سب سے زیادہ حق پر سمجھتا
ہے اور اس طرح حق سب سے زیادہ متعصبانہ اور متنازعہ چیز بن گئی ہے۔ یہ ایسے ہی معاملات
کا زبردست اثر ہے جن میں انصاف اور حقیقت پسندی جیسے بنیادی اسلامی اور انسانی تقاضوں

کو دوسرے تیسرے اور چوتھے درجے کے تقاضوں سے مغلوب ہو کر قربان کر دیا گیا ہے۔ ہمارے اندر نئے نئے حلقوں کی پیدائش، پرانے حلقوں کے باہمی بُعد میں اضافہ اور ان میں سے ہر ایک کے اندر انتشار اور ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے نئی باہمی تقسیمیں، یہ سب عذاب اسی انصاف پسندی، حقیقت پسندی اور حقیقت بینی کے فقدان کا ہے۔ اس عذاب سے اُمت کے نکلنے کی کوئی صورت اس کے بغیر نہیں ہے کہ جہاں جہاں سے اس فساد کی ابتدا ہو فوراً علاج یہاں وہاں سے اصلاح کے کام کی ہمت کی جائے۔

پیشِ نظر کتاب اصلاح ازالۃ الخفاء کے ایک ادنیٰ تکمیل ہے مگر جس مقام پر یہ کتاب پر تیار ہوئی ہے وہ میرے انتہائی احساسات کا نتیجہ ہے۔ یہ ہماری سب سے بڑی ضرورت کے ساتھ احساس ہے کہ ہمارے یہاں حقیقت پسندی اور انصاف پسندی کا جب یہ عالم ہی اور دینی سوچوں کا دائرہ ایک خاص حد تک تنگ ہو گیا ہے اور اس کا نتیجہ ہے کہ صحابیت کی ہمارے یہاں حقیقت ہو گئی ہے صحابیت کی تعظیم جاتی رہی۔ ہم یہ وہاں کا حال دیکھ چکے ہیں۔ دنیا کی ہر سعادت سے محرومیت ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ جو قوم بھی حقیقت بینی اور حقیقت پسندی کا دامن چھوڑ کر نیند کرے گی اور صحابیت کو نشانہ بنائے گی وہ لازماً ایسا ہی کرے گی اور یہی کچھ اپنا مقدر بنائے گی۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ اپنا پیغام بھیجے یہ کتاب اس تبدیلی عمل میں مددگار ہو۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سیدنا محمد وآلہ واصحابہ اجمعین۔

کچھ حوالوں کے سلسلے میں

کتاب کی تسوید کا بیشتر کام خود میری نشست سے جولائی ۱۹۸۰ تک ہندستان کے قیام میں ہوا، مگر اس کی شروعات لندن ہی میں ہو چکی تھی۔ لندن میں البدایہ والنہایہ وغیرہ کے چند ایڈیشن سامنے رہے تھے اور جن سے لیے ہوئے کچھ نوٹس وغیرہ بھی ساتھ تھے ہندستان

میں کام کرتے وقت یہ ایڈیشن دستیاب نہ ہو سکے اس کی بنا پر ایک ہی کتاب کے دو ایڈیشنوں کے حوالے کتاب میں آ گئے ہیں، کوشش کی گئی ہے کہ حوالے میں ایڈیشن کا تعین ہو جائے مگر امکان ہے کہ کہیں کچھ التباس ہو گیا ہو۔ اگر کوئی صاحب ان دونوں کتابوں کا کوئی حوالہ ملائیں اور اس میں کوئی دقت پیش آئے تو سمجھ لیا جائے کہ صفحہ کا نمبر دوسرے ایڈیشن کا ہے۔ ان کتابوں میں واقعات کا سنہ وار ذکر ہے اس لیے سنہ کے حساب سے ہر واقعہ بآسانی ہر ایڈیشن میں پایا جا سکتا ہے۔

آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کتاب سے اگر کوئی خیر انجام پائے تو اسے قبول فرمائے اور قلم نے کہیں لغزش کی ہو تو اس کے اثرات سے ناظرین کو بچائے اور مجھے اس پر متنبہ ہونے کی سبیل پیدا فرمائے۔

تشکر و امتنان

کتاب کی تیاری کے سلسلے میں جن اصحاب کی مدد کا میں ممنون ہوں ان میں سرِ فہرست نام جناب مولانا سید محمد مرتضیٰ صاحب ناظم کتب خانہ دار العلوم ندوۃ العلماء کا ہے جن کی عنایت و کرم فرمائی سے ضرورت کی ہر وہ کتاب جو کتب خانہ میں تھی ہر وقت اور بآسانی دستیاب ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس ہمدردی کا بہتر بدلہ میری طرف سے دے۔ افسوس کہ وہ اس دوسرے ایڈیشن کے وقت ہماری دنیا میں نہیں ہیں۔ ندوۃ العلماء کے اساتذہ میں سے محب قدیم مولانا برہان القرآن صاحب سنبھلی اور ایک نئے محب مولانا حفیظ احمد صاحب بستوی کو بھی میں نے کئی دفعہ بعض چیزوں کی تلاش کے لیے تکلیف دی ہے۔ ان حضرات کے علمی ذوق و نظر نے آسان کر دیا۔ ہر وقت کے اور حسب ضرورت مددگاروں میں میرے عزیز بھانجے خورد سال خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی رہے۔ الفرقان کو مسلسل معاونت رہے گی کتابت کی تصحیح وغیرہ کی ذمہ داری

جبکہ اس کام کو مکمل کیے بغیر لندن چلا آیا تھا، انھیں کے ذریعہ ہوا۔ اور اس کے بعد کتاب کی طباعت اور اشاعت کے اہتمام کے لیے ان سے بڑے بھائی میاں محمد حسان نعمانی دعاؤں کے مستحق ہیں۔

آخر میں اللہ سے دعا ہے کہ اس کتاب سے اگر کوئی خیر انجام پائے تو اسے قبول فرمائے اور قلم سے کہیں لغزش کی ہو تو اس کے اثرات سے قارئین کو بچائے اور مجھے اس پر متنبہ ہونے کی سبیل پیدا فرمائے۔

عتیق الرحمٰن سنبھلی

لندن ۴؍ اگست [illegible]

باب اوّل

شہادت عثمانؓ ـــ خانہ جنگی ـــ صلح حسنؓ

شہادت عثمانؓ اور خانہ جنگی

حضرت عثمانؓ کی شہادت ۳۵ھ کے وقت سے مسلمانوں پر ایسا باہم قتال کا جو دروازہ کھلا تو پھر اس پر حرام ہو گیا کہ بند ہو، اور یہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔

میری امت میں جب ایک دفعہ آپس میں تلوار کھنچ جائے گی تو پھر وہ قیامت تک کھنچی رہ جائے گی۔	واذا وضع السیف فی امتی لم یرفع عنها الی یوم القیامة[1]

یہی بات حضرت عبداللہ بن سلامؓ (صحابی) نے ان کوفیوں، بصریوں اور مصریوں سے فرمائی تھی جو حضرت عثمانؓ کے درپے قتل تھے[2]۔ مورخ ابن اثیر نے ان کے الفاظ نقل کیے ہیں

اے لوگو! اللہ کی تلوار کو نیام سے مت کھینچو خدا کی قسم اگر تم نے کھینچ لیا تو پھر وہ کبھی نیام میں نہ جا سکے گی	یا قوم لا تسلوا سیف اللہ علیکم فواللہ ان سللتموہ لا تغمدوہ ویلکم ان سلطانکم الیوم یقوم

---

[1] مشکوٰۃ کتاب الفتن فصل ثانی بحوالہ ابوداؤد و ترمذی

[2] انہی لوگوں کے ہاتھوں حضرت عثمانؓ کی شہادت ہوئی۔ یہ کون لوگ تھے؟ ان کی پوری تفصیل ان شاء اللہ باب دوم میں آئے گی۔

واللّٰہ لئن قتلتموہ لا تلقوہ ... نہیں ہے ۔ دوسری ... کبھی کی تھی
ذبابۃ سیف ... حکومت خلافت سے بھی ... ہے
اگر تم نے ان عثمانؓ کو قتل کر دیا تو پھر
یہ تلوار ہی سے چلے گی ۔

اور حضرت عثمانؓ نے ان لوگوں سے اس بات کو یوں کہا تھا

" اگر تم نے مجھے قتل کر دیا تو پھر آئندہ کبھی باہم محبت سے رہ سکو گے ، ایک ساتھ نماز پڑھ پاؤ گے اور ایک جان ہو کے دشمن سے لڑ سکو گے "

جنگ جمل اور صفین

پھر تلوار ایسی چلی اور ایسی چلی کہ الامان الحفیظ ۔ شہادت عثمانؓ پر ایک سال مشکل گزرا کہ مسلمانوں نے دو بڑی بڑی جنگیں جنگ جمل اور جنگ صفین کے نام سے لڑیں اور اپنے ہزاروں بہترین افراد ساری جنگوں کی نذر کر دیئے ۔ دونوں جنگوں کے مقتولین کی تعداد نوے ہزار تک بتائی گئی ہے[1] اور جنگ جمل کی تیرہ ہزار تک ۔[2]

جنگ جمل جمادی الاخریٰ سن ۳۶ھ میں ہوئی ۔ اس میں ایک طرف حضرت علیؓ تھے ۔ دوسری طرف ام المومنین حضرت عائشہؓ حضرت زبیرؓ اور حضرت طلحہؓ ۔ اس کو جنگ جمل اس بات کی وجہ سے کہا گیا ہے کہ حضرت عائشہؓ جس اونٹ پر سوار تھیں اور اس جنگ کا فیصلہ اس اونٹ کے گرنے پر ہی گویا ٹھہر گیا تھا ۔ عربی میں اونٹ کو جمل کہا جاتا ہے ۔ حضرت علیؓ کے لشکر کے دباؤ سے حضرت عائشہؓ کے حمایتی اگر پیچھے ہٹتے تھے تو اس اونٹ کے پاس جا کر بھونچال بن جاتے تھے اور اس کی حفاظت میں پروانہ وار جانیں دیتے ۔ سینکڑوں [illegible]

---

[1] الکامل فی التاریخ ، ابن اثیر ج ۳ ص ۲۰۵ دار الفکر بیروت

[2] تاریخ الامم والملوک (تاریخ طبری) ... جلد ۴ ج ... ص ۵۱۸ ۔ دار القلم بیروت

گئے وہ جو اس وارث کے مددگار شہید ہوئے۔

اس جنگ کا مختصر قصہ یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت ماہ حج (ذی الحجہ) میں ہوئی جبکہ اہل مدینہ کی بھاری تعداد حج کے لیے گئی ہوئی تھی۔ حج میں ان کے ساتھ حضرت عائشہؓ اور بعض دوسری امہات المومنین بھی تھیں۔ یہ واپس ہو رہی تھیں کہ مدینے سے بہت سے لوگ مکہ پہنچ گئے جن سے حضرت عثمانؓ کے قتل کر دیے جانے کی خبر ملی۔ حضرت عائشہؓ نے پہلا ارادہ بدل دیا اور مکے ہی میں ٹھہر کر قاتلوں کے خلاف کارروائی کی منصوبہ بندی کا فیصلہ کیا۔ اسی دوران میں حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ بھی مدینے سے پہنچ گئے۔ یہ خبر لائے تھے کہ مدینہ بالکل باغی اوباشوں کے قبضے میں ہے جن کے ہاتھوں خلیفہ سوم قتل ہوئے۔ ہم بھی بال بال بچ کر آ گئے ہیں۔ مکی دور اندیش لوگوں نے صورت حال کی نزاکت کے پیش نظر ان اوباشوں کے خلاف کارروائی کے سلسلے میں آخری فیصلہ یہ ہوا کہ براہ راست مدینہ نہ جایا جائے بلکہ بصرہ اور کوفہ کا رخ کیا جائے جہاں سے ان اوباشوں کی ٹولیاں قتل کرنے پہنچی ہیں۔ ان دونوں علاقوں کو قابو میں کر کے، یہاں طلحہؓ اور زبیرؓ کے ماننے والے بھی بکثرت ہیں، ان اوباشوں کے خلاف کارروائی آسان ہو گی۔ اس منصوبے کے ساتھ وہ تمام لوگ جو حضرت عثمانؓ کے حامی یا کم از کم قاتلوں کے مدینے پر قبضے سے ناخوش ہو کر نکل پڑے اور مکے پہنچ گئے تھے، ام المومنین حضرت عائشہؓ کی قیادت میں بصرے کے لیے روانہ ہو گئے۔

حضرت علیؓ اگرچہ خود بھی سمجھتے تھے کہ ان کے گرد و پیش بھاری تعداد میں قاتلان عثمانؓ ہیں مگر آپ کی حکمت عملی یہ تھی کہ اس وقت ان کی حمایت کو قبول کیا جائے کیونکہ ان کو کسی وقت بھی پر نافذ نہ ہو گا بلکہ خصوصاً حاکم شام جن کو آپ برطرف کرنا چاہتے تھے ان کے خلاف کارروائی میں آپ کو یہ لوگ سب سے زیادہ کارآمد بھی ہو سکتے تھے۔ اسی بنا پر آپ پہلی ترجیح کے طور پر حضرت معاویہؓ کے خلاف کارروائی کی تیاری کر رہے تھے کہ آپ کو حضرت عائشہؓ اور طلحہؓ و زبیرؓ کی قیادت میں بصرے کے لیے ایک لشکر کی روانگی کی خبر ملی۔

حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کی دعوت سے بظاہر یہ یقینی ہے کہ اس مہم کو حضرت علیؓ کے خلاف صرف قاتلین عثمانؓ کے علاوہ دوسرے معاملات بھی پیدا ہو گا۔ کیونکہ حضرت علیؓ کی بیعت کے سلسلے میں ان حضرات کے درمیان بدگمانی کے اسباب پیدا ہو گئے تھے بہرحال حضرت علیؓ نے فوری طور پر مدینے سے کوچ کر کے ان لوگوں کا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ مگر وقت گزر چکا تھا۔ اس لیے بصرے کی مہم بلا کاروائی بصرے پہنچ گئی۔ حضرت علیؓ بھی اپنی فوج کے ساتھ وہاں پہنچے اور پھر فریقین میں مذاکرات شروع ہوئے۔ جس کے نتیجے میں اس شرط پر صلح کی صورت بن گئی کہ حضرت علیؓ پہلے آپ کو قاتلین عثمانؓ سے آزاد اور بے تعلق کر لیں۔ ان لوگوں نے اس صلح کی شرط کو پایا۔ جس میں ان کی ہلاکت تھی۔ چنانچہ ان لوگوں نے مشاورت کر کے فوری یہ طے کیا کہ حضرت عائشہؓ کے لشکر پر شب خون مار کے جنگ کی آگ بھڑکا دی جائے اور اس میں یہ لوگ کامیاب ہو گئے۔ پھر جو جنگ بھڑکی تو اس وقت رکی جب حضرت علیؓ نے اس جنگ کے روکنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہ دیکھی کہ اونٹ کو نشانہ بنا لیا جائے اور وہ بیٹھنے پر مجبور ہو جائے چنانچہ یہی ہوا اور اسی پر جنگ ختم ہو گئی یہی یہ ایک وہ جنگ تھی۔ حضرت عائشہؓ بالکل سلامت رہیں اور پوری طرح باعزت سلوک کے ساتھ مکے کو روانہ کر دی گئیں حضرت طلحہؓ حضرت زبیرؓ نے البتہ شہادت پائی۔ اور سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ قاتلان عثمانؓ کے گروہ سے حضرت علیؓ کی آزادی اور بے تعلقی اب مشکل تر ہو گئی۔ اور اس کے نتیجے میں حضرت معاویہؓ کے ساتھ بھی کسی مصالحت کا امکان گویا بالکل ختم ہو گیا۔ کیونکہ اس میں ان قاتلوں کی موت یقینی تھی۔ جبکہ حضرت معاویہؓ ان کا بدلہ مانگ رہے تھے

جنگ جمل کے بعد حضرت علیؓ نے کوفہ کو اپنا دار الخلافہ قرار دے لیا اور یہاں سے پھر حضرت معاویہؓ کے ساتھ نامہ و پیام شروع کیا کہ وہ بیعت کر لیں اور اپنی معروضی قبولیت کی شرط یہ تھی کہ قاتلان عثمانؓ سے قصاص لیا جائے۔ ظاہر ہے کہ مرکز سے فوری قصاص ناممکن بات تھی۔ چنانچہ جنگ کی ٹھن گئی شام و عراق کے درمیان صفین کے مقام پر سنہ ۳۷ھ

میں طرفین کا آمنا سامنا ہوا اور تقریباً دو ماہ یہ جنگ چلی جس کا خاتمہ اس وقت ہوا جب حضرت معاویہ کے لشکر سے نیزوں پر قرآن اٹھا لئے گئے کہ قتل و قتال کی حد ہو گئی اب جنگ بند کرو اور قرآن کو حکم بنالو۔ اسی کو واقعہ تحکیم کہا جاتا ہے [illegible]

حضرت علیؓ کی شہادت

حضرت علیؓ نے تحکیم کی پیشکش پر جنگ اپنی مرضی کے خلاف بعض اہم ساتھیوں کے دباؤ پر بند کی تھی۔ ورنہ آپ اس پیشکش کو ایک جنگی چال سمجھتے تھے اور واقعی اس کو قبول کرنے سے آپ کے محاذ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ مزید ستم یہ تھا کہ آپ کی فوج کا ایک حلقہ اسی تحکیم کی بنا پر آپ سے ایسا برگشتہ ہوا کہ کافر قرار دے دیا اور آپ سے برسر جنگ ہو گیا۔ یہ وہ لوگ تھے جو تاریخ اسلام میں خارجی اور خوارج کہلائے۔ انہی میں کے ایک نے رمضان سنہ ۴۰ھ میں آپ کو شہید کر دیا۔[۱]

حضرت حسنؓ کی خلافت

آپ کی شہادت کے بعد ساتھیوں نے آپ کے بڑے صاحبزادے حضرت حسنؓ کو جانشین بنایا۔ حضرت حسنؓ نے باہمی خونریزی کا ماحول ختم کرنے کے لیے حضرت معاویہؓ کے حق میں دست برداری کا فیصلہ کیا۔ یہ ۴۱ھ کی بات ہے جبکہ آپ کی خلافت کو چھ مہینے ہوئے تھے۔ حضرت معاویہؓ نے اس کے لیے آپ کے منہ مانگے شرائط منظور کیے اور ربیع الاول سنہ ۴۱ھ میں یہ معاملہ دست برداری پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ اس طرح یہ پانچ سال کا تفرقہ ختم ہو کر اسلامی وحدت پھر سے بحال ہوئی۔ چنانچہ اس سال کو مسلمانوں

---

[۱] علامہ [illegible] لکھتے ہیں [illegible] حضرت [illegible] تحکیم کو قبول کر [illegible] [illegible] کہ آدمیوں کو حکم بنانا قرآن کے خلاف ہے

نے تمام اجماعات" اجتماعیت داہرین کے لیے مسلّم قرار دیا۔

عالی مقام بیٹا

حضرت حسنؓ کے بارے میں ایک ارشاد نبوی صحیح بخاری میں روایت ہوا ہے کہ آپ نے حضرت حسنؓ کی طرف اشارہ کر کے جبکہ وہ بچے ہی تھے فرمایا کہ

ان ابنی هذا سید ولعل الله	میرا یہ بیٹا سید (عالی مقام) ہے
ان یصلح به بین فئتین عظیمتین	امید ہے کہ اللہ اس کے ذریعہ مسلمانوں
من المسلمین[1]	کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرائے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد صحابہ کے بارے میں ہم لکھ چکے کہ انھوں نے جنگ جمل اور جنگ صفین جو حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد مسلمانوں نے آپس میں لڑیں سے اپنے آپ کو علیحدہ رکھا مثلاً حضرت سعد بن ابی وقاصؓ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ حضرت اسامہ بن زیدؓ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور ان کے ساتھ بہت سے حضرات اس اختلاف [illegible] کو فتنہ سمجھتے تھے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو بچایا جانا تھا طبری نے جلیل القدر تابعی امام شعبیؒ (م ۱۰۴ھ) سے روایت کی ہے کہ

بالله الذی لا اله الا هو ما نهض	قسم خدائے وحدہ لاشریک کی اس فتنہ
فی تلک الفتنة الا ستة بدریین	میں بدری صحابہ میں سے صرف چھ اٹھے
ما لهم سابع او سبعة ما لهم ثامن[2]	جن کا ساتواں نہ تھا یا سات جن کا کوئی
	آٹھواں نہ تھا اس قتال میں شریک ہوئے۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب الصلح باب [illegible] [2] طبری [illegible]

[illegible]

ہیں اور تاریخی تحقیق یہ بتاتی ہے کہ اتنے بھی شریک نہ تھے۔

حضرت حسنؓ کی عمر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں اگرچہ اتنی نہ تھی کہ وہ فتنہ کے متعلق آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ایسے ارشادات اور تنبیہات سے واقف ہو سکتے جیسے ارشادات حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ اور دوسرے متعدد صحابہؓ بزرگ کو اس موقع پر یاد آرہے تھے لیکن اس لیے وہ اپنے والد ماجد کے ساتھ جنگ جمل اور جنگ صفین دونوں میں اگرچہ شریک ہوئے مگر ان کی طبیعت جس سانچے میں ڈھلی تھی اس کے زیر اثر ان کی ابتدائی کوشش یہ رہی تھی کہ ان کے والد ماجد حضرت علیؓ جنگ سے گریز فرمائیں۔ طبری اور ابن اثیر دونوں میں ہے کہ حضرت معاویہؓ کی طرف سے جب یہ جواب آیا کہ قصاص عثمانؓ کا مطالبہ پورا ہونے سے پہلے حضرت علیؓ کی خلافت تسلیم کرنے والے نہیں ہیں اور حضرت علیؓ اس وقت تک مدینے ہی میں تھے تو اہل مدینہ کو فکر ہوئی کہ دیکھیے کہ اب علیؓ کا ارادہ کیا ہے؟ وہ معاویہؓ کے خلاف لشکر کشی کریں گے اور اس طرح اہل قبلہ کے خلاف تلوار اٹھائیں گے یا اس سے رک جائیں گے۔ اور تجسس حال کا اس لیے ہوا خاص کر انہیں پتہ چلا تھا کہ حسنؓ اپنے والد کو روکتے رہے ہیں کہ وہ کوئی اقدام

---

۱ مثلاً حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے کوفہ میں بیان کیا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ عنقریب ایک فتنہ آنے والا ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ یہی فتنہ ہے جس میں بیٹھنے والا کھڑے ہونے والے سے بہتر ہوگا اور کھڑا ہونے والا چلنے والے سے اور چلنے والا سوار سے بہتر ہوگا [illegible] (طبری [illegible])

ابن عمرؓ کا حال تو مشہور ہے [illegible] کی گفتگو میں ہے [illegible] حضرت علیؓ کی خلافت قبول کی مگر جنگ میں ان کا ساتھ قبول نہیں کیا۔

۲ [illegible] حضرت علیؓ [illegible] اسیر [illegible] جیسا [illegible] کوئی [illegible] بات [illegible] لیکن [illegible] آپ [illegible] دیکھ [illegible] سے [illegible] کرو [illegible] رہے تھے [illegible] کی [illegible] صورت ہے ھذا ھو۔

۳ اہل مدینہ کے [illegible] کے الفاظ طبری اور ابن اثیر میں [illegible] کے [illegible] فی قتال اهل القبلة: أجرأ عليه ام ينكل عنه؟ طبري ج ٥ ص ١٥٠.

ذکر کی۔ روایت یوں ہے :

وبعث معهم ابنه الحسن بن علي	اور انہیں کے ہمراہ بیٹا حسن بن علی
ومال الى القعود وترك	اپنے والد کو بیٹھ رہنے یعنی جنگ کو ترک کرنے کا
القتال [1]	مشورہ دیا۔ اور لوگ ساتھ ہو گئے ان کے علاوہ پیچھے

ابن کثیر نے اس موقع پر حضرت حسنؓ کے الفاظ بھی نقل کیے ہیں کہ ان الفاظ میں آپؓ نے اپنے والد ماجد کو کسی اقدام کے خلاف بتایا تھا۔

يا ابت دع هذا فان فيه سفك	ابا جان! یہ بات چھوڑیئے یہ ارادہ ترک کر دیجیے
دماء المسلمين ووقوع	کیونکہ اس میں مسلمانوں کی خونریزی
الاختلاف بينهم [2]	اور باہم اختلاف انگیزی ہے

ابن اثیر ہی میں ایک دوسری جگہ آتا ہے[3] (طبری اور البدایہ والنہایہ میں بھی یہی ہے) کہ اہل شام پر ابھی حضرت معاویہؓ کے خلاف فوج کشی کی تیاری ہو ہی رہی تھی کہ پتہ چلا مکہ سے حضرت عائشہؓ کی سرکردگی اور حضرت زبیرؓ و طلحہؓ کی رہنمائی میں ایک فوج حضرت علیؓ کے ساتھیوں کی طرف (جن میں قاتلان عثمانؓ اور ان کے ہمراہ شامل تھے) بے اطمینانی کے ماتحت بصرہ کی طرف روانہ ہو گئی ہے تاکہ ان کے خلاف کارروائی کر کے حضرت علیؓ کو ان کے چنگل سے نکالا جائے تو حضرت علیؓ نے بجائے شام جانے کے یکایک مدینے سے نکل کر ان لوگوں کو رستے میں روکنے کا قصد کیا۔ روایت سے ایسا لگتا ہے کہ حضرت حسنؓ ساتھ نہیں تھے لیکن بعد میں پہنچ کر ربذہ کے مقام پر آ گئے[4]۔ نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جیسے انہیں روکنے سے حضرت علیؓ رک گئے نہیں تو وہ خود ان کے ساتھ روانہ نہیں ہوئے مگر پھر کچھ خیال

---

[1] ابن اثیر ج ۳ ص [illegible]

[2] البدایہ والنہایہ ج ۷ ص ۲۳۵ مکتبۃ النصر ریاض

[3] کیونکہ ابن اثیر کی اصل طبری ہے اس لیے یہ تفصیل ان میں نہیں اسی طرح البدایہ والنہایہ کا اصل بھی یہی ہے

[4] مدینے سے عراق کے رستے میں ربذہ ایک مقام ہے

آیا اور بیچ سے چل کر بندہ پہنچے اور یہ گفتگو ہوئی جس کا تذکرہ ابن اثیر کی روایت میں ملتا ہے۔

وأتاه ابنه الحسن في الطريق	آپ کے بیٹے حسن راستے میں آپ کے پاس آئے
فقال له لقد امرتك فعصيتني فتقتل	اور کہا کہ میں نے کہا تھا مگر آپ نے
غدا بمضيعة لا ناصر لك	نہیں مانا نتیجہ یہ ہوگا کہ کل کو آپ بے یار
فقال له علي . وما الذي	و مددگار مارے جائیں گے حضرت علی
امرتني فعصيتك قال امرتك	نے کہا کہ تم نے مجھ سے کیا کہا تھا جو میں نے
يوم أحيط بعثمان ان تخرج	نہیں مانا؟ کہا کہ جس دن عثمان محصور کیے
من المدينة فيقتل ولست	گئے میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ مدینہ سے
بها ثم امرتك يوم قُتل ان لا	باہر چلے جائیں تاکہ آپ کی موجودگی میں وہ
تبايع حتى تأتيك وفود العرب	نہ مارے جائیں جب عثمان قتل کر دیے گئے تو آپ سے
وبيعة اهل كل مصر فانهم لن	میں نے کہا کہ آپ بیعت نہ لیجئے جب تک کہ
يقطعوا امرا دونك فأبيت علي	تمام عرب کے وفود آپ کے پاس نہ آئیں اور ہر شہر
وامرتك حين خرجت هذه	کے لوگوں کی بیعت آپ تک نہ آ جائے کیونکہ
المرأة وهذان الرجلان ان	یہ لوگ آپ کے سوا کسی کو منتخب کر ہی نہیں
تجلس في بيتك حتى يصطلحوا	سکتے۔ آپ نے یہ بات بھی نہیں مانی اور پھر
فان كان الفساد كان على يدي	جب عائشہ اور طلحہ نکلے تو میں نے کہا کہ آپ
غيرك فعصيتني في ذلك	گھر بیٹھے رہیں تا آنکہ مصالحت ہو جائے
كله .[1]	اگر فساد ہو تو وہ آپ کے سوا دوسرے
	کے ہاتھ سے ہو مگر آپ نے کسی بات کو بھی نہیں مانا۔

حضرت علی کی رائے میں چونکہ حضرت حسن کا مشورہ صحیح نہ تھا اس لیے انھوں نے جواب دیا

---

[1] ابن اثیر ج ۳ ص ۱۱۲

کو صحیح سمجھا اس پر عمل فرمایا۔ اور پانچ سالہ جنگ اور خونریزی کا ایک طویل سلسلہ چلا جس میں حضرت حسنؓ بھی والد محترم کے دوش بدوش شامل رہے مگر جب سنہ ۴۰ھ میں ایک خارجی کے ہاتھ سے حضرت علیؓ کی شہادت کا سانحہ پیش آیا اور آپ کی جانشینی کا بار حضرت حسنؓ کے کاندھوں پر رکھ دیا گیا تو اس وقت یہ حقیقت بالکل آئینہ ہو چکی تھی کہ اس اختلاف سے مسلمانوں کا بے حد نقصان ہو چکا تھا اور اب بھلائی اسی میں تھی کہ یہ باب بند کر دیا جائے۔ حضرت علیؓ کے حامیوں میں انتشار عدم وفاداری اور شکست خوردگی کا احساس بھی پایا جاتا تھا اس لیے گروہی نقطۂ نظر سے بھی بہتری اور مصالحت ہی میں تھی۔ چنانچہ حضرت حسنؓ کے حصہ میں یہ سعادت آئی کہ ان کی پیش قدمی کی بدولت مسلمانوں کا پانچ سالہ افتراق ختم ہوا اور وہ پھر سے ایک جماعت بن گئے اور اس طرح وہ پیشگوئی بھی پوری ہوئی جو بخاری کی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے لیے فرمائی تھی کہ میرا یہ بیٹا بڑا عالی مقام ہوگا اس کے ذریعہ مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں کا افتراق مٹے گا۔

اتحاد و یکجہتی کے بیس سال

حضرت معاویہؓ اور حضرت علیؓ کے اختلافات کی بدولت حضرت معاویہؓ کے بارے میں کسی کی کچھ بھی رائے ہو مگر ایک بات سے انکار کسی انصاف پسند کے لیے ممکن نہیں ہے کہ ان کے اندر عرب سرداری کی اعلیٰ ترین خصوصیات تھیں۔ ایک طرف وہ پرانے عرب دنیا کے پانچ [illegible] اور دیدہ ور، دہات عرب میں سے ایک مانے جاتے تھے اور انھوں نے ثابت کر دیا کہ ان پانچ میں وہ سب سے بڑھ کر تھے[1] دوسری طرف سخاوت اور حلم کے بادشاہ تھے داد و دہش میں ہاتھ ہمیشہ کھلا تھا اور بردباری کی انتہا نہیں تھی۔ چنانچہ حضرت معاویہؓ کی ان صفات

---

[1] باقی چار کے نام یہ ہیں: حضرت عمرو بن العاص، مغیرہ بن شعبہ، قیس بن سعد اور عبداللہ بن بدیل۔ ان میں سے پہلے دو حضرت معاویہؓ کے ساتھ تھے اور آخری دو حضرت علیؓ کے ساتھ۔ طبری ج ۳ [illegible]

تفرقہ کی خلیجوں کو پاٹ دیا اور اس عرصے کی تلخ یادوں کو بھلانے میں جو اہم کردار ادا کیا ان کا بیس سالہ دور حکومت (سنہ ۴۱ھ تا سنہ ۶۰ھ) بالعموم امن و عافیت اور مسلمانوں کی یکجہتی کے ساتھ گزرا اور مسلمان آپس کی جنگ سے چھٹی پا کر ان ہی دوسروں کی طرف واپس چلے گئے جہاں وہ دشمنان اسلام کے خلاف مصروف جنگ ہوتے اور نئی فتوحات حاصل کرتے تھے۔ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں آپ کے خلافت پر متمکن ہونے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:-

> "خلافت علیؓ اور خلافت عثمانؓ میں معاویہؓ کے ہاتھوں شامی محاذ پر جو مسلسل فتوحات کا جو شاندار سلسلہ چل رہا تھا وہ اس وقت بالکل رک گیا جب ان کے اور علیؓ کے درمیان معرکوں کا دور چلا۔ ان دونوں میں سے ان کے ہاتھ پر کوئی ملک فتح ہوا نہ ان کے ہاتھ پر۔ حتی کہ حسنؓ کے ساتھ صلح ہوئی اور معاویہؓ کی خلافت پر جیسا کہ گزر چکا ہے سنہ ۴۱ھ میں، پوری اسلامی دنیا نے اتفاق کر لیا۔ اس وقت سے لے کر ان کی وفات (سنہ ۶۰ھ) تک جہاد نے زور پکڑا رہا۔ دشمنوں کے ساتھ کفر کی سرزمین پر جہاد ہوتا رہا، حق کا پرچم سربلند رہا۔ ہر طرف سے مال غنیمت آتا رہا اور مسلمان ان کے ساتھ آرام، انصاف اور عفو و درگزر کی فضا میں رہتے رہے ہیں"[1]

حضرت معاویہؓ اور حضرات حسنینؓ

شیعہ علماء و مصنفین پر افسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے حب علیؓ کے نام پر معاویہؓ دشمنی میں حضرت معاویہؓ کی اسلامی خدمات، حلم، سخاوت، شجاعت اور ان جیسی تاریخی حقائق کو جھٹلانے کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔ یہاں تک کہہ دیا کہ انہوں نے تو وہ وعدے بھی پورے نہیں کیے جو حضرت حسنؓ کے ساتھ شرائط صلح کے طور پر طے ہوئے تھے حالانکہ ان کا سارا عرصہ

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۲۹

حسن ظن ہی نہیں حضرت حسینؓ کے ساتھ بھی اس حد تک حسنِ سلوک اور رواداری کا تصور اہلِ مذہب کے صمیمِ تدبر اور کرم النفسی کے بغیر اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے لیے خود انہی حضرات کی کتابوں میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ ایک مرتبہ یمن سے دمشق کو ایک سرکاری قافلہ بہت سا قیمتی سامان مثلاً یمنی چادریں، عنبر اور دیگر خوشبویات لے کر حسبِ معمول مدینے سے گزر رہا تھا حضرت حسینؓ نے روک کر اس کا تمام مال اتروا لیا اور حضرت معاویہؓ کو خط لکھ کر بھیج دیا کہ "ایسا ایسا قافلہ جو دمشق میں تمہارے خزانے بھرنے اور تمہارے باپ کی اولاد کا سامان مہیا کرنے کے لیے جا رہا تھا میں نے اسے روک کر اس کا مال لے لیا ہے کیونکہ مجھے ضرورت تھی"[1]۔ ہم یقین نہیں کر سکتے کہ حضرت حسینؓ نے ایسی نامناسب زبان اپنے خط میں استعمال فرمائی ہوگی۔ گمان غالب ہے کہ خط کی یہ زبان ان حضرات کی عطا کردہ ہے جو اس بات کے روادار نہیں کہ حضرت حسینؓ کو حضرت معاویہؓ کے ساتھ اس سے بہتر زبان میں مخاطب ہوتا ہوا دیکھیں۔ بہرحال ان حضرات کی روایت کے مطابق یہ خط حضرت حسینؓ نے حضرت معاویہؓ کو لکھا۔ اب دیکھئے کہ اس کا کیا اور کس انداز کا جواب حضرت معاویہؓ نے انہی حضرات کی روایت کے مطابق دیا۔

> "اللہ کے بندے معاویہ کی طرف سے حسین بن علی کے نام۔ تمہارا خط ملا جس میں تم نے لکھا ہے کہ میرے پاس سے آنے والا قافلہ روک کر اس کا سامان تم نے لے لیا ہے لیکن تمہیں یہ چاہیے نہیں تھا بلکہ وہ میرے نام سے آ رہا تھا کیونکہ جو حق صاحبِ حکومت

---

[1] حیات الامام حسین بن علیؓ۔ از باقر شریف القرشی۔ مطبوعہ مؤسسۃ الوفاء بیروت ج ۲ ص ۲۳۲۔ نیز مقتل الحسینؑ از عبدالرزاق الموسوی المقرم، مطبوعہ دارالکتب الاسلامی بیروت حاشیہ ص ۱۴۲ بحوالہ شرح نہج البلاغہ از ابن ابی الحدید ج ۴ ص ۳۲۷ بہتر ہے اصل خط کے عربی الفاظ کو بھی یہاں پڑھ لیجئے۔

من الحسين بن علي الى معاوية بن ابي سفيان اما بعد فان عيرا مرت بنا من اليمن تحمل مالا وحللا وعنبرا وطيبا اليك لتودعها خزائن دمشق وتعل بها بعد النهل بني ابيك واني احتجت اليها فاخذتها والسلام۔

دوں گا جو کچھ مال اس کے ہاتھ میں ہو وہ بھی تم ہی کو اسکو تقسیم کرسکے انشاءاللہ مجھے
اگر تم اسکو میرے پاس رہنے دیتے تو میں تمہارا حق دینے میں کوتاہی نہ
کرتا لیکن بھتیجے . اب یہ چیز تمہارے ہاتھ میں ہے کاش کہ میں
ہی زمانے تک رہوں کہ میں تمہاری قدر و قیمت جانتا ہوں اور ایسی باتوں سے
درگذر کروں جیسا کہ تم چاہو اور میں تمہارا ولی اور کسی سبب سے بڑھ جائے
تو تمہیں کوئی شکایت نہ رہے کہ زیادہ دور ہو۔ [1]

اس چھوٹی سی خط و کتابت سے کیا کیا باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ اس وقت ہمارے معاملہ کا موضوع نہیں صرف اتنی بات یہاں کہنا مقصود ہے کہ حضرت معاویہؓ کا یہ جواب دیکھ کر کسی بدون انصاف پسند کے لیے شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ وہ حضرت حسینؓ کے ساتھ بجز لحاظ اللہ کریم النفسی کے سوا کوئی دوسرا معاملہ کرتے ہوں گے چہ جائیکہ وہ عہد کی پابندی نہ کریں جب کہ حضرت حسنؓ نے خلافت کی جنگ سے دستبرداری کی تھی۔ [2]

یہ دعویٰ [illegible] کہ حضرت معاویہؓ پر بدعہدی کا الزام ہو تو شیعہ حضرات کے یہاں عام ہے لیکن بہت تعجب اس وقت ہوا جب اس مضمون کی تیاری کے سلسلے میں ہم کو

---

[1] [illegible]۔ [2] حضرت حسینؓ اور حضرت معاویہؓ کی یہ خط و کتابت اور صلح اقدام کے سلسلے میں خط و کتابت [illegible] سب کچھ شیعہ کتب کی روایت سے درج کی گیا ہے [illegible] کے بیان سے الکافی [illegible] ثابت ہو جاتا کہ حضرت حسن حسین کے ساتھ [illegible] مروی روایت [illegible] کوئی معقول آدمی نہیں ہو سکتا مگر [illegible] کتاب کا [illegible] ہو [illegible] سے [illegible] ہے کہ [illegible] حسینؓ کو [illegible] ایسے لوگوں کو جواب کہاں دیا جا سکتا ہے [illegible] کے لیے کیا ہو سکتا ہے۔

شیعہ عالم جناب سید علی نقی (المعروف بہ نقن صاحب) کی تصنیف "شہید انسانیت"[1] دیکھتے ہوئے اس دعوے کی دلیل میں تاریخ طبری کا حوالہ نظر سے گزرا، یہ حوالہ جز ۶ صفحہ ۹۳ کا ہے۔ طبری کے اس مقام پر واقعتہً یہ الفاظ پائے جاتے ہیں کہ "فلم یف لہ معاویۃ بشیء مما اشترط فیہ" جس کا ترجمہ اگر کوئی چاہے تو بے شک ان الفاظ میں کرسکتا ہے کہ جتنی شرطیں کی گئی تھیں ان میں سے کوئی ایک بھی معاویہ نے پوری نہیں کی۔ لیکن علامہ نے یہ نہ سوچا کہ وہ طبری کے اس جملہ کا حوالہ اس مقصد کے لیے دیں کیونکہ اسی تاریخ طبری میں ایک صفحہ پہلے ص ۹۲ پر گزر چکا ہے کہ

وقد صالح الحسن معاویۃ علی	حضرت حسنؓ نے معاویہؓ سے صلح اس شرط پر
ان یجعل لہ ما فی بیت مالہ	کی تھی کہ کوفے کے بیت المال میں جو
وخراج دارابجرد علی ان لا	کچھ ہے وہ ان کا ہوگا، دارابجرد[2] کا
یشتم علیٌّ وھو یسمع فاخذ ما	خراج ان کو ملا کرے گا اور ان کے سامنے
فی بیت مالہ بالکوفۃ وکان فیہ	حضرت علیؓ پر سب و شتم نہیں ہوا کرے گا۔ چنانچہ
خمسۃ آلاف الف۔	انھوں نے وہ مال لے لیا جو کوفے کے بیت المال
	میں تھا اور وہ پچاس لاکھ درہم تھا۔

اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ کوئی ایک شرط بھی پوری نہیں کی گئی۔

ایک صفحہ آگے چل کر یعنی ص ۹۳ پر طبری نے جن شرائط کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ پوری نہیں کی گئیں، ان کا قصہ دوسرا تھا۔ وہ قصہ طبری ہی کے بیان کے مطابق یہ تھا کہ شرائط جن کا بیان آیا، یہ تو وہ تھیں جو حضرت حسنؓ نے حضرت معاویہؓ سے صلح کی خواہش کرتے ہوئے ان کو تحریر کی تھیں۔ ادھر حضرت معاویہؓ خود یہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کا ایک کر دیا

---

[1] شہید انسانیت ص ۲۴۴-۲۴۳ . مطبوعہ اکادمی لکھنؤ۔ [2] شہر کا نام ہے جو ایران میں ہے معجم البلدان کی الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی میں اس کا اصل نام داراب گرد ہے۔

کشت وخون کا سلسلہ چلتا رہے چنانچہ قبل اس کے کہ حضرت حسنؓ کا پہلا سلام ان تک پہنچے انہوں نے خود دو آدمی ایک سادہ کاغذ پر دستخط کر کے اس پیغام کے ساتھ بھیجے تھے کہ حسنؓ جو شرائط صلح چاہیں اس کاغذ پر لکھ دیں مجھے منظور ہیں۔ چنانچہ حضرت حسنؓ نے اس کاغذ پر کچھ شرائط بھی لکھ کر دیئے تھے وہ شرائط کیا تھے اس بارے میں طبری کی ۹۳ کی روایت بتا رہی ہے کہ

فاختلفا فی ذلک فلم ینفذ	ان شرائط کے بارے میں اختلاف ہوا
للحسن علیہ السلام شیٔ	اور ان میں سے کوئی شرط معاویہؓ نے حسنؓ کی پوری نہیں کی

علامہ نقی صاحب نے اس بارے واقعہ کو قلم انداز کر دیا ہے اور افسوس ہے کہ یہی ایک جگہ نہیں اور بھی بہت سی جگہوں پر موصوف نے اسی طرح کا معاملہ شیعہ مزعومات کو نباہنے کیلئے اپنی اس تصنیف میں کیا ہے جن میں سے بعض کا ذکر اپنے موقع پر آئے گا

بہرحال شرائط صلح پر بحث نہ کئے جانے کی بات بڑی زیادتی ہے ایک شرط کے بالکل نفاذ نہ ہونا کا ذکر تو طبری کی مذکورہ بالا روایت میں آ گیا ہے دوسری شرط دارابجرد کا خراج اس کے بارے میں طبری کے اندر کوئی مزید روایت نہیں ملتی۔ لیکن دوسرے ذرائع مثلاً ابن اثیر کی تاریخ کامل اور ابن کثیر کی البدایہ والنہایہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دارابجرد کا تعلق بصرہ کی ولایت سے تھا اس کے خراج والی شرط پر بصرہ کے لوگ معترض ہوئے کہ یہ خراج تو ہمارا حق ہے یہ کسی اور کو نہیں دیا جانا چاہیے۔ ابن اثیر نے بس اتنی ہی بات بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے لیکن ابن کثیر نے لکھا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے اس کے بدلے میں ان کو سالانہ دس ہزار کے بدلے میں ایک ہزار دینار منظور کیے جو حضرت حسنؓ اپنے حین حیات دمشق کے سالانہ صلہ میں علاوہ دیگر عطیات و تحائف کے بلاناغہ پاتے رہے۔[1]

---

[1] فعوضہ معاویۃ عن کل سنۃ الف الف درہم فی کل عام مع ماله فی کل زیارۃ من الہدایا والتحف الی ان توفی۔ البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۶۔

رہی تیسری شرط کہ کم از کم حضرت حسنؓ کی موجودگی میں حضرت علیؓ پر سب و شتم نہ کیا جائے اس کے بارے میں ابن اثیر کا بیان ہے کہ یہ شرط پوری نہیں کی گئی۔[1] اور تنہا یہی ایک بیان یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ ابن اثیر بھی ان ہی مورخین میں سے ہیں جن پر حضرات حسن و حسین رضی اللہ عنہم اور حضرت معاویہؓ و یزید کے درمیان والے معاملات میں آنکھ بند کر کے اعتبار نہیں کیا جانا چاہیے۔ کیونکہ یہ بیان اگر صداقت پر محمول کر لیا جائے تو ہمیں یہ ماننے کے لیے تیار ہونا پڑے گا کہ (معاذ اللہ) حضرت حسنؓ کو غیرت و حمیت کی کوئی ادنیٰ مقدار بھی دربارِ حق تعالیٰ سے عطا نہیں ہوئی تھی۔ ان کے والد ماجد کو حضرت معاویہؓ اور ان کے لوگ منبر پر برا بھلا کہتے تھے اور حضرت حسنؓ اس کے باوجود کبھی ایک حرف شکایت بھی منہ پر نہ لاتے بلکہ ہر سال دمشق جا کر مقررہ وظائف و تحائف بھی حضرت معاویہؓ کے ہاتھ سے وصول کیا کرتے تھے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایسی نامناسب بات جو شرائطِ صلح کے بھی خلاف تھی، حضرت معاویہؓ اور ان کے حکام کے طرزِ عمل میں شامل رہے اور حضرت حسنؓ ۹-۱۰ سال تک اسے خاموشی سے برداشت بھی کرتے رہیں بلکہ حضرت معاویہؓ کی خدمت میں سال در سال حاضری بھی دیتے رہیں اور ان سے تحائف و وظائف لیا کرتے رہیں۔؟

ابن اثیر ہی نے دارابجرد کے خراج کے سلسلے میں اہلِ بصرہ کے اعتراض کی بات بھی لکھی ہے کہ اس میں خود حضرت معاویہؓ کا اشارہ بھی شامل تھا مگر اس کا کوئی ثبوت؟ ثبوت ہے نہ حوالہ۔ حالانکہ اگر اس بیان میں کچھ واقعیت ہوتی تو یہ ممکن تھا حضرت حسنؓ کو مصالحت کے وقت سے لیکر اپنی وفات تک (۹-۱۰ سال کے عرصے میں)[2] اس کا پتہ چلتا، جبکہ بصرہ بھی کوفے کی طرح آپ کی اور آپ کے والد ماجد کی عملداری کا حصہ رہا تھا۔ اس لئے یہ بات قابلِ تعجب ہے کہ سب کچھ جانتے ہوئے "پانچ ہزار سالانہ" کی جگہ ایک ہزار سالانہ پر خاموشی سے راضی رہتے ——— اور حضرت حسینؓ کے بارے میں اگر کسی

---

[1] ص ۲۰۳ [illegible] الکامل ابن اثیرؒ [illegible]۔ [2] صلح ۴۱ھ میں ہوئی اور حضرت حسنؓ کی وفات ۵۰ھ میں۔

طبرسی کی نزہ ولایت وغیرہ کے حوالے سے تحریر فرمائی ہے کی یہ سب بیشتر جعلی اور بے خلاف عقلیات قابل قبول بھی مان لی جائیں تو حضرت حسینؓ کے بارے میں تو یہ قطعی طور پر ناقابل قبول ہے ـــ ان کا مزاج بالکل مختلف تھا وہ سرے سے صلح کے ہی روادار نہ تھے۔ بس حضرت حسنؓ کے فیصلے سے مجبور ہو گئے تھے ابن کثیر نے لکھا ہے کہ

> "جب خلافت حضرت حسنؓ کے ہاتھ میں آئی تھی اور انہوں نے مصالحت کا فیصلہ کیا تو حضرت حسینؓ کو یہ فیصلہ بہت شاق گزرا۔ وہ اپنے بھائی کی رائے کو بالکل صحیح نہیں سمجھتے تھے اور مصر تھے کہ اہل شام سے قتال جاری رہے (ان کا اصرار اور ضد کی حالت یہاں تک تھی کہ حضرت حسنؓ کو کہنا پڑا کہ میں سوچتا ہوں کہ تمہیں گھر میں بند کر دوں اور جب تک مصالحت کی کارروائی پوری طرح ختم نہ ہو جائے باہر نہ نکالوں۔[1]

ایک روایت میں اس اختلاف رائے کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت حسینؓ نے صلح کی بات سن کر حضرت حسنؓ سے کہا کہ میں آپ کو قسم دیتا ہوں کہ اپنے باپ کو جھوٹا اور معاویہ کو سچا مت ٹھہرائیے۔ اس پر حضرت حسنؓ نے یہ کہہ کر ان کو خاموش کیا کہ میں تم سے زیادہ جانتا ہوں۔[2]

الغرض حضرت حسینؓ کا مزاج بالکل مختلف تھا ان کے لیے کسی بھی طرح نہیں سوچا جا سکتا کہ وہ ایسے حالات اور معاملات کے ہوتے ہوئے حضرت معاویہؓ کے ساتھ اپنے تعلقات رکھنا گوارا کر سکتے تھے۔ حالانکہ اسی البدایہ والنہایہ میں مذکورہ بالا بیان کے بعد مذکور ہے کہ:-

> "حسن کا یہ رویہ دیکھ کر حسین نے خاموشی اور مصلحت اختیار کی اور پھر جب خلافت کی باگ ڈور پوری طرح معاویہ کے ہاتھ میں آ گئی تو اپنے بھائی حسن کے ساتھ ان

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۶۳ [2] ابن اثیر ج ۳ ص ۲۰۳۔

بھی معاویہ کے پاس آتے جاتے تھے اور معاویہ دونوں کا غیر معمولی اکرام فرماتے تھے مرحبا و اہلاً سے استقبال کرتے اور بیش قیمت عطیات دیتے۔ [1]

حتی کہ حضرت حسن کا انتقال ۵۰ھ میں ہو گیا تب بھی حضرت حسین نے حضرت معاویہ کے پاس سالانہ تشریف بری کا معمول حسب سابق ہی قائم رکھا [2]

الغرض حضرت معاویہ اور حضرات حسنین کے درمیان جو حسن تعلق کی صورت اور بالخصوص حضرت معاویہ کی طرف سے اکرام و عطا کی جو مد ان کی خلافت کے پورے عرصے میں برقرار رہی وہ نہ صرف اس الزام کی قطعی تردید کرتی ہے کہ حضرت معاویہ نے شرائط صلح کا احترام نہیں کیا تھا بلکہ ان بیانات کے لیے ایک تصدیق بھی فراہم کرتی ہے جو حضرت معاویہؓ کے علم و عفو اور داد و دہش کے غیر معمولی احسانات کے سلسلے میں مؤرخین کے یہاں ملتے ہیں۔ [3]

* * *

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۵۰۔ [2] مولانا تقی الحسن کا مضمون بعنوان علی و معاویہؓ [illegible] وغیرہ بحوالہ سابق۔ [3] خلافت حضرت علیؓ کے دست راست حضرت عبداللہ بن عباس کا قول ہے جو طبری نے نقل کیا ہے کہ "میں نے حکومت کے لیے معاویہؓ سے زیادہ موزوں آدمی نہیں دیکھا کہ لوگ ان کے سامنے گویا کشادہ وادی کا چکر لگاتے تھے" (طبری ج ۶ ص ۱۸۶) یا اور حضرت معاویہؓ کا اپنا یہ بیان جو ان کے علم و حلم کا ایک آئینہ دار ہے [illegible] "جہاں میرا کوڑا کام دے جائے وہاں تلوار نہیں رکھتا اور جہاں میری زبان کام دے جائے وہاں کوڑا نہیں رکھتا [illegible] اور اگر میرے اور لوگوں کے درمیان بال کے برابر بھی تعلق ہو تو [illegible] ٹوٹنے نہیں دیتا۔" (وفیات ملتان) ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ ج ۸ میں بہت ایسے صفحے ۱۲۶ تا ۱۴۰ پر حضرت معاویہؓ کے انہی احسانات کی تفصیلات اور واقعات نقل کیے ہیں اور اپنے طور پر ان کا خلاصہ میں ان کی نشاندہی کی ہے کہ "معاویہ کان جمیل السیرۃ حسن التجاوز جمیل العفو کثیر الستر رحمہ اللہ" مختصر یہ کہ وہ بہترین سیرت کے مالک، نہایت اچھی عفو و درگزر کرنے والے اور عیب کی بہت زیادہ پردہ داری کرنے والے تھے۔ (ج ۸ ص ۱۲۶)

بابُ دوُم

کوفی مزاج ـــ ریشہ دوانیاں ـــ اور حضرت حسینؓ

حضرت معاویہؓ کے بارے میں یہ تھوڑی سی گفتگو بالکل ضمناً آگئی ورنہ اصل مقصد تو ان حالات اور اسباب کی تحقیق تھی جن کے نتیجے میں حضرت معاویہؓ کا بیس سالہ پُرامن و پُرسکون دور ختم ہوتے ہی واقعہ کربلا جیسا سانحہ وجود میں آگیا۔ اسی تحقیق کے سلسلے میں اہل کوفہ کے مزاج و کردار کی خصوصیات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔

اہل کوفہ

کوفہ کی بنیاد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے ہاتھوں سے پڑی تھی جو کسریٰ (ایران) کی حکومت کے خلاف اسلامی جہاد کے کمانڈر تھے۔ وہ مختلف عرب قبائل جو عراق کے محاذ پر مصروف جہاد تھے انہی کے ناموں سے یہ نیا شہر آباد کیا گیا۔ اور اس طرح یہ مسلمانوں کی سب سے بڑی جہادی اور ان کی جنگی طاقت کا مرکز بن گیا۔ لیکن اس خصوصیت کے ساتھ اس شہر کی یہ خصوصیت بھی رہی کہ [illegible] کے شہروں میں بڑی تلون مزاجی اور بے صبرے پن کی سی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اپنے حکام سے بہت جلد ناراض ہو جاتے اور ان کی شکایتیں کرکے

نئے حاکم کا مطالبہ کرنے لگتے تھے۔ یہ حال حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے پورے زمانے میں رہا۔ بلکہ عثمانی خلافت کے آخری دور میں تو ان کا مرض بڑھ کر اپنی کھلی سرکشی اور شوریدہ سری تک پہنچا کر حضرت عثمانؓ کی خلافت ہی نہیں ان کی جان بھی اسی کی بھینٹ چڑھ گئی۔ وہ اپنے ہی تھے جیسے مصری اور بصری مفسدوں کے ساتھ مل کر ان لوگوں نے مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم میں خوف و دہشت کی وہ فضا قائم کی کہ خلیفۃ الرسول کی تدفین بھی مشکل تھی۔ تیسرے دن بعد وفات کے اندھیرے میں مسلمانوں کے عام قبرستان جنت البقیع سے الگ ایک احاطے میں کی جا سکی۔ جسے بعد ازیں جنت البقیع سے ملا دیا گیا۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت سے دو سال پہلے کے واقعات میں تاریخ بھی کوفیوں کا نام لے کر بتاتی ہے کہ انہوں نے حکام کے خلاف شکایتوں کے اظہار سے بڑھ کر خود ادارۂ خلافت کو قریشی سلطنت کا نام دینا شروع کر دیا۔ امیر کوفہ سعید بن العاص نے اس فتنہ پردازی کے خلاف کارروائی کی اجازت یا جو کچھ وہ مناسب سمجھا جائے اس کی ہدایت مانگی۔ حضرت عثمانؓ نے مناسب سمجھا کہ ان کو شہر بدر کر کے حضرت معاویہؓ کے پاس دمشق بھیج دیا جائے کہ شاید وہ ان کا کچھ علاج کر سکیں گے۔ مگر ان کے مرض کے مقابلہ میں حضرت معاویہؓ کی حکمت اور فہامت بھی کام نہ آ سکی۔ تب یہ لوگ حمص میں جہاں عبدالرحمٰن بن خالدؓ بن ولید امیر تھے، بھیجے گئے انہوں نے ان کے طریقۂ علاج رکھی ہے بظاہر یہ لوگ ٹھیک طور تائب ہو گئے مگر واقعہ میں ایسا نہیں تھا چنانچہ جیسے ہی کوفے میں پہنچے وہ لوگ اپنی وہی صدا بلند کرنے لگے جو پہلے آتے تھے فوراً ہی شہدار ہو گئے اور جب مصر اور بصرے سے بالکل اسی طرح سے مرکزی حکومت کے خلاف شکایتیں یا بغاوت کرنے لگے یعنی ابن سبا کی سازشی تحریک کے زیر اثر ایک رابطے میں مربوط ہو گئے تب رجب ۳۵ھ میں حج کے سفر کا ڈھونگ رچا کر یہ

پھر جا پہنچے اور ۱۸ ذی الحجہ کو حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا۔ دو ہزار کے قریب ان سب کی تعداد بتائی گئی ہے[1] یہ سب بجز چند کے حضرت علیؓ کا دم بھرتے تھے چنانچہ بعد میں حضرت علیؓ کی بیعت بھی کی اور پھر جنگ جمل اور جنگ صفین میں آپ کے ساتھ نکلے اور جب جنگ جمل سے پہلے فریقین کی نیک نیتی کی بنا پر صلح کی شکل پیدا ہو گئی تو سبائیوں نے اس صلح کو تباہ کرنے کی جو کوشش کی جس کا ذکر گذشتہ باب میں آچکا ہے[2] تاریخ کے بیان کے مطابق اس میں شب خون مارنے کا اصل کردار کوفیوں ہی نے ادا کیا ملاحظہ ہو ابن اثیر اور طبری انہی کی بدولت صفین میں حضرت علیؓ جنگ بند کرنے پر مجبور ہوئے اور جنگ کے بعد آپ کا جو وقت ایسا گذرا کہا جا سکتا ہے آپ نے باقی وقت ان کے ساتھ رو رو کر پورا کیا۔ آپ کے اس دور کے خطبوں میں بار بار ایسے جملے ملتے ہیں کہ سب سے بڑا دھوکہ کھانے والا وہ ہے جو تمہارے دھوکہ میں آیا[3]

ایک خطبہ میں ہے۔

ایتها الفرقة التی اذا امرت	اے وہ گروہ کہ جب بھی میں نے کسی بات
لم تطع واذا دعوت لم تجب	کا حکم دیا اسے قبول نہ کیا اور جب
ان امهلتم خضتم وان حوربتم	کسی کام کی طرف بلایا لبیک نہ کہی اگر
خرتم وان اجتمع الناس علی	مہلت مل جاتی ہو تو فضولیات میں لگ
امام طعنتم	جاتے ہو اور جب دشمن حملہ آور ہو تو
لا ابا لغیرکم	بزدلی دکھاتے ہو اور جب لوگ کسی
	امام پر جمع ہو جائیں تو تم کیڑے نکالتے
	ہو ۔۔۔ ارے افسوس تم پر۔

---

[1] مزید تفصیل کے لیے دیکھیے تاریخ ابن خیر اور تاریخ طبری۔ [2] نہج البلاغہ ج ۱ ص ۷۰ دار المعرفہ [3] ایضاً ج ۱ ص ۲۵ نہج البلاغہ ایسے ارشادات سے بھری ہوئی ہے مگر کہا جاتا ہے تو جلد اول ہی کا ساٹھواں خطبہ دیکھیے

یہی ڈر تھا کہ حضرت علیؓ کی طرح کہیں جنگ سے بھی جی چرانے اور آپ کے احکام سے سرتابی کرتے رہے اور جب حضرت حسنؓ نے مصالحت کی تو ان کے خیمے پر حملہ کر دیا۔ سامان بھی لوٹا اور زخم بھی لگایا۔[1] ظاہر ہے کہ ان لوگوں کا حضرت معاویہؓ کے ساتھ جیسے گزارا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ حضرت معاویہؓ کے علم تھا کہ کہیں جواب دیا تو یہ کوفے والوں ہی کے ساتھ ہوا۔

الغرض اس امن و امان اور اسلامی جمعیت کی بحالی کے دور میں اگر کہیں سے کچھ خلفشار پیدا کرنے کی خواہش اور جستجو ہوتی رہی تو وہ کوفہ ہی کی سرزمین سے تھی۔ حضرت حسینؓ کے متعلق ان لوگوں کو معلوم تھا کہ مصالحت سے وہ خوش نہ تھے مگر حضرت حسنؓ کے بارے مجبور ہو گئے تھے جیسا کہ اس سلسلے میں اوپر تاریخی بیان گزر چکا ہے۔ حضرت حسنؓ کی وفات کے بعد ان لوگوں نے سمجھا کہ اب حضرت حسینؓ کو آمادہ جنگ کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ چنانچہ البدایہ والنہایہ کی روایت کے مطابق :-

وقدم المسیب بن عتبة	مسیّب بن عتبہ فزاری حضرت حسنؓ
الفزاری فی عدۃ معہ	کی وفات کے بعد کئی اور آدمیوں
الی الحسین بعد وفاۃ الحسن	کے حضرت حسینؓ کے پاس آیا اور ان
فدعوہ الی خلع معاویۃ۔[2]	لوگوں نے آپ کو حضرت معاویہؓ کی بیعت
	توڑنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔

پھر یزید کے لیے ولی عہدی کی بیعت کا مسئلہ کھڑا ہوا تب ان لوگوں نے دوسری بار کوشش کی۔

فلما بایع الناس معاویة	جب لوگوں نے عام طور پر یزید کیلئے
لیزید کان حسین ممن لم	معاویہؓ سے بیعت کر لی تو حضرت حسینؓ

---

[1] طبری ج ۶ ص ۹۲ ابن اثیر ج ۳ ص ۲۰۳

[2] ج ۸ ص ۱۶۱۔

يبايع له، وكان اهل الكوفة	ان لوگوں نے یزید سے بیعت نہیں کی
يكتبون اليه يدعونه الى	اور اسی بنا پر اہل کوفہ معاویہؓ کے زمانے میں
الخروج اليهم فى خلافة	میں حسینؓ کو خط بھیج بھیج کر کہتے
معاوية۔ [1]	نکل کر ان کے پاس آجائیں۔

آگے ابن کثیر لکھتے ہیں:-

كل ذالك يابى عليهم [2]	حسینؓ نے ہر بار ان کی اس دعوت کو قبول کرنے سے انکار کیا۔

حضرت حسینؓ کی رائے

لیکن حضرت حسینؓ کے اس انکار سے یہ سمجھ لینے کی گنجائش نہیں ہے کہ آپ کی اس رائے میں تبدیلی آگئی تھی جس رائے کی بنا پر آپ نے اپنے برادر بزرگ حضرت حسنؓ کی مصالحت پسندی سے اختلاف فرمایا تھا۔ بلکہ دوسرے تاریخی بیانات کی روشنی میں نظر آتا ہے کہ آپ کی رائے میں کوئی فرق نہیں آیا تھا البتہ جو بیعت آپ حضرت حسنؓ کے ساتھ حضرت معاویہؓ سے کر چکے تھے یا تو اس کا احترام آپ کو کسی ایسے اقدام سے مانع تھا جس کی طرف اہل کوفہ بلاتے تھے یا آپ کی رائے میں اب وہ قابل احترام تو نہیں رہی تھی مگر مصلحت نہیں معلوم ہوتی تھی کہ ایسا اقدام کیا جائے۔ تاریخ کے بیانات سے دونوں ہی امکانات سامنے آتے ہیں۔ البدایہ والنہایہ میں ہے کہ جب کوفیوں نے حضرت حسینؓ کے پاس بکثرت آمد و رفت شروع کی تو مدینے کے گورنر مروان نے حضرت معاویہؓ کو اس کی اطلاع دیتے ہوئے خطرات کی پیش بندی کی طرف توجہ دلائی اس پر حضرت معاویہؓ نے حضرت حسینؓ کو لکھا کہ۔

ان من اعطى الله صفقة	جس شخص نے اللہ کو قول و قرار دیا ہو

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۵۱ [2] ایضاً

بيعة وعهده بعهد بالوفاء	ویسی بیعت کی ہو اسکو لائق ہے کہ
وقد انبئت ان قوما من اهل	وفائے عہد کرے مجھے اطلاع دی گئی ہے
الكوفة قد دعوك الى الشقاق	کہ کوفہ کے کچھ لوگوں نے تمہیں نفاق آرائی کی
واهل العراق من قد جربت	دعوت دی ہے حالانکہ یہ اہل عراق وہی ہیں
قد افسدوا على ابيك واخيك	جنکو تم دیکھ چکے ہو کہ انھوں نے تمہارے
فاتق الله واذكر الميثاق	باپ بھائی کو کس طرح بگاڑا پس اللہ سے ڈرو
فانك متى تكدني اكدك لہ	اور عہد کو یاد رکھو اسلئے کہ اگر تم نے میرے
	خلاف کوئی قدم اٹھایا تو میں بھی اٹھاؤں گا

اس خط پر حضرت حسینؓ کا جواب یہ نقل کیا گیا ہے

اتاني كتابك وانا بغير الذي بلغك	تمہارا خط ملا معلوم ہونا چاہیے کہ میرا
عني جدير والحسنات لا	حال اس کے خلاف ہے جو تمہیں پہنچے
يهدي لها الا الله وما اردت	نیکی معلوم ہونا سب ہی اللہ کا
لك محاربة ولا عليك خلافا	فضل ہے مجھے سوا نیکی کی چاہت
وما اظن لي عند الله عذرا	ہے بالفعل کوئی نہیں میں تمہارے خلاف
في ترك جهادك وما اعلم فتنة	کسی جماعت آرائی اور مخالفت کا ارادہ بھی
اعظم من ولايتك امر هذه	رکھتا ہوں مگر میں یہ نہیں جانتا کہ تمہارے
الامة ٹہ	خلاف جہاد نہ کرنے کیلئے میرے پاس اللہ
	کے سامنے کیا عذر ہوگا اور میں نہیں جانتا
	کہ اس سے بڑھ کر اور فتنہ کیا ہو سکتا ہے کہ
	تمہارے ہاتھ میں اس امت کی سربراہی ہے

لہ ق ۸ مختصر

ٹہ ایضاً ۔

اس جواب کے سخت لہجے کے باوجود یہی اندازہ ہوتا ہے ـــ عامل کے پیشِ نظر کی وضاحت ہے ـــ کہ حضرت حسینؓ کے لیے اصلاً یہی بیعت مانع تھی۔ اور اسی کو توڑنے کا خیال آپ نے اپنے آپ کے لیے اور اپنے لیے نازیبا قرار دیا تھا۔ لیکن کوئی شخص آخری فقرے کا سہارا لیکر کہنا چاہے تو کہہ سکتا ہے کہ بیعت کا خیال مانع نہیں تھا بلکہ بات مصلحتِ وقت کی تھی جو مانع ہو رہی تھی۔ یعنی حضرت معاویہؓ کے اقتدار کے استحکام کو دیکھتے ہوئے کسی مخالف اقدام کی کامیابی کا امکان نظر نہیں آتا تھا۔ اور شیعہ حضرات یہی کہتے ہیں کیونکہ وہ سرے سے بیعت ہی کا انکار کرنا چاہتے ہیں۔ حیوۃ الامام الحسین جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے اس کے شیعہ مصنف باقر شریف القرشی لکھتے ہیں کہ:

وهو يرى من رأي الامام التريث	امام حسینؓ کی رائے میں معاویہ کے خلاف
على معاوية لانه لعلمه بفشل	خروج مناسب نہیں تھا کیونکہ وہ جانتے
ثورته وعدم نجاحها[1]	تھے کہ کامیاب نہیں ہوگی۔

اس کے بعد الاخبار الطوال ص ۲۰۳ اور انساب الاشراف (ج ۳ ق ۱) کے حوالے سے آپ کا یہ خط بھی نقل کیا ہے جو اہلِ کوفہ کی طرف سے خروج کی دعوت کے جواب میں لکھا گیا تھا:

... وما ... ليس رأيي	اور جہاں تک میرا تعلق ہے آج کل
اليوم ذلك فالصقوا رحمكم	میری رائے ابھی خروج کی نہیں
الله بالارض واكمنوا في	ہے۔ بس تم لوگ جب تک معاویہ
البيوت واحترسوا من	زندہ ہیں زمین سے چپکے رہو گھروں
الظنة ما دام معاوية حيًّا	میں ٹکے رہو اور کسی طرح کے شک
فان يحدث الله به حدثًا	شبہ کا موقع مت پیدا کرو ہاں

---

[1] حیوۃ الامام الحسین ج ۲ ص ۲۳۵۔

وانا حی کتبت الیکم
برأیی ۔

اگر معاویہ کو کچھ ہو گیا اور میں اس
وقت زندہ ہوا تو میں تمہیں اپنی
رائے سے آگاہ کروں گا۔

اس خط کا انداز بظاہر ان لوگوں کی تائید میں جا رہا ہے جو سمجھتے ہیں کہ حضرت حسینؓ کا عدم خروج بربنائے حالات و احتیاط تھا، مگر اس بیعت کے احترام میں جو آپ نے حضرت حسنؓ کے ساتھ حضرت معاویہ کے ہاتھ پر کی تھی۔

بہرحال جو بھی واقعہ ہو، اس بات میں شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ حضرت حسینؓ کا یہ رویہ بس حضرت معاویہؓ کی زندگی تک کے لیے تھا۔ حضرت معاویہؓ نے اپنے بعد کے لیے جب بطور ولی عہد اپنے بیٹے یزید کا تقرر کیا اور چاہا کہ لوگ اسے قبول کرلیں تو حضرت حسینؓ کا اس کو قبول کرنے اور یزید کے لیے بطور ولی عہد بیعت کرنے سے انکار اس بات کی ایک علامت تھی کہ وہ اپنے آپ کو آئندہ کسی اقدام کے لیے آزاد رکھنا چاہتے تھے اور اس میں کچھ نہ کچھ دخل کوفیوں کا بلاشبہ تھا جیسا کہ مذکورہ بالا تاریخی بیانات سے ظاہر ہوتا ہے۔

بابِ سوم

یزید کی ولی عہدی کی تجویز اور حضرت مغیرہؓ بن شعبہ

مورخین (طبری، ابن اثیر، ابن کثیر وغیرہ) کے بیان کے مطابق سنہ ۵۶ھ میں یعنی اپنے انتقال سے ۴ سال پہلے حضرت معاویہؓ نے طے کیا کہ اپنے بعد خلافت سنبھالنے کے لیے یزید کو نامزد کر دیں اور اس نامزدگی کے لیے رعایا سے رضامندی بھی حاصل کر لیں جس کی شکل اس زمانے میں بیعت تھی۔ تاکہ بعد میں کوئی جھگڑے قضیے کی صورت نہ پیدا ہو حضرت معاویہ کی اس کوشش کی بابت آتا ہے کہ۔

وفیہا دعا معاویۃ الناس الی	اسی سال (۵۶ھ) میں معاویہ نے تحریک کی
البیعۃ لیزید ولدہ ان یکون	کہ لوگ ان کے بیٹے یزید کی ولی عہدی
ولی العہد من بعدہ	کے لیے بیعت کریں ..... پس تمام علاقوں
فبایع لہ الناس فی سائر الاقالیم	میں لوگوں نے اس کے لیے بیعت کر لی بجز
الا عبد الرحمن بن ابی بکر	عبدالرحمن بن ابی بکر کے اور حضرت عبداللہ بن عمر
وعبد اللہ بن عمر والحسین	حسین بن علی عبداللہ بن زبیر اور
بن علی وعبد اللہ بن زبیر وابن عباس[1]	عبداللہ بن عباس کے۔

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۷۹۔

جہاں تک یزید کی ولی عہدی کے لیے نامزدگی کا تعلق ہے وہ ایک یقینی بات ہے اسی طرح حضرت حسینؓ کا اس کو قبول کرنے سے انکار بھی ایک قطعی واقعہ ہے۔ مگر ان دونوں باتوں کی جو تفصیلات ہماری تاریخ کی کتابوں میں آتی ہیں ان میں ایک بڑا حصہ ناقابلِ یقین ہے۔ یہ تفصیلات چونکہ خوب شہرت پا چکی ہیں۔ اس لیے بہتر ہے کہ اس موضوع پر تھوڑی سی گفتگو ان تفصیلات پر ہو جائے۔ اس باب میں ہم پہلے واقعے کی تفصیلات پر گفتگو کریں گے۔

ولی عہدی کی تجویز

یزید کو ولی عہد بنائے جانے کی تجویز کے سلسلے میں روایت بیان کی جاتی ہے کہ یہ تجویز صحابی رسولؐ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے پیش کی تھی اور اس کا پس منظر خالص ایک خود غرضانہ اور نفس پرستانہ پس منظر تھا۔ ایسی خود غرضی اور نفس پرستی کہ اس میں اسلام اور ملتِ اسلام کی بدخواہی بھی انھیں بخوشی منظور ہو گئی[1] (العیاذ باللہ)

حضرت مغیرہؓ کا مقامِ صحابیت

یہ مغیرہؓ بن شعبہ کون ہیں؟ ان اصحاب کرام میں سے ہیں جنھیں ۶ھ میں صلح حدیبیہ کے موقع پر بیعتِ رضوان میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہے۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر اصحاب نبیؐ کی وہ بیعت ہے جس کے بارے میں قرآن پاک نے بشارت دی کہ

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ	بے شک اللہ راضی ہوا ان مسلمانوں سے جب کہ وہ آپ
يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ	درخت کے نیچے آپ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے

---

[1] روایت کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔ [2] یعنی ۶ھ میں بیعت جس [illegible] الاصابہ فی تمییز الصحابہ ابن حجر ۳/۴۳۲، سیر اعلام النبلاء از حافظ ذہبی ۳/۲۱ ملاحظہ بیروت، البدایہ والنہایہ ۸/۴۷

اور پھر اس صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت مغیرہ و عروہ ثقفی کا بیت بھی اس میں سنتے تھے بلکہ ان کا ایک خاص قابل ذکر کردار بھی اس موقع پر تھا جو ان کے ایمانی تاثرات کا اظہار کرتا ہے وہ کردار یہ ہے کہ اس صلح کے موقع پر قریش مکہ کی طرف سے جو صاحب سفیر ہو کر گفتگو کے لیے آئے تھے وہ حضرت مغیرہ بن شعبہ کے چچا عروہ بن مسعود ثقفی تھے۔ عروہ بن مسعود نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو شروع کی تو ان کا ہاتھ بڑھ بڑھ کر بار بار آنحضرت کی ریش مبارک تک پہنچتا تھا۔ مغیرہ بن شعبہ تلوار لیے اور آہنی خود پہنے جس میں چہرہ بھی چھپا ہوا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر کھڑے ہوئے تھے۔ اپنے چچا کے اس طرز گفتگو پر بگڑ کر بولے کہ "اپنا ہاتھ روک لو قبل اس کے کہ اس سے ہاتھ دھو بیٹھو" عروہ بن مسعود جو طائف اور مکہ کی نہایت بااثر شخصیت تھے اس جملے پر سناٹے میں آ گئے۔ آنحضرت سے مخاطب ہو کر بولے کہ "محمد! یہ کون شخص ہے! کس قدر بے تکی زبان میں بات کرتا ہے!" آنحضرتؐ نے فرمایا "آپ ہی کا بھتیجا ہے۔"[1] ـــــ اور یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ کوئی ایسے چچا بھتیجے تھے جن کے آپس کے تعلقات اچھے نہ رہے ہوں گے۔ نہیں ان کے آپس کے تعلقات نہایت اچھے تھے جس کی شہادت عروہ کا اگلا جملہ دیتا ہے۔ عروہ آنحضرتؐ کا جواب سن کر حضرت مغیرہ کی طرف متوجہ ہوئے اور بولے "اچھا یہ تم ہو دھوکہ باز! ابھی کے لیے کل ہی میں نے بھرا ہے"[2] ـــــ یہ اشارہ تھا اس واقعے کی جانب کہ حضرت مغیرہ جو اگرچہ کچھ وقت پہلے اسلام لائے تھے اس سے قبل انھوں نے ایک سفر میں اپنے ساتھیوں کی کسی بات پر خفا ہو کر ان سب کو قتل کر دیا تھا۔ عروہ بن مسعود نے ان سب کی دیت اپنے پاس سے ادا کر کے معاملے کو ختم کیا تھا۔

حضرت مغیرہ کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ جب ان کے شہر طائف والے بعد میں مسلمان ہوئے تو ان کے مخصوص بت لات کا بت خانہ گرانے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] سیرۃ اعلام النبلاء ۲۵ ص ۲۴۔ [2] ایضاً۔

سے جن دو اشخاص کو بھیجا تھا ان میں سے ایک یہی مغیرہ بن شعبہ تھے۔[1] (دوسرے ابوسفیان بن حرب تھے)

۹ھ میں یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری غزوہ "غزوۂ تبوک" ہوا۔ یہ غزوہ اپنی چند در چند مشکلات اور دشواریوں کی وجہ سے "غزوۂ عسرت" بھی کہلاتا ہے۔ اور اسی حوالے سے اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس کے شرکاء پر اپنی عنایت خاص کا اعلان بھی قرآن پاک کی سورۂ توبہ میں یوں فرمایا ہے۔

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ	اللہ نے رحمت کی نظر فرمائی نبی پر
وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ	اور مہاجرین و انصار پر کہ جنہوں نے تنگی
الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ	کے وقت میں نبی کا ساتھ دیا تھا جبکہ
الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ	ان لوگوں میں سے بعض کے دل کچھ پھرنے چلے
قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ	تھے پھر اللہ نے ان پر بھی نظر رحمت
عَلَيْهِمْ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ	فرمائی بے شک اللہ ان کے لیے رؤف
رَّحِيْمٌ۔ (آیت ۱۱۷)	اور رحیم ہے۔

حضرت مغیرہ کو اس غزوہ میں شرکت کا بھی شرف حاصل تھا اور وہ جانبازوں کے زمرے میں تھے۔ حضرت مغیرہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ۱۳۶ سے اوپر احادیث مروی ہیں۔ اسی غزوۂ تبوک کے موقع کی بھی ایک روایت چمڑے کے موزوں پر مسح کرنے کی ان سے بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور مؤطا امام مالک وغیرہ میں مروی ہوئی ہے۔ کہیں غزوۂ تبوک کے ذکر کے ساتھ اور کہیں بغیر اس کے ذکر کے۔[2]

حضرت مغیرہؓ خلفائے راشدینؓ کے دور میں

دورِ نبوی کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور میں بھی وہ ایک معتمد شخصیت اور

---

[1] الاصابہ ج ۶ ص ۱۳۲ [2] دیکھئے سیر اعلام النبلاء ج ۳ ص ۲۲ تا ۳۰ وغیرہ۔

ہانت میں نمایاں رہے۔[1] شجاعت میں بھی ممتاز تھے اور تدبیر و حکمت اور معاملات و ذہانت میں بھی فرد، حافظ ذہبی لکھتے ہیں:-

من کبار الصحابۃ اولی	بڑے صحابہ میں سے تھے
الشجاعۃ والمکیدۃ شھد	صاحب شجاعت بھی، صاحب حکمت و
بیعۃ الرضوان۔[2]	تدبیر بھی۔

غیر معمولی ذہانت اور اصابت رائے کی بنا پر مغیرۃ الرأی کہلاتے اور دہاۃ عرب میں شمار ہوتے تھے۔[3] حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں بھی وہ معتمد رہے۔ بحرین کے گورنر بنائے گئے۔ بصرہ کی گورنری پر رہے اور پھر کوفے کی۔[4] بصرہ کی گورنری کے زمانے میں ان پر ایک سنگین اخلاقی الزام لگا، حضرت عمرؓ نے معزول کر کے شہادت طلب کی۔ شہادت ناکام ہوئی تو روایت میں ہے کہ:-

فکبّر عمر	حضرت عمرؓ نے خوشی سے تکبیر کہی۔[5]

اس کے بعد جب پھر ایک موقع آیا کہ کوفے کی گورنری کے سلسلے میں حضرت عمرؓ سخت پریشان تھے جس آدمی کو بھی وہاں بھیجتے وہ ناکام ہوتا۔ اس لیے کہ جیسا کہ اوپر گزرا وہ سخت بے پیرے لوگ تھے۔ ادھر کوئی حاکم بھیجا ادھر انہوں نے اس کے خلاف شکایتوں کا سلسلہ شروع کیا۔ تو اس موقع پر آپ نے گہرے غور و فکر اور مشاورت کے بعد حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کا انتخاب کیا۔

---

[1] حافظ ابن حجر نے الاصابہ میں لکھا ہے کہ یمامہ کے معرکے میں شامل تھے [illegible] ہوگئی تھی اس کے بعد [illegible] عراق میں [illegible] حضرت ابوبکرؓ کی طرف بھیجے گئے ص ۱۳۳۔ [2] سیر اعلام النبلاء ج ۳ ص ۲۱۔ [3] ایضاً ص ۲۱۔ [4] الاصابہ ج ۳ ص ۲۱۳۔ [5] الاصابہ ج ۳ ص ۱۳۲-۱۳۳۔ [6] اعلام ۲۵ ص ۲۔

فاروقی انتظامیہ کا ایک اہم اصول اور حضرت مغیرہ

اس مشاورت اور انتخاب اور اس کے معیار کی تفصیل بجائے خود بڑی سبق آموز ہے اور فاروقی بلکہ اسلامی انتظامیہ (ADMINISTRATION) کا ایک نہایت اہم اصول اس کے ذریعہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ تفصیل یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت عمار بن یاسر کو کوفے کی گورنری پر بھیجا۔ حضرت عمارؓ ان سابقین اولین میں ہیں جنہوں نے بڑی مصیبتیں اسلام کی راہ میں اٹھائی ہیں۔ مگر کوفے والے لوگ۔ یہ کوفے والے ذرا ہی شکایتیں شروع کر دیں۔ نہ صرف یہ شکایت تھی کہ نا اہل ہیں بلکہ یہ بھی کہ امانت دیانت سے بھی خالی ہیں[1]۔ حضرت عمرؓ نے واپس بلالیا اور کہا کہ عمار! میں جانتا تھا کہ یہ کام تمہارے بس کا نہ ہوگا مگر میرا دھیان اس آیت کی طرف گیا جس میں ارشاد حق ہے کہ :-

وَنُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ	اور ہم ارادہ کرتے ہیں کہ ان لوگوں پر احسان
اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ	کریں جن کو کمزور بنا کر رکھا گیا ہے
أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ	پس ان کو سربراہ بنائیں اور زمین
(سورہ ۲۸ قصص آیت ۵)	کی وراثت بخشیں۔

اس لئے میں نے تم کو بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ ان کو واپس بلانے کے بعد حضرت عمرؓ نے کوفے کے وفد سے پوچھا کہ تم بتاؤ کس کو چاہتے ہو۔ انہوں نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کا نام لیا۔ یہ بھی بڑے پائے کے صحابی تھے ان لوگوں کے اپنے ہی تھے۔ یمن سے تعلق تھا اور یمن کے بہت سے قبیلے کوفے میں آ بسے تھے۔ مگر سال بھر مشکل سے گزرا کہ ان کے حالات کی شکایت شروع ہو گئی اور حضرت عمرؓ نے ان کو کوفے سے ہٹا کر بصرے بھیج دیا[2]۔ اب اس مثالی جگہ کے لیے فکرمند تھے کہ کیا کریں کس کو بھیجیں۔ مسجد میں گر

---

[1] تاریخ ابن اثیر ج ۲ ص ۱۹ ۔ [2] ایضاً ۔

لیٹے اور نیند آگئی۔ اسی حالت میں حضرت مغیرہ بن شعبہ وہاں پہنچ گئے، حضرت عمرؓ بیدار ہوئے تو انھوں نے اپنی قیافہ شناسی کے تحت کہا کہ آپ کچھ زیادہ ہی فکر مند معلوم ہوتے ہیں خیریت تو ہے۔ حضرت عمرؓ نے قصہ بتایا۔ اسی دوران میں اہل شوریٰ بھی آگئے ان کے دریافت کرنے پر کہ معاملہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ:-

ان اہل الکوفۃ قد عضلونی (اہل کوفہ نے مجھے سخت تعب میں ڈال دیا)

اور پھر مجھے تقرر کے سلسلے میں مشورہ طلب کرتے ہوئے ان حضرات سے فرمایا کہ مسئلہ یہ سامنے ہے کہ حکام اہل ایمان کے تقرر کے سلسلے میں کیا اصول برتوں؟ اعلیٰ اسلامی صفات والے کو ترجیح دوں اگرچہ وہ انتظامی لحاظ سے کمزور ہو؟ یا انتظامی لحاظ سے مضبوط اور اہل افراد کو ترجیح دی جائے اگرچہ وہ اسلامی صفات کے لحاظ سے ادنیٰ مقام کے درجہ پر ہی کیوں نہ ہوں۔ آپ کے الفاظ جو روایت میں نقل ہوئے ہیں یہ ہیں:-

ما تقول فی تولیۃ رجل ضعیف مسلم او رجل قوی مسلم ؟

اس پر جواب دینے والے حضرت مغیرہ تھے انھوں نے فرمایا کہ:-

اما الضعیف المسلم فان اسلامہ
لنفسہ وضعفہ علیک وعلی
المسلمین واما القوی الفاسق
فان فسقہ لنفسہ وقوتہ
لک وللمسلمین[1]

امیر المؤمنین! جہاں تک انتظامی اعتبار
سے کمزور مگر اسلامی لحاظ سے اعلیٰ درجہ
کے مسلمان کا سوال ہے تو اس کی اسلامیت
کا فائدہ اس کی ذات کو پہنچے گا مگر اس کی
کمزوری کا نقصان آپ کو اور مسلمانوں کو ہوگا اس کے
برعکس جس کا معیار دینی کمزور مگر مضبوط ہو تو اس کی
بدکاری اس کے لیے ہوگی اور مضبوطی آپ کے
اور سارے مسلمین کے لیے۔

---

[1] "تاریخ ابن اثیر" ج ۳ ص ۲۱

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے جب مذکورہ بالا سوال اہل شوریٰ کے سامنے رکھا تھا تو ان کا اپنا رجحان بھی اسی طرف تھا۔ اور وہ شکایت عیاں ہے جو ان سے ہوئی کہ یا اللہ میں کیا کروں متقی ہے تو منتظم نہیں ہوتا اور جو منتظم ہوتا ہے اس میں تقویٰ نہیں ہوتا۔ اس شکایت کے تجربہ کے نتیجہ میں آخر وہ یہ طے کرنے پر مائل ہو گئے کہ تقویٰ کو کم اور انتظام کو زیادہ اہمیت دی جائے۔ چنانچہ اس موقع پر جو کہ آپ کی وفات سے ڈھائی سال پہلے یعنی ۲۱ھ کا واقعہ ہے، حضرت مغیرہ کا جواب سننے کے بعد آپ نے گویا اسی کو قبول کر لیا اور حضرت مغیرہ ہی کے لیے طے کر دیا کہ وہ کوفہ کی صوبہ داری سنبھالیں۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں۔

فولّی المغیرۃ الکوفۃ فبقی	پس آپ نے کوفہ کی ولایت مغیرہ کے سپرد
علیہا حتیٰ مات عمر وذلک	کر دی اور وہ اس عہدہ پر رہے حتیٰ کہ
نحو سنتین او زیادۃ[1]	حضرت عمرؓ نے وفات پائی اور یہ کوئی
	دو سال یا کچھ اوپر کی مدت ہوئی۔

حضرت مغیرہؓ کی دوسری عظمت

حضرت مغیرہؓ کی ایک عظمت وہ تھی جو سورۃ توبہ اور سورۃ فتح کی اُن قرآنی آیات سے ثابت ہوتی ہے جن کا حوالہ اوپر گزرا اور جن کی رو سے حضرت مغیرہ ایک طرف اُن چودہ سو سرفروش انسانوں میں تھے جن سے پروردگار عالم نے اپنی خوشنودی کا اعلان صلح حدیبیہ کے موقع پر فرمایا۔ اور دوسری طرف ان تیس ہزار سرفروشوں کی فہرست میں بھی ان کا نام ثبت ہے جن کو پروردگار نے غزوۂ عسرت کی صعوبتیں اٹھانے پر ہمیشہ کی ایک خصوصی عظمت سے سرفراز فرمایا۔ یہ ان کی ایک اور سب سے بلند تر عظمت تھی۔ دوسری عظمت ان کے تقرب سے سامنے آتی ہے کہ وہ صحابیت اور حکومت کی سرفرازیاں حاصل ہونے کے باوجود ان کے لئے

---

[1] ابن اثیر ج ۲ ص ۱۶ ۔

یہ بات خدا کسی پریشان کن نہیں ہوئی کہ حضرت عمرؓ جس گفتگو کے سیاق و سباق میں ان کو کچھ شک کا حکم دے رہے ہیں اس کی رو سے قتل کا جواز ایک نماز گزار متقی مسلمان کا ہو جاتا ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر وہ انہوں نے کر گزرا اپنے ہی ہاتھ سے پے در پے کم متقی مسلمان ہمسایہ نہیں لگا لیا۔ ظاہر ہے کہ سب صحابہ کرامؓ ایک درجے کے نہیں تھے تقویٰ و طہارت میں بھی ان کے درجات مختلف تھے۔ اور ایسے میں ان کی عظمت کی بات کہا جا سکتا ہے کہ ایسی قرآنی بشارتوں سے سرفرازی کے باوجود ان میں سے اگر کوئی اپنے آپ کو تقویٰ اور طہارت اور دین میں متابعت کمتر دیکھتا تھا تو بے تکلف اپنے آپ کو کمتری والا اور کمتر سمجھے جانے پر راضی ہوتا تھا۔ اللہ کی طرف سے ملنے والی خوشخبریوں کے تحفے پر نظر کر کے غرے میں نہیں مبتلا ہوتا تھا البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد ..... ولکن سددوا وقاربوا[1] پر نظر کر کے اللہ سے آخرت میں عفو و مغفرت کی امید رکھتا تھا۔

ناممکن روایت کا متن

شیعہ حضرات سوائے تین چار کے تمام اصحاب نبیؐ کے بارے میں کہتے ہیں کہ مرتد ہو گئے تھے بلکہ بالتعیین الشیخین ابوبکرؓ و عمرؓ اور عثمانؓ وغیرہ تو شروع ہی سے معاذ اللہ منافق تھے۔ ایسا گمان رکھنے والوں کے لیے ٹھیک ہے کہ وہ ان حضرات کی شان میں جو بھی چاہیں سوءِ ادب کریں مگر جو شخص اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ایسے گمان کو اپنے لیے بدبختی کی بات سمجھتا ہو وہ کیسے مان سکتا ہے کہ یہ لوگ جنہوں نے اسلام کے لیے ایسی جان نثاریاں اور قربانیاں کیں کہ خدائے پاک نے بھی سند قبولیت

---

[1] صحیح بخاری ۔ ان الدین یسر ولن یشاد الدین احد الا غلبہ فسددوا وقاربوا وابشروا ۔ الحدیث (دین کا طریقہ آسان ہے جو کوئی اس میں شدت پسندی کرے گا بالآخر مغلوب ہو جائے گا پس بیچ راستے سے کام لو اور صحت مندی کی خوشخبری پاؤ ۔ دیکھو باب الدین یسر کتاب الایمان صحیح البخاری)

علانیہ بادی رہ اسلام کی جڑ کھودنے کا کام کریں گے اور فخر سے کہیں گے کہ ہم نے اسلام کو امت اسلامیہ کے لیے تباہی کی داغ بیل ڈال دی ہے۔ یہی بدبختانہ بات ہے جو یزید کی ولی عہدی کی تجویز کے سلسلے میں حضرت مغیرہ جیسے صاحب فضائل صحابی رسول کی طرف ہماری تاریخ کی کتابوں میں منسوب کی گئی ہے اور جس کے متعلق ہم نے کہا تھا کہ تفصیل آگے آئے گی۔ تاریخ کی جو کتابیں اس وقت ہمارے سامنے ہیں، ان میں سب سے زیادہ تفصیل ابن اثیر کی کتاب الکامل فی التاریخ میں دہرایا گیا ہے۔ اور یہ بیان دیا گیا ہے کہ:

اور اسی سنہ ۵۶ھ میں لوگوں نے یزید بن معاویہ سے ولی عہدی کی بیعت کی۔ اس معاملے کی ابتدا مغیرہ بن شعبہ سے ہوئی تھی۔ ہوا یوں کہ معاویہ نے کوفے کی امارت سے مغیرہ کو معزول کر کے سعید بن عاص کو مقرر کرنے کا ارادہ کیا۔ مغیرہ کو یہ بات معلوم ہوئی تو انہوں نے کہا کہ مجھے معاویہ کے پاس جا کر خود ہی اپنا استعفا پیش کر دینا چاہیے تاکہ لوگوں کو یہ ظاہر ہو کہ مجھے اس عہدے کی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ پس یہ طے کر کے وہ معاویہ کے پاس گئے [illegible] پیش کر دے۔ دوستوں سے کہا کہ اگر میں نے آج ولایت و امارت حاصل نہیں کر لی تو پھر کبھی نہیں کر سکوں گا۔ یہ کہہ کر سیدھے یزید کے پاس پہنچے اور اس سے کہا کہ یہاں بڑے بڑے اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور بزرگان قریش گزر چکے۔ اب صرف ان کی اولاد رہ گئی ہے اور تم ان میں سے سمجھ بوجھ کے اعتبار سے بھی اور سنت و سیاست کے علم کے اعتبار سے بھی افضل ہو۔ میں نہیں جانتا کہ آخر امیر المومنین کو کیا چیز مانع ہے کہ وہ تمہارے لیے ولی عہدی کی بیعت لے لیں۔ یزید یہ سن کر بولا کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ بیل منڈھے چڑھے گی؟ مغیرہ نے کہا کیوں نہیں؟ پس یزید اپنے باپ کے پاس گیا اور یہ گفتگو سنائی۔ معاویہ نے بات سن کر مغیرہ کو بلایا اور پوچھا کہ یزید کیا کہہ رہا ہے؟

انہوں نے کہا کہ ہاں، امیر المومنین! ٹھیک کہہ رہا ہے ـــ میرے سامنے اس افسوسناک خونریزی کا منظر ہے جو عثمانؓ کے قتل کے بعد رونما ہوا (میں نہیں چاہتا کہ یہ دوبارہ ہو) یزید کی شکل میں آپ کے بعد ذمہ داری کو سنبھالنے والا ایک فرد موجود ہے۔ بس اس کا تقرر کر دیجئے تاکہ آپ کو کچھ ہو تو لوگوں کے لیے ایک جائے پناہ اور آپ کا خلف موجود ہو اور کوئی فتنہ و فساد رونما نہ ہونے پائے معاویہ نے یہ سن کر کہا کہ اس کام کی صورت کیا ہوگی؟ مغیرہ نے جواب دیا کہ کوفے والوں کو متفق کرنے کے لیے میں کافی ہوں اور بصرے کے لیے زیاد موجود ہے ان دونوں بڑے شہروں کے بعد کوئی نہیں رہ جاتا جو آپ کی مخالفت کرے۔ معاویہ نے یہ سن کر کہا اچھا تم اپنے منصب پر واپس جاؤ اور اپنے معتمد لوگوں سے بات چیت کرو۔ پھر مغیرہ یہ کہہ کر معاویہ نے ان کو رخصت کیا اور وہ واپس اپنے دوستوں میں پہنچے اور بولے کہ میں نے معاویہ کا پاؤں ایسی رکاب میں پھنسا دیا ہے کہ اب نکلنے کا نہیں ہے اور امت محمدیہ میں پھوٹ کا وہ سلسلہ کھولا ہے کہ اب ابد تک اس میں جوڑ کی صورت نہ ہوگی[1]

کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی اور بھی ہے لیکن جتنا اوپر آیا اس کا آخری (خط کشیدہ) جملہ ایسا ہے کہ اس کے بعد کچھ اور سنانے کی ضرورت نہیں[2]

کیا کوئی گنجائش اس بات کی ہے کہ ہم اصحاب بیعت رضوان کے لیے اور بانیٔ غزوۂ تبوک کے لیے حق تعالیٰ شانہ و اجلالہ کی وہ خوشنودی اور کرم فرمائی بھی، جس کا نہایت بلند آہنگ اعلان قرآن پاک میں ہوا ہے۔ اور سب کے ساتھ ان میں سے کسی کے بارے میں یہ ماننے کو بھی تیار ہو جائیں کہ اس نے دنیا کی ایک حقیر غرض

---

[1] ابن اثیر ج ۳ ص ۲۱۵۔ [2] اصل عربی الفاظ یہ ہیں: فقد وضعت رجل معاویة فی غرز بعید الغایة علی امة محمد وفتقت علیهم فتقا لا یرتق ابدا۔

کے یہ بے بنیاد و وابستہ، نہ صرف اسلام دشمنی کا ایک کام کیا بلکہ اس کا فتویٰ ہے۔ علاوہ ازیں بھی مشغول میں کیں، خدا کی پناہ اور ہزار بار پناہ۔ ہم یہ لغویات و لغزیات مان کر قرآن اور اس کے اعلان کو جھٹلانے کا کام کیسے کر سکتے ہیں؟

کچھ اور اس سے بڑھی ہوئی روایتیں

ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے ان قابل فخر مؤرخین کا معیار روایات کے قبول کرنے میں کیا تھا اور انہوں نے کیسے واقفیت سے وابستہ ہونے کے باوجود ایسی روایت کو بلا نقد و تبصرہ لے لیا، لیکن ان پر آنکھ بند کر کے اعتماد ہم ہرگز نہیں کر سکتے کیونکہ ان کے یہاں تو اس سے کہیں زیادہ ناقابل تحقیق اور ایمان سوز روایتیں موجود ہیں۔

حضرت مغیرہ بن شعبہ کے بارے میں ایک روایت طبری میں ہے اور ابن اثیر نے بھی اس کو حسب عادت من و عن لے لیا ہے۔ سنیے اور خود فیصلہ کیجیے کہ کیا اس کو مانا جا سکتا ہے۔ روایت ہے کہ:

"۴۰ھ میں حج مغیرہ بن شعبہ کی امامت میں ہوا"

اس کی تفصیل ابن جریر طبری اپنی سند کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ:-

"جب اس سال میں کہ جس میں علیؓ قتل کیے گئے موسم حج آیا تو مغیرہ بن شعبہ نے معاویہ کی طرف سے ایک جعلی خط بنایا اور اس کی بنیاد پر لوگوں کو سنہ ۴۰ھ کا حج کرا دیا اور کہا گیا ہے کہ انہوں نے یوم ترویہ یعنی ۸ ذی الحجہ کو وقوف عرفہ کرایا (حالانکہ وہ ۹ تاریخ کو عرفات میں ہوتا ہے) اور نحر کے دن کی بجائے یعنی ۹ تاریخ کو قربانی کرا دی (حالانکہ وہ ۱۰ تاریخ کو ہوتی ہے) اور یہ اس ڈر سے کیا کہ کہیں اس کی اصلیت کا پتہ نہ چل جائے۔ اور ایک بیان اس سلسلے میں یہ بھی ہے کہ جلدی جلدی کی کارروائی انہوں نے اس لیے کی کہ انہیں اطلاع مل گئی تھی کہ کل صبح کو عتبہ بن ابی سفیان امیر حج کی حیثیت سے پہنچنے والا ہے۔"

آپ ذرا غور کیجئے مغیرہ دشمنی میں کیسی کیسی خرافات تیار کرنے والوں نے تیار کی ہیں۔ اور ہماری تاریخی کتابوں میں ان کو جگہ مل گئی ہے۔ مالک لیجئے مغیرہ بن شعبہ ان خصائل سے آراستہ ہونے کے باوجود جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اس حد تک بھی معاذ اللہ گر سکتے تھے کہ محض تقرر نامہ بنانے کے لئے حج کی امیری ہی نہ کریں بلکہ اس امیری کی خاطر حج کا حلیہ بھی بگاڑ دیں۔ یعنی ۹ ذی الحجہ کے بجائے ۸ کو حج و وقوف عرفہ کرادیں اور ۱۰ کے بجائے ۹ کو قربانی کرادیں۔ لیکن کیا اس وقت کے اور دو تمام مسلمان بھی اندھے ہو گئے تھے جو حج کرنے آئے تھے، ان میں سے کسی کو خبر نہیں ہو سکی کہ مغیرہ کیا غضب کر رہے ہیں؟ یا کسی کے بھی منہ میں زبان نہ تھی جو انھیں ٹوکتا؟ آخر کون اس بیہودہ روایت کو مان سکتا ہے مگر ہم دیکھ رہے ہیں کہ تنہا طبری ہی نے نہیں اس کو قابل بیان نہیں سمجھا بلکہ ابن اثیر نے بھی بلا چون و چرا نقل کر دیا ہے۔ خدا بھلا کرے ابن کثیر نے ضرور اسے نقل کرنے کے بعد یہ کہنے کی ضرورت بھی سمجھی ہے کہ "یہ روایت باطل ہے، حضرت مغیرہ کے بارے میں ایسے گمان کی کوئی گنجائش نہیں، کیونکہ صحابۂ کرام ایسی باتوں سے بالاتر تھے یہ روایت دراصل شیعیت کا شوشہ ہے۔

ماحصل کلام

بہر حال اس کا امکان تو تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ حضرت مغیرہ نے ایک صاحب رائے اور دور اندیش انسان کی طرح جس کے لیے وہ مشہور تھے، حضرت معاویہ کے بعد اختلافات کے اندیشے سے پہلے تاڑ کر اس کی جانشینی کے لیے یزید کی ولی عہدی مناسب رہے گی۔ لیکن یہ بات کہ انھوں نے محض کوفہ کی اپنی امارت بچانے کے لیے یہ ڈول کھیلا اور اس بات کا پورا شعور رکھتے ہوئے کھیلا کہ اس تجویز کے ذریعہ وہ امت مسلمہ کو

لہ البدایہ والنہایہ ج ۸ صـ ۸۱

تباہی و بربادی کے راستے پر ڈال دیے ہیں، یہ قطعی ناقابل قبول بات ہے۔ قرآن پاک کی صاف صاف شہادت ہے کہ "اللہ ان سے راضی ہو۔" "اللہ نے ان کی مغفرت کی" تو کیا اس قرآنی شہادت کے مقابلے میں کوئی بھی ایسی روایت کیسے قابل قبول ہو سکتی ہے جو حضرت مغیرہ کو ایسے کردار کا حامل دکھائے جس کے ساتھ اللہ کی رضا و مغفرت کی ہرگز جمع نہیں ہو سکتی؟ اور پھر روایت بھی وہ جس کی کوئی سند تک ہمارے سامنے نہیں ہے۔[1]

ایک اور پہلو

اتنی ہی بات نہیں کہ یزید کی ولی عہدی کے لیے حضرت مغیرہ کی تجویز کی روایت از روئے روایت لائق تسلیم نہیں ہے بلکہ درایتی حیثیت سے بھی اس کی خامی یہ ہے کہ ابن اثیر تو اپنی بلا سند روایت میں واقعہ کی صورت یہ بیان کرتے ہیں جیسا کہ اوپر گزر چکا کہ سنہ ۴۹ھ میں حضرت معاویہ نے حضرت مغیرہ کو کوفہ کی امارت سے معزول کر کے سعید بن عاص کو ان کی جگہ لانے کا ارادہ کیا۔ مغیرہ کو پتہ چلا تو وہ اس بات سے پہلے کہ ملازمت سے برطرف کر دیے جائیں، اپنی بے نیازی ظاہر کرنے کے لیے خود جا کر استعفیٰ دے دیں۔ امام طبری میں سند کے ساتھ صورت واقعہ یہ بیان کی گئی ہے کہ مغیرہ نے ضعف کا عذر کر کے معاویہ کے پاس پہنچ کر ان کا استعفیٰ قبول کر لیا جائے۔ جس پر حضرت معاویہ نے قبول کر لیا اور ان کی جگہ پر سعید بن العاص کو لانے کا ارادہ کیا۔

دونوں روایتوں میں صورت واقعہ بالکل مختلف ہے۔ ابن اثیر کی روایت میں حضرت معاویہ ارادہ کرتے ہیں کہ حضرت مغیرہ کو ہٹا کر سعید بن عاص کا تقرر کر دیں اور یہ سن کر حضرت مغیرہ استعفیٰ دینے جاتے ہیں جبکہ طبری کی روایت میں حضرت مغیرہ خود سے استعفیٰ کے خواہش مند ہوتے ہیں اور تب حضرت معاویہؓ ارادہ کرتے ہیں کہ سعید بن عاص

---

[1] تاریخ ابن اثیر میں سند کی روایت درج نہیں ہوتی۔

کو مقرر کر دیا جائے۔ اس اختلاف کی صورت میں طبری کی باسند روایت کو قدرتی طور پر ابن اثیر کی بے سند روایت پر ترجیح ہونی چاہیے۔ طبری کی روایت آگے ایسی کوئی بات نہیں بیان کرتی جس کا حضرت مغیرہ جیسے ایک صحابی رسول کے حق میں ماننا ہمارے لیے ممکن نہ ہو۔

طبری کی روایت کا سقم

لیکن طبری کی روایت میں بھی ایک جھول ہے یعنی آگے جو صورت واقعہ انھوں نے بیان کی ہے وہ عقلاً کچھ جچتی نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت مغیرہ کا استعفے منظور ہونے اور سعید بن عاص کا ان کی جگہ پر نام آنے کی بھنک جو حضرت مغیرہ کے کسی کاتب کے کان میں پڑی تو وہ سعید کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے بھاگم بھاگ سعید کے پاس جا پہنچا، اور خوشخبری سنائی۔ اس کا پتہ حضرت مغیرہ کو چل گیا اور یہ چیز انھیں ناگوار ہوئی تو ایک دم یزید کو ولی عہدی کا خواب دکھانے کی اسکیم تیار کر کے یزید کے پاس پہنچ گئے یزید یہ سہانا خواب لے کے اپنے والد کے پاس پہنچے اور والد نے اس کی خوشی میں حضرت مغیرہ کو ان کی جگہ پر بحال کر کے کوفے واپس بھیج دیا کہ جائیں اور اس خواب کو واقعہ بنانے کی تدابیر کریں۔

مغیرہ بن شعبہ خود استعفے دینے کو جاتے ہیں، مصنف الطبری کا افسانہ ہے۔ پھر یہ کیا بات ہوئی کہ جو شخص ان کا سکریٹری تھا وہ نئے ہونے والے امیر کو اطلاع کرنے کیلئے اس کے پاس خوشخبری لے کر پہنچ گیا تو آپ دفعتاً اس سے بگڑ گئے کہ اپنا استعفیٰ لغو کرنے کی ٹھان لی۔ یہ تو لڑکے بچوں والا مزاج ہوا۔ حالانکہ مغیرہ اپنے وقت کے صاحب رائے اور دانشمند اور مدبر کے چنیدوں میں تھے! بظاہر روایت کا یہی نا قابل فہم پہلو ہے جس کی بنا پر ابن کثیر نے اسے طبری ہی کے حوالے سے درج کرنے کے باوجود اس کا یہ پہلو اڑا دیا

والا جزو نکال کر بس یوں بیان کیا ہے کہ:

"... استعفیٰ منظور ہونے اور سعید بن العاص کا تقرر کیے جانے کی خبر سننے سے مغیرہ کو شدید پچھتاوا سا ہوا اس لیے وہ یزید کے پاس گئے۔[1]"

اور چونکہ ابن اثیر نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں صراحتاً لکھا ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب کی بنیاد اصلاً طبری کی روایات پر رکھی ہے اور بعض دوسری کی روایات سے مناسب اضافے کرتے ہیں اس لیے یہ سمجھنا غلط نہ ہوگا کہ اصل روایت تو ان کے سامنے بھی یہی ہو سکتی ہے مگر ابن کثیر کی طرح انہوں نے بھی اس کو اصل صورت سے پیش کرنے میں دقت محسوس کی تو اس کی اصلاح انھوں نے ابن کثیر سے بھی زیادہ کر دی۔ اور غالباً استعفے دے کر خود ہی نادم ہونے کو بھی حضرت مغیرہ جیسے ہوشمند اور پختہ کار سے بعید دیکھ کر اتنا ہی بیان کیا کہ اصل ارادہ سرکار کی طرف سے ہوا تھا کہ مغیرہ کو معزول کر کے سعید کا تقرر کر دیا جائے، مغیرہ کو اس کی بھنک پڑی تو وہ اس کی کاٹ کے لیے رضا استعفے لے کر پہنچ گئے اور استعفے کے ساتھ ساتھ یزید کے کان میں ولی عہدی کا افسوں بھی پھونک دیا جس کے نتیجے میں معاویہؓ کو اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ مغیرہ کو ان کے عہدے پر باقی رکھا جائے۔[2]

سوال یہ ہے کہ ایسی روایت کی وقعت کیا ہے جو ایسی ناقابلِ فہم ہو کہ طبری کا نام لیکر بیان کرنے والے بھی اس کو کافی ردو بدل کے بغیر بیان کے قابل نہ سمجھتے ہوں؟

ایک اور سوال

حضرت مغیرہ بن شعبہ کا انتقال معتبر روایات کے مطابق سنہ ۴۹ھ یا سنہ ۵۰ھ میں

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۸۰ [2] ابن اثیر کا بیان کردہ ماجرا کا پورا ترجمہ گذر چکا ہے۔

ہوتا آیا ہے؟ اب ذرا غور کیجیے کہ طبری کی روایت بھی ہے اگرچہ بہت مختصر طور پر[1] ابن الاثیرؒ نے تاریخ میں تفصیل سے بیان کیا ہے کہ مغیرہؓ بن شعبہ جب کوفہ واپس گئے تو حضرت معاویہ سے کیے ہوئے وعدے کے مطابق یزید کی ولی عہدی کے لیے زمین ہموار کرنے میں لگ گئے اور پھر وفد تیار کر کے دمشق بھیجے جو حضرت معاویہ سے جا کر درخواست کریں کہ آپ اپنے بعد کیلئے یزید کی ولی عہدی کی شکل میں بندوبست کر جائیں۔[2] لیکن یہ ساری روایتیں ۵۶ھ کے واقعات کے ذیل میں آتی ہیں جب باقاعدہ طور پر ۵۶ھ میں یزید کو ولی عہد سلطنت بنا دیا گیا اور اس کی تجویز دراصل مغیرہ بن شعبہ نے دی تھی اور اس طرح یہ قصہ پیش آیا تھا۔

سوال یہ ہے کہ یہ قصہ پیش آیا کب تھا؟ کس سنہ کی بات ہے؟ اور جس سنہ میں یہ قصہ پیش آیا کیا مغیرہ بن شعبہ مستعفی یا معزول کیے گئے اور پھر انہوں نے یزید کی ولی عہدی کی تجویز سے حضرت معاویہؓ کو خوش کر کے اپنا عہدہ بچا لیا؟ اس کا ذکر اسی سنہ کے واقعات میں کیا کہیں کیوں نہیں؟ جس سنہ میں یہ واقعہ پیش آیا تھا جو ظاہر ہے پچاس سے پہلے ہی کا کوئی سنہ ہو سکتا ہے جبکہ حضرت مغیرہ زندہ تھے، طبری اور ابن اثیر کے صفحات حکام کی معزولیوں، تقرریوں، مستعفیوں اور ترقیوں کے تذکروں سے بھرے ہوئے ہیں، حتیٰ کہ خود مغیرہ بن شعبہؓ کی ٹھیک اسی طرح کا ایک استعفیٰ دینے کا واقعہ بھی سنہ ۴۱ھ[3] کے واقعات میں موجود ہے۔ لیکن جس معزولی اور دوبارہ تقرری کا تعلق یزید کی ولی عہدی جیسے اہم واقعہ سے ہے اور پھر اس کے ساتھ حضرت مغیرہ کے بھیجے ہوئے وفد کا دمشق آنا جانا بھی جڑا ہوا ہے اس کا ذکر اور اس کے اہم متعلقات اور نتائج کا ذکر کہیں اس سنہ وقوعہ کے اندر نہیں ملتا۔ اس کے بعد اس ولی عہدی سے لوگوں کے اختلاف کی باتیں چلتی ہیں۔ بات حضرت حسینؓ اور حضرت ابن زبیرؓ کے خروج اور محاذ آرائی تک

---

[1] بدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۷۹، ابن اثیر ج ۳ ص ۲۰۳ بیان واقعات ۵۶ھ [2] طبری ج ۵ ص ۳۰۱
[3] ابن اثیر کے لیے دیکھئے ابن اثیر ج ۳ ص ۲۰۴ [4] دیکھئے طبری ج ۵ ص ۱۳۶–۱۳۷

جا پہنچی ہے۔ طرح طرح کی گفتگو میں ہیں تبصرے ہیں تنقید ہے تائید ہے کسی روایت میں بھی ہمیں حضرت مغیرہؓ کا نام اس سلسلے میں سننے کو نہیں ملتا۔ حالانکہ بالکل قدرتی بات تھی اگر کہیں حضرت سعدؓ کے ہی سر پر ایک بار پرسش کی سعادت کے سلسلے میں بینام آ جاتا کہ بجائے دو اور ایک غیر اصحابی کا تجویز کیا ہوا نام ہے اور وہ بھی ایسے اوصاف و فضائل رکھنے والا اسی طرح حادثۂ بے حکمتی تھا کہ اس ولی عہدی کی مخالفت کرنے والے ولی عہد سے اختلاف رکھنے والے اس کو اور اس کے باپ کو برا بھلا کہنے کے ساتھ وہ یہ نام اس تجویز پیش کرنے والے کو بھی شریک کرتے۔ سنہ ۵۶ھ کی ان روایات کے علاوہ جن کا ذکر اوپر کیا گیا کہیں سے کہیں تک آپ کو حضرت مغیرہؓ کا ذکر اس قضیے سے جڑا ہوا نہیں ملے گا۔ کیا سالے کا یہ بیان ساتھیوں کی راویت میں شک پیدا کرنے کا حق نہیں رکھتا۔

اصحاب سند کی بات

اور سند کے لحاظ سے بھی یہ روایت کوئی قابل اعتنا درجہ کی نہیں ہے۔ اس کے ایک راوی علی ابن مجاہد کے بارے میں ابن معین کا قول ہے کہ "کان یضع الحدیث" حدیثیں گھڑا کرتا تھا۔ (میزان الاعتدال ج ۳ ص ۱۵۱) جو شخص حدیثیں گھڑ سکتا ہو وہ تاریخی روایات میں کیا کچھ نہیں کر سکتا؟ حافظ ابن حجر تقریب التہذیب میں لکھتے ہیں کہ "متروک ہیں" اور "لیس فی شیوخ احمد اضعف منہ" (امام احمد کے شیوخ (اساتذہ) میں ان سے زیادہ ضعیف کوئی دوسرا نہیں ہے) (ج ۱ ص ۴۴)

باب چہارم

ولی عہدی کی راہ میں زیاد کا وجود رکاوٹ؟

یزید کی ولی عہدی کی تجویز کے سلسلے میں مورخین یہ بتاتے ہیں کہ یہ تجویز کرنے کے اصلی محرک گورنر مغیرہؓ بن شعبہ کے دماغ سے نکلی تھی اور حمایت کا دور حکومت کے صوبے پہنچی تھی۔ دیگر راوی ایک مزید بات اس سلسلے میں یہ بھی بتاتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ نے اپنے ایک دوسرے اہم گورنر زیاد سے بھی اس سلسلے میں رائے مانگی تھی اور اس نے جواب دیا کہ اس معاملے میں عجلت مناسب نہیں ہے بلکہ فی الحال اسکو التواء میں رکھنا اور موزوں موقع کا انتظار کرنا مناسب ہوگا۔ حضرت معاویہؓ نے یہ رائے بلا چون وچرا قبول کر لی۔ اس کے

۱؎ طبری ج ۲ ص ۱۷۰ زیاد بصرے کا گورنر تھا۔ اس کو زیاد بن ابیہ، زیاد بن سمیہ، زیاد بن ابی سفیان وغیرہ کئی ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ یہ ثقیف کے قبیلہ سے ایک کمزور آدمی تھا۔ مگر نہایت ہی ذہانت کے لحاظ سے عرب میں مشہور تھا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں اس کی صلاحیتیں نکھر کر شروع ہوگئی تھیں۔ اور حضرت عمرؓ نے اسے ابو موسیٰ بصرہ کے گورنر کا سیکرٹری بنایا تھا۔ حضرت علیؓ کا عہد آیا تو آپ نے اسے فارس کی گورنری دی۔ اور حضرت حسنؓ کی صلح کے بعد بھی ایک عرصہ تک اس نے سال بھر تک حضرت معاویہؓ کے اقتدار کو تسلیم نہیں کیا۔ آخر ۴۲ھ میں اطاعت قبول کر لی اور اصطخر میں رہائش کی اجازت حاصل کی۔ حضرت معاویہ اس سے اتنے خائف تھے (باقی اگلے صفحہ پر)

پھر ابن اثیر کی یہ بھی روایت ہے کہ۔ جب زیاد کا انتقال ہو گیا تو معاویہ نے

ثم دعا بکتاب	مجمع کو طلب فرما کر لوگوں کو ایک تحریر
فقرأه على الناس	تیار کر کے لوگوں کے سامنے پڑھی جو
باستخلاف یزید۔ ان حدث	یہ تھی کہ معاویہ کی موت واقع ہو جائے
به حدث الموت فیزید	تو یزید جانشین ہوگا جس پر سب لوگوں
ولی عهده فاستوثق له الناس	نے سوائے پانچ سرداروں کے
على بیعة یزید الا خمسة	یزید کی ولیعہدی کے لیے بیعت کا اقرار
نفر[1]	کر دیا۔

روایت کے الفاظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے حضرت معاویہ کو بس زیاد کی موت کا انتظار تھا۔ چنانچہ ابن اثیر اور ابن کثیر دونوں نے بھی تمام واقعات کو طبری کی طرح الگ الگ روایت میں توڑ کر نہیں بلکہ ایک تسلسل کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ زیاد کا مشورہ اور حضرت معاویہ کے یہاں اس کی مقبولیت نقل کرنے کے بعد استخلاف یزید کی از سر نو تحریک کو زیاد کی موت کے ساتھ بالکل اسی طرح جوڑ کے بیان کیا ہے جیسے بس زیاد کا وجود اس راہ میں رکاوٹ تھا وہ ہٹا تو حضرت معاویہ از سر نو سرگرم ہو گئے[2] حالانکہ زیاد کا انتقال باتفاق مورخین ۵۳ھ میں

(گذشتہ کا بقیہ) اگر [illegible] کے گورنر حضرت مغیرہ کو لکھ دیا اور ان کے ساتھ فلاں فلاں [illegible] معاویہ [illegible] کر دو کہ نماز با جماعت مسجد میں پڑھیں یعنی ہر وقت نگاہ میں رہیں، مگر زیاد جیسا آدمی بھی نہ دبا سکا اور حضرت معاویہ جیسے کاردان آدمی کو اپنا [illegible] نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ بالآخر دونوں قریب آئے اور ۵۳ھ میں زیاد کو پھر سے گورنری مل گئی پھر مسلسل زوال پایا حتی کہ ۵۳ھ میں انتقال کر گیا۔ (طبری ج ۶ ۔ ابن اثیر ج ۳ ۔ سیر اعلام النبلاء ج ۳)۔

[1] طبری ج ۶ ص [illegible] [2] ابن اثیر ج ۳ ص [illegible] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص [illegible]۔

ہو گیا تھا۔ جبکہ حضرت معاویہ کا یزید کی ولی عہدی کا وقت سنہ ۵۶ھ میں بتایا جاتا ہے۔ سنہ ۵۶ھ کے واقعات کے عنوان کے تحت طبری کے الفاظ ہیں۔

وفیہا دعا معاویۃ الناس	اسی سال سنہ ۵۶ھ میں معاویہ نے لوگوں کو
الی بیعۃ ابنہ یزید من بعدہ	اپنے بعد اپنے بیٹے یزید کی بیعت کی دعوت
وجعلہ ولی العہد[1]	دی اور اسے ولی عہد بنا دیا۔

اور تقریباً یہی الفاظ ابن کثیر اور ابن اثیر کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں۔

پس اول تو کوئی وجہ ایسی سامنے نہیں ہے جس کی بنا پر یہ سمجھا جائے کہ حضرت معاویہ زیاد کے ڈر سے اپنی دلی خواہش دبائے بیٹھے رہے۔ دوسرے اگر یہی وجہ تھا تو زیاد کا انتقال سنہ ۵۳ھ میں ہو جانے کے بعد سنہ ۵۶ھ تک مزید کون چیز انہیں روکے رہی؟ اور پھر کیا تک ہے کہ سنہ ۵۶ھ میں ہونے والے واقعہ کو اس انداز سے بیان کیا جائے کہ جیسے زیاد کی موت کے فوراً بعد ہی پیش آگیا تھا حالانکہ تین سال بعد سنہ ۵۶ھ میں پیش آئی؟

قرین قیاس بات

جہاں تک زیاد کے خوف کا سوال ہے وہ تو یقیناً ممکن بلکہ قرین قیاس ہے، کیونکہ زیاد کا حال معلوم ہی تھا لیکن تعجب ہے کہ اسے زیاد کی موت سے خواہ مخواہ ربط کر دیا جس سے یہ تاثر ہوتا ہے کہ بس زیاد ہی کا وجود رکاوٹ بنا ہوا تھا جس کی وجہ سے ولی عہدی کی تجویز ۔۔۔ اس وقت سرد خانے میں پڑی رہی۔ چنانچہ [illegible]

---

[1] طبری، ابن اثیر اور ابن کثیر تینوں کے یہاں اسی کا ذکر ہے۔ لیکن ابن کثیر نے سنہ ۵۶ھ کے واقعات میں یہاں انہوں نے زیاد کی وفات کے بعد حضرت معاویہ کا [illegible] بیان کیا ہے [illegible] کیسے ہی لکھ گئے کہ زیاد کی وفات اسی سنہ میں ہوئی تھی؟ [illegible] حضرت معاویہ [illegible] ص ۱۰۴

معاویہ پھر سرگرم عمل ہو گئے۔ یہ ربط ایک ذہنی دوری کا ربط ہے اور ناقابل قبول نظر آتا ہے۔ اس کے مقابلے میں کہیں قابل قبول یہ بات ہو سکتی ہے کہ ۵۵ھ میں اپنی عمر و صحت کے تقاضے سے حضرت معاویہ کو یہ خیال غالب ہوا ہو کہ انھیں اپنے بعد کے لیے انتظام میں مزید دیر نہیں کرنی چاہیے کیونکہ اس وقت ان کی عمر ستر سے اوپر ہو چکی تھی اور چار سال بعد ۶۰ھ میں ان کا انتقال بھی ہو گیا[1]۔ حضرت معاویہ کی سرگرمی کی جو تفصیلات اہل تاریخ نے لکھی ہیں ان میں صاف طور سے اس کا اشارہ پایا جاتا ہے بلکہ بعض کے بیانات میں تو صراحت کا درجہ ہے۔ مثلاً طبری میں ہے کہ جو پانچ آدمی یزید کی ولی عہدی سے متفق نہیں ہوئے تھے جن کا ذکر اوپر بھی طبری کی روایت میں آ گیا ہے۔ ان کو ہموار کرنے کے لیے حضرت معاویہ نے حجاز کا ایک سفر کیا تو ان میں سے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے بات چیت میں انھوں نے کہا کہ:

إنّي أرهب أن أدع الأمّة	مجھے ڈر ہے کہ کہیں میں امت محمد صلی اللہ
محمد بعدي كالضأن لا	علیہ وسلم کو اپنے بعد بکریوں کے ریوڑ
راعي لها[2]	کی طرح نہ چھوڑ جاؤں جس کا کوئی
	دیکھنے والا نہ ہو۔

اور ابن اثیر میں ہے کہ انھوں نے اپنے سفر سے پہلے مدینے کے گورنر مروان بن حکم کو لکھا کہ میں چاہتا ہوں کہ اپنے خلیفہ کے لیے کسی کو نامزد کر جاؤں، سو تم اس سلسلے میں اہل مدینہ کی رائے معلوم کرو۔ اس خط کا مضمون ابن اثیر میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ:—

---

[1] حضرت معاویہ کی عمر ۷۳ سال سے لے کر ۸۶ سال تک بتائی گئی ہے۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اکثر کے نزدیک اس وقت (موت کے وقت) ۸۲ سال تھی اور کہا گیا ہے کہ اسی سے اوپر تھی۔ اور یہی زیادہ مشہور ہے۔ البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۴۲۔ [2] طبری ج ۴ صفحہ ۲۲۶۔

انی قد کبرت سنی و دق	میری عمر زیادہ ہو چکی ہے اور ہڈیاں
عظمی وخشیت الاختلاف	گھل رہی ہیں ۔ اور مجھے ڈر ہے کہ
علی الامة بعدی وقد رأیت	امت میں میرے بعد اختلاف ہو اس
ان اتخیر لہم من یقوم	لیے ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنے بعد کیلئے
بعدی وکرہت ان اقطع	کسی آدمی کو طے کر دوں ۔ لیکن تمہارے
امرا دون مشورة من عندک	پاس جو لوگ ہیں ان کی رائے معلوم کئے
فاعرض ذالک علیہم	بغیر کوئی فیصلہ کر دینا مجھے
واعلمنی بالذی یردون	پسند نہیں ۔ پس تم میری بات ان
علیک ۔ ؎	لوگوں پر پیش کرو اور ان کے جواب
	سے آگاہ کرو ۔

ایک اور فائدہ

ابن اثیر کی اس عبارت سے جہاں ہمارے اس بیان کو دلیل ملتی ہے کہ سنہ ۵۰ھ میں حضرت معاویہؓ یزید کی ولی عہدی کے لیے جو سرگرم ہوئے وہ اس لیے نہیں تھا کہ زیاد کا انتقال ہو جانے سے راستہ صاف ہو گیا تھا بلکہ ضعیف العمری اور اپنے وقت کے قریب پہنچنے کا احساس اس کا باعث ہوا تھا ۔ اسی کے ساتھ ابن اثیر کی بیان کردہ ان دیگر روایات کی تردید یا تضعیف کا سامان بھی ۔ ابن اثیر کی اس مذکورہ بالا روایت سے پہلے جو یزید کی ولی عہدی کے سلسلے میں حضرت مغیرہ بن شعبہ کے متعلق ان کی کتاب میں ایک ہی صفحہ پہلے درج ہوئی ہیں اور اس جلیل القدر صحابی کی مضحکہ خیزی کا سامان بن رہی ہیں

گزشتہ صفحات میں ہم نے ان روایتوں کی طرف اشارہ کیا تھا تفصیل نہیں دی تھی ۔ ان روایتوں کے مطابق حضرت مغیرہ جب یزید کی ولی عہدی کی تجویز سے حضرت

؎ ابن اثیر ج ۳ ص ۲۵۱

معاویہ کو خوش کر کے کوفے کی امارت پر اس وعدے کے ساتھ واپس ہوئے کہ کوفے والوں کو اس تجویز سے متفق کرنا میرا کام ہے تو پھر حضرت نے یہاں سے ایک وفد بھی تیار کر کے حضرت معاویہ کے پاس اپنے لڑکے کی سرکردگی میں دمشق بھیجا تھا جو چالیس آدمیوں پر مشتمل تھا۔ اس وفد نے یزید کے بڑے گیت گائے اور حضرت معاویہ پر زور دیا کہ ولی عہدی کا تاج بس اب یزید کے سر پر رکھ دیں۔ ان لوگوں کو مناسب جواب دینے کے بعد حضرت معاویہ نے ابن مغیرہ سے پوچھا کہ تمہارے باپ نے کتنے میں ان سب کا دین خریدا؟ صاحبزادے نے جواب دیا "تیس ہزار درہم میں"۔ ایک دوسری روایت کے مطابق "چار سو دینار میں"۔

یہ مضحکہ خیز واقعات ہو چکے ہوں اور پھر بھی حضرت معاویہؓ مروان کو ایسے الفاظ میں خط لکھیں جیسے کہ ولی عہدی کے سلسلے میں کوئی بات کبھی اس سے پہلے ہوئی ہی نہیں کیا یہ کوئی سمجھ میں آنے والی بات ہے؟ مروان تو اموی خاندان کے آدمی تھے۔ اگر یزید کی ولی عہدی کی تجویز پہلے کسی طرف سے ہو چکی ہوتی اور اس کی تائید کیلئے کہیں سے وفود بھی آ چکے ہوتے تو کہاں ممکن تھا کہ حضرت معاویہ اس معاملے میں مروان کو بالکل انجان سمجھ کر خط لکھتے؟

باب پنجم

ولی عہدی کی بیعت اور اس کے مخالفین کا قصہ

اوپر طبری کی روایت گزری ہے کہ جب یزید کی ولی عہدی پر پانچ حضرات کے سوا اور سب نے اتفاق کر لیا تھا۔ اس کے بعد کی روایت میں ان پانچ حضرات کے نام طبری نے یہ دیئے ہیں :۔

حسین ابن علی۔ عبداللہ بن عمر۔ عبداللہ بن زبیر۔ عبدالرحمٰن بن ابی بکر
عبداللہ بن عباس (رضی اللہ تعالیٰ عنہم)

مگر اس ایک ابتدائی روایت کے سوا حضرت عبداللہ بن عباس کا نام اس اختلاف کے سلسلے میں کہیں نہیں ملتا۔ صرف باقی چار نام مختلف موقعوں پر ادھر ادھر آتے ہیں[1] حتیٰ کہ خود اس روایت میں جو آگے بیان ہوا ہے کہ حضرت معاویہ نے ان میں سے ہر ایک سے الگ کر کے بات کی اور وہ بات کی۔ انہی چار کے بعد پانچویں عبداللہ بن عباس سے حضرت معاویہ کی کوئی بات نقل کرنے کے بجائے یہ لکھا ہوا ہے کہ "قال ولم یذکر ابن عباس" جس کا مطلب ہے کہ روایت کے اصل اور بنیادی راوی نے جو ایک مجہول اور نا معلوم الاسم

---

[1] مثلاً حضرت معاویہ کی جو وصیت یزید کے لیے بیان کی گئی ہے اس میں بھی یہی چار نام اس حیثیت سے مذکور ہیں کہ ان لوگوں کی طرف سے تم کو اختلاف کا سامنا ہو سکتا ہے۔ طبری ج ۶ ص ۱۷۹۔

شخصیت مجہول ہے۔ "مخلد" یہی ان سے روایت کرنے والے صاحب جن کا نام ابن ابو ہے وہ کہتے ہیں کہ مخلد کے صاحب نے بات چیت کے بیان کے سلسلے میں ابن عباس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ یہ بیان کے شروع میں اختلاف کرنے والوں کے جو نام انہوں نے گنائے تھے ان میں تو ابن عباس کا نام تھا۔ مگر ان حضرات سے حضرت معاویہؓ کی گفتگو کا جو قصہ بیان کیا اس میں پھر حضرت ابن عباس کا کوئی تذکرہ نہیں آیا۔ پس اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا نام کسی غلطی سے آ گیا ہے۔ آنا نہیں چاہیے تھا۔ اور بظاہر یہی وجہ ہے کہ ابن اثیر جو طبری کے حرف بحرف مقلد ہیں انھوں نے بھی اس قصے کے بیان میں پہلا وہی نام دیے ہیں حضرت ابن عباس کا نام ان کے بیان میں بھی نہیں تھا۔ ابن کثیر نے البتہ ان کا نام بھی طبری کی پیروی میں باقی رکھا ہے۔ واللہ اعلم کیونکر ؟

نہ صرف ابن عباسؓ بلکہ ابن ابوبکرؓ بھی !

بہر حال ابن عباس کا ذکر اس فہرست میں قطعی طور پر غلط ہے اور صرف ابن عباسؓ کا نام نہیں غلط ہے بلکہ عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کا نام بھی محل نظر ہے کہ آیا تاریخی اعتبار سے یہ نام ۵۶ھ کے واقعات کی فہرست میں شامل ہو سکتا ہے یا نہیں ! حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کا سن وفات عام طور پر ۵۳ھ مانا گیا ہے۔ خود ابن اثیر کی یہ روایت ہے چنانچہ اختلافی گفتگوؤں کا یہ بیان جو قصہ پورے ڈھائی صفحے میں بیان کرنے کے بعد آخر میں وہ یہ لکھنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ،

وذکر عبد الرحمن بن ابی بکر	اس قصے میں عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ
لا یستقیم علی قول من یجعل	کا ذکر ان لوگوں کے قول کے مطابق

مخنف نامی مخلد کے ایک صاحب۔ معجم البلدان میں مخلد نام کے دو مقام ہیں۔ ایک مخلد تہامہ اور دوسرا مخلد محمود [illegible] ۵۸ صفحہ ۲۴ [illegible] والفتراعلم بیان کر کے [illegible] ہے۔ [illegible]

وفاته سنة ثلاث وخمسين	ٹھیک نہیں بلکہ جو ان کا سنہ وفات
وانما يصح في قول من يجعلها	۵۳ھ بتاتے ہیں۔ بلکہ ان لوگوں
بعد ذالك الزمن[1]	کے قول پر ٹھیک بیٹھے گا جو ان کا
	سنہ وفات اسکے بعد بتاتے ہیں۔

ہمارے سامنے جو کتابیں ہیں ان میں حضرت ابن کثیر کی البدایہ والنہایہ میں یہ قول ملتا ہے کہ حضرت عبد الرحمن بن ابی بکر کا سن وفات ۵۳ھ ہے اور اس کو وہ "کثیر من علماء التاریخ" کا قول بتلاتے ہیں مگر نام کسی ایک کا نہیں دیتے۔ جبکہ اس کے مقابل ۵۶ھ کے قول میں واقدی کا نام ہے محمد بن سعد کا نام ہے اور ابو عبید وغیرہ کا نام ہے[2] اس "وغیرہ" میں ہم ابن قتیبہ کی المعارف کا اضافہ کرتے ہیں[3]

اور خود ابن کثیر کی البدایہ والنہایہ ہی میں اس کا ایک مضبوط قرینہ پایا جاتا ہے کہ ۵۳ھ کا قول صحیح نہیں ہے۔ اور وہ قرینہ یہ ہے کہ ۵۸ھ کے وفیات ہی میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کا نام بھی آتا ہے۔ چنانچہ بھائی بہن کے یہ دونوں نام البدایہ والنہایہ میں پہلو بہ پہلو موجود ہیں اور اس کے ساتھ حضرت عبد الرحمن کے تذکرۂ وفات میں یہ بتاتے ہوئے کہ ان کی وفات مکے کے راستے میں مکے سے ۶ یا ۱۲ میل کے فاصلہ پر ہوئی تھی جہاں سے ان کو مکے لے جایا گیا اور بالائی مکہ میں دفن کیا گیا۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ:

OBIRGAXIES

فلما قدمت عائشة مكة	پس جب حضرت عائشہؓ مکہ آئیں تو قبر
زارته وقالت لو شهدتك	پر گئیں اور کہا کہ میں اگر تمہاری
لم ابك عليك ولو كنت عندك	موت کے وقت موجود ہوتی تو

---

[1] ج ۸ ص ۲۵۲ [2] ص ۸۰، ص ۹۵ طبع مطبعۃ السعادۃ مصر [3] ص ۹۲
طبع اول مطبعہ اسلامیہ الازہر قاہرہ۔

لما انتقلت من مرض الذی　　ورفتی ہو کر اس جگہ سے منتقل ہوئی
ملک نبه　　ہو کر آپ بھائی کے پاس نہ رہتے رہے
بھائی تھی۔

اس عبارت سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ حضرت عائشہؓ نے بھائی عبدالرحمن کی خبر وفات سن کر یہ کہی تھیں بلکہ عبارت کا تقاضا ہے کہ یہ خود ان کا کہا ہوا اور بھائی کی قبر پر کہی گئی تھیں۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد تو ازواج مطہرات کا مکے جانا اگر ہوتا تھا تو صرف حج کے لیے ہوتا تھا۔ ۵۳ھ میں حج کا موسم حضرت عائشہؓ نے پایا نہیں۔ اس لیے کہ ان کی وفات کا مہینہ رمضان ہے اور بقول بعض شوال قرار دیا گیا ہے جیسا کہ البدایہ والنہایہ کے حاشیہ میں گذر چکا ہے۔ پس اگر یہ واقعہ ہے کہ حضرت عائشہؓ اپنے بھائی عبدالرحمن کی قبر پر گئیں تو ضروری ہے کہ حضرت عبدالرحمنؓ کی موت ۵۳ھ کے حج سے پہلے کا واقعہ ہو۔ پس اس لیے ۵۳ھ میں وفات نہیں ہو سکتا۔

بہر حال یہ بات مشکوک ہے کہ ۵۳ھ میں یزید کی ولی عہدی سے اختلاف کرنے والے حضرات میں عبدالرحمن بن ابی بکرؓ بھی ہوں۔ ہاں اگر الاصابہ فی تمییز الصحابہ والے ابن حجرؒ کی روایت صحیح ثابت ہو جائے جس کے مطابق حضرت عبدالرحمن کا سنہ وفات ۵۸ھ ہوتا ہے اور وفات کا سفر حضرت معاویہ سے گفتگو کے بعد پیش آیا ہو تو پھر یہ بیان صحیح ہوگا کہ حضرت عبدالرحمن بن ابی بکرؓ بھی ان حضرات میں شامل تھے جنہوں نے یزید کے لیے ولی عہدی کی بیعت سے انکار کیا۔ مگر اس گفتگو کا کیا کیجئے کہ اس روایت کے مصنف ابن حجرؒ اس روایت کی تائید میں حضرت ابن سعد وغیرہ کا بیان پیش کرتے ہیں۔ اس میں جو بات یہ ہے کہ حضرت عبدالرحمن کا انتقال اسی سال ہوا جس سال

۱؎ البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۹۴ ۔ ۲؎ [illegible] صفحہ [illegible] ۔ ۳؎ الاصابہ جلد ۲ صفحہ ۴۰۸ ۔ ابن حجر کی [illegible]
اس روایت میں حضرت عائشہؓ کے سفر حج کی بابت یہ صراحت بھی پائی جاتی ہے کہ حضرت [illegible] کا سفر حج

حضرت معاویہ یزید کی ولی عہدی کے سلسلے میں حجاز آئے تھے وہیں یہ بھی ہے کہ۔

وفات عائشۃ بعدہ بسنۃ اور عائشہؓ کا انتقال اس کے ایک سال بعد
سنۃ تسع وخمسین۔ پر ۵۹ھ میں ہوا۔

یعنی اب حضرت معاویہ کے سفر کا سنہ ۵۶ھ کے بجائے ۵۸ھ ہو گیا حالانکہ وہ قطعی طور پر سنہ ۵۶ھ ہے۔

بہتر ہے کہ اس گنجلک مسئلے کو اب چھوڑ دیا جائے کیونکہ اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں کہ عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ اس واقعہ میں شریک تھے یا نہیں شریک تھے۔ مسئلے میں چونکہ شک کا پہلو سامنے آگیا تھا اس لیے ایک طالب علمانہ خواہش یہ تھی کہ صفائی ہو جائے مگر معلوم ہوا کہ آسان نہیں ہے۔ مزید کافی وقت لگ سکتا ہے جس کی گنجائش سر دست نہیں۔ اس لیے اس ضمنی مسئلے کو چھوڑ کر اب ہم اصل مسئلے پر آتے ہیں یعنی خلافت کی جو کہانیاں اس بیان کے سامنے ہیں دیکھا جائے کہ ان میں کہاں تک صداقت ہے۔

ابن کثیر کا بیان

اختلاف کی کہانی کا بیان اس روایت میں بھی ہے جس کا ذکر ابھی اوپر اس عنوان سے گزرا ہے کہ اس کے بنیادی راوی ایک نامعلوم شخص ہیں جنہیں متعدد حوالوں کے ایک صاحب کے نام سے ذکر کیا گیا ہے۔ مگر اس روایت والی کہانی میں ایک تشنگی سی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کہیں بیچ سے شروع کر دی گئی ہے اور شروع کی کچھ کڑیاں رہ گئی ہیں۔ اس تشنگی کو ابن کثیر کا بیان دور کرتا ہے۔ اگرچہ اس میں اختصار ہے اس لیے ہم ابن کثیر کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ زیاد کے مشورے کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:-

" پس جب زیاد کا انتقال ہو گیا ـــــ اور یہ اسی سن کی

ات ہے[1] معاویہ نے ولی عہدی کے لیے کارروائی شروع کر دی۔ یزید کے لیے بیعت لے لی اور تمام اطراف میں اس کے لیے لکھا۔ پس مملکت کی تمام اقلیموں میں لوگوں نے بیعت کر لی سوائے عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ اور عبداللہ بن عمرؓ حسین بن علیؓ عبداللہ بن زبیرؓ اور ابن عباسؓ کے۔ اس پر معاویہ نے عمرے کے طور سے مکہ کا سفر کیا اور مکہ سے لوٹتے ہوئے جب ان کا گزر مدینے میں ہوا تو انہوں نے ان پانچوں میں سے ہر ایک کو الگ الگ بلایا اور ڈرایا دھمکایا۔ سو ان سب میں سب سے زیادہ سخت جواب دینے والے عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ تھے اور سب سے زیادہ نرم کلام والے عبداللہ بن عمرؓ۔ پھر معاویہ نے ایک خطبہ دیا۔ اس وقت یہ پانچوں ان کے منبر کے نیچے موجود تھے۔ اس خطبے کے بعد لوگوں نے یزید کی ولی عہدی کی بیعت کی۔ یہ پانچوں بیٹھے رہے۔ انہوں نے موافقت کی اور نہ کوئی اختلاف ظاہر کیا۔ اس لیے کہ یہ ڈر سے دھمکائے جا چکے تھے۔ پس ساری مملکت میں یزید کی باقاعدہ بیعت ہو گئی اور تمام علاقوں سے وفد اس کی تہنیت کے لیے یزید کے پاس پہنچے۔[2]

طبری کی روایت

طبری کی روایت میں اس بیان کا اول و آخر نہیں ہے۔ صرف وہ مکالمہ ہے جو حضرت معاویہ اور ان اختلاف کرنے والے حضرات کے درمیان ہوا، جس کی تفصیل ابن کثیر نے نہیں دی محض حوالہ دیا ہے۔ وہ مکالمہ یہ تھا:-

"جب معاویہ آئے تو انہوں نے حسین بن علیؓ کو بلایا اور کہا کہ بھتیجے! سوائے

---

[1] یہ عبارت [illegible] گر گئی ہے اور ہم اس پر تنبیہ کر چکے ہیں کہ یہ سبب راوی کا سن وفات [illegible] ہے۔

[2] البدایہ والنہایہ ج ۸ صفحہ ۷۹۔

بھی پانچ آدمیوں کے جن کی قیادت تم کرتے ہو" اور سب لوگ اس معاملے میں متفق ہو چکے ہیں" رہا اگر اس اختلاف کی تمہیں کیا ضرورت پیش آ گئی ہے؟ حسینؓ نے جواب میں پوچھا: "میں ان کی قیادت کر رہا ہوں؟" کہا "ہاں تم قیادت کر رہے ہو۔" حسین نے کہا "اچھا تو ان کو آپ بلا بھیجئے۔ وہ اگر بیعت کر لیں تو آپ دیکھیں گے کہ میں بھی ان میں کا ایک ہو جاؤں گا ورنہ پھر آپ میرے بارے میں تیزرو نہ ہوں۔" معاویہ نے کہا "تم ایسا کرو گے؟" کہا "ہاں بالکل۔" اس پر معاویہ نے ان سے اقرار مانگا کہ وہ اس بات چیت کو کسی پر ظاہر نہیں کریں گے۔ حسین نے بچنے کی کوشش کی۔ مگر بالآخر قول دے دیا۔ وہ نکلے تو راستے میں ابن زبیر کا ایک آدمی [illegible] تھا۔ اس نے کہا کہ آپ کے بھائی ابن زبیر پوچھتے ہیں کہ جناب یہاں سے کیا بات چلی ہے؟ حسین نے چھپانا چاہا مگر اس آدمی نے پیچھے پڑ کے کچھ کچھ ان سے نکلوا ہی لیا۔ حسین کے بعد معاویہ نے ابن زبیر کو بلوا بھیجا اور ان سے بھی یہی بات ہوئی۔ جو حسین سے معاویہ نے کہا تھی وہی ابن زبیر سے کہا اور جو جواب حسین نے دیا تھا بالکل وہی ابن زبیر نے دیا۔ معاویہ نے ان سے بھی اقرار مانگا کہ کسی کو بتائیں گے نہیں۔ ابن زبیر نے اس پر کہا "امیر المومنین ہم آپ حرم الٰہی میں ہیں[1] اور یہاں آپ سے اقرار گویا اللہ سے اقرار ہے۔ یہ بڑی بھاری بات ہے، میں یہ نہیں کر سکتا ہوں۔" اس کے بعد وہ گئے تو عبداللہ بن عمر کو بلایا گیا۔ ان سے معاویہ نے نرم بات کی۔ ان سے کہا کہ "دیکھو میں ڈرتا ہوں کہ اپنے بعد امت محمدؐ کو ان بکریوں کی طرح چھوڑ جاؤں جن کا کوئی گڈریا نہ ہو۔ اور تمہیں معلوم ہے کہ سب لوگ بیعت کر چکے ہیں

---

[1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکہ مکرمہ کا واقعہ ہے۔

صرف دو باپ کی نظربازی ہیں جن کی بغاوت تم کرتے ہو۔ آخر تمہیں کیا ضرورت پیش آ گئی ہے؟" ابن عمر نے جواب دیا کہ میں تمہیں اس مقصد کی ایسی صورت بتاؤں کہ جس سے کوئی برائی بھی نہ ہو اور امت میں تفرقہ و فساد کا سد باب بھی ہو جائے" کہا ضرور بتاؤ۔ کہا تم مجمع میں بیٹھو میں آؤں گا اور اس بات پر تمہاری بیعت کروں گا کہ تمہارے بعد جس شخص پر بھی امت متفق ہو گی میں اس سے بیعت کروں گا اگرچہ وہ ایک حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو" معاویہ نے کہا "تم ایسا کرو گے؟" کہا بے شک۔ اس کے بعد وہ اپنے گھر میں قیام گاہ پر آ گئے اور عبدالرحمن بن ابی بکر کو بلوایا اور کہا کہ ابن ابی بکر تم کس برتے پر میری مخالفت کے پیچھے ہو؟ ابن ابی بکر نے جواب دیا میں اس میں خیر دیکھتا ہوں؛ کہا میں تمہیں قتل کر دوں گا، جواب ملا کہ اگر تم نے ایسا کیا تو تم پر دنیا میں خدا کی لعنت ہو گی اور آخرت میں دوزخ تمہارا ٹھکانہ۔" ابن عون کہتے ہیں خبر دینے والے نے (یعنی اسی شخص نے) ابن عباس کا کوئی ذکر اس مکالمے کے سلسلے میں نہیں کیا۔[1]"

ایک سوال اور اس کا حل

طبری کی اس روایت کو پڑھ کر لازماً یہ سوال پیدا ہونا چاہیے کہ عبدالرحمن بن ابی بکر کی کیا خصوصیت تھی کہ ان سے حضرت معاویہ نے بہت کڑے اور کڑوے الفاظ میں بات کی۔ جب کہ دیگر افراد کے ساتھ ان کا انداز گفتگو یہ نہیں تھا؟ اس سوال کا کچھ حل شاید ابن اثیر کے بیان سے نکلے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب زیاد کی موت کے بعد معاویہ نے یزید کے لیے ولی عہدی کی بیعت حاصل کرنے کا عزم کر لیا تو سب سے پہلے تو انھوں نے

---

[1] طبری ج ۶ ، ص ۱۷۰ ۔

عبداللہ بن عمر کو ہموار کرنے کی کوشش کی جس میں ان کو ناکامی ہوئی۔ عبدالملک نے کے گورنر مروان بن حکم کو لکھا کہ:

"میری عمر بہت ہو گئی ہے، ہڈیاں کھوکھلی ہو رہی ہیں اور مجھے ڈر ہے کہ میرے بعد امت میں اقتدار کے مسئلے پر اختلاف رونما ہو۔ اس لیے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اپنے بعد کے لیے کسی کو ولی عہد نامزد کر جاؤں، لیکن میں یہ نہیں پسند کرتا کہ یہ کام ان لوگوں کے مشورے کے بغیر کر جاؤں۔ تمہارے پاس جو اہل مدینہ ہیں تم میری بات ان کے سامنے رکھو اور ان کے جواب سے مجھے آگاہ کرو۔" چنانچہ مروان نے یہ مسئلہ اہل مدینہ کے سامنے رکھا اور ان لوگوں نے جواب دیا کہ ہاں بالکل مناسب بات ہے ہم بھی پسند کریں گے کہ وہ اپنے لیے کسی کو نامزد کر دیں اور اس میں کوتاہی نہ کریں۔ مروان نے یہ مسئلہ حضرت معاویہ کو لکھ دیا۔ وہاں سے جواب میں یزید کا نام آیا۔ مروان نے لوگوں کو جمع کر کے بتایا کہ امیر المومنین نے آپ کے لیے پوری خیر خواہی کے ساتھ اپنے فرزند یزید کو اپنے بعد کے لیے انتخاب کیا ہے۔ یہ سن کر عبدالرحمن بن ابی بکر کھڑے ہو گئے اور بولے کہ مروان تم بھی جھوٹے اور معاویہ بھی جھوٹے۔ تم دونوں کی نیت اس انتخاب میں امت محمدیہ کے ساتھ بھلائی کی نہیں بلکہ تم لوگوں کی نیت یہ ہے کہ خلافت کو ہرقلیت بنا دو کہ ایک ہرقل مرا تو دوسرا آ گیا ..... اس طرح حسین بن علی، عبداللہ بن زبیر اور عبداللہ بن عمر نے بھی اس تجویز کی مخالفت کی۔ بعد مروان نے پھر اس کی اطلاع معاویہ کو دی۔[1]

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبدالرحمن کے ساتھ حضرت معاویہ کی شدت کے پس منظر میں حضرت عبدالرحمن کی یہ شدت تھی جو ابن اثیر کی مذکورہ بالا روایت میں نظر آتی ہے۔

---

[1] [illegible] جلد ۳ صفحہ ۲۵۰

جبکہ دوسروں (حضرت حسین وغیرہم) نے یہ شدت نہیں اختیار کی تھی۔ یہ واقعہ پہلے پیش آچکا تھا اس کے بعد حضرت معاویہ نے عمرہ کا سفر کیا ہے۔ شاید اسی لیے حضرت عبدالرحمٰن کے ساتھ ان کا انداز گفتگو تلخ تھا۔

وفود کی کہانی

ابن اثیر ہی کے بیان سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مروان کو جب حضرت معاویہ نے یزید کا نام اپنے ولی عہد کی حیثیت سے مدینہ بھیجا تھا کہ اس کے بارے اہل مدینہ کی منظوری حاصل کریں تو ساتھ ہی یہ بھی ہدایت کی تھی کہ مدینے سے کوئی وفد بھی اس منظوری کے اظہار کے طور پر دمشق آجانا چاہیے۔ اور اسی طرح دوسرے گورنروں کو بھی ان کے علاقے سے متعلق لکھا تھا۔ چنانچہ یہ وفود پہنچے۔ ابن اثیر نے ان میں سے خاص طور پر دو[1] کا ذکر کیا ہے۔ ایک اہل مدینہ کا وفد جس میں سے محمد بن عمرو بن حزم کا نام دیا گیا۔ دوسرا اہل بصرہ کا وفد جس میں احنف بن قیس کا نام مذکور ہوا ہے۔

ابن اثیر نے ان وفود کے اجتماع کی کارروائی جس طرح دی ہے اس سے یہ تاثر ہوتا ہے کہ اس اجتماع سے جو مقصد حضرت معاویہ کا تھا کہ یزید کی ولی عہدی پر تمام مملکت کے نمائندوں کی مہر اتفاق ثبت کرا لی جائے۔ یہ مقصد اس اجتماع سے تو حاصل نہیں ہو سکا بلکہ ایک انتشار کی کیفیت کے ساتھ اجتماع برخاست ہوا۔ البتہ بعد میں حضرت معاویہ نے لطف و عطا اور ملاقات کے ذریعہ لوگوں کو ہموار کیا اور اکثر سے یزید کی ولی عہدی پر بیعت حاصل کر لی[2] اور اس کے بعد حجاز کا سفر کیا تاکہ یہاں جو لوگ بیعت سے انکار کر رہے تھے ان کا انکار ختم کرایا جائے۔ انھیں سمجھایا جائے کہ اب جب کہ اور سب ہی لوگ متفق ہو چکے تو چند کا اختلاف جاری رہنا مناسب نہیں

---

[1] ابن اثیر ج ۳ ص ۲۵۰ [2] ایضاً ص ۲۵۱

یہاں مضمون میں یہی روداد طبری کے تتبع البدایہ والنہایہ کے حوالے سے اوپر پڑھی جا چکی ہے۔

سوالیہ نشان ؟

یہ بات کوئی ناممکن نہیں ہے کہ خود کا اجتماع ناکام رہا ہو اور باوجودیکہ اس کا تمام تر کام حضرت معاویہ نے ملامات، دھمکیوں اور ترغیبات سے کیا ہو۔ ایک آدمی اگر حضرت معاویہ سے حسن ظن رکھتا ہے تو وہ اس بارے میں بلا کسی دقت کے یوں سوچ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ انھوں نے نیک نیتی سے اور اچھے مقصد سے کیا تھا لیکن اجتماع کی جو روداد ابن اثیر نے بیان کی ہے اس کا منطقی تقاضا یہ ہے کہ اجتماع اپنے مقصد کے اعتبار سے کامیاب رہا ہو نہ کہ ناکام۔ جبکہ دارات و دھمکیات سے کام لینے کی بات جو انھوں نے بلا کسی ثبوت، استدلال اور حوالے کے صرف ایک فقرے میں بیان کر دی ہے وہ اپنے پیچھے کسی وزن کا تقاضا نہیں کرتی۔ بلکہ داد و دہش کا جو تنہا ایک واقعہ انھوں نے اس قصے کے بالکل آخر میں بیان کیا ہے وہ تو اس بات کا ثبوت ہے کہ داد و دہش سے یہ کام نہیں بنا۔

اجتماع کی روداد جو ابن اثیر نے بیان کی ہے وہ یہ ہے:-

ثم قال معاویة للضحاک — پھر جب وہ سب جمع ہو گئے تو معاویہ نے

بن قیس الفہری لما اجتمع — ضحاک بن قیس سے کہا کہ میں [illegible]

لہٰذا [illegible] یزید کی ولی عہدی کا ارادہ کیا تو حضرت عبداللہ بن عمر کو ایک لاکھ درہم بھیجے جو انھوں نے یہ شبہ ہونے کے باعث لینے سے انکار کر دیا کہ یزید کی ولی عہدی کے سلسلے میں رشوت ہے۔ ۱۹۳

[illegible] ہیں۔ بعض ماخذ کی روایت بھی اس سے ہے حضرت معاویہ کے حامی [illegible] حامیوں پر [illegible] اس اجتماع کے وقت کو دیکھ گزرے تھے [illegible]

الوفود عنده . فإني متكلم فإذا
سكتُّ فكن أنت الذي
تدعو إلى بيعة يزيد وتحثني
عليها فلما جلس معاوية
للناس تكلم في عظم أمر الإسلام
وحرمة الخلافة وحقها وما
أمر الله به من طاعة ولاة
الأمر ثم ذكر يزيد وفضله
وعلمه بالسياسة وعرض
ببيعته فعارضه الضحاك
فحمد الله وأثنى عليه ثم
قال: يا أمير المؤمنين إنه
لا بد للناس من والٍ بعدك
وقد بلونا الجماعة والألفة
فوجدناهما أحقن للدماء
وأصلح للدهماء وآمن

پھر کہا کہ جب میں خاموش رہوں
تو تم کھڑے ہو کر یزید کی بیعت کی تحریک
کرو اور مجھے اس کے لیے ترغیب دو
پس جب معاویہ خطاب کرنے بیٹھے
تو اسلام کی عظمت خلافت کی حرمت
اور (SANCTITY) اس کا حق اور
اولی الامر کی اطاعت کے بارے میں اللہ
کے احکام بیان کیے پھر یزید اور اس
کی خوبیوں کا بالخصوص اس کی سیاسی
شعور اور آگاہی کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کی
بیعت کا مسئلہ پیش کیا۔ اس کے بعد
ٹھیک اسی انداز سے ضحاک بولے
حمد و ثنا کے بعد کہا کہ امیر المومنین لازم
ہے کہ آپ کے بعد کے لیے حاکم
مقرر کیا جائے ہم نے جماعت اور
یکجہتی آزمائی ہے جس کو ہم نے

(ترجمہ شیعہ سنی ۱۰۲) ضحاک بن قیس [illegible] حضرت معاویہ [illegible]
[illegible] حضرت معاویہ [illegible]
[illegible]
[illegible] مروان کے مقابلے میں حضرت ابن زبیر کی طرف سے جنگ کرتے ہوئے شہید ہوئے

البدایہ ج ۸ صفحہ ۲۹۶ ، سیر اعلام النبلاء ج ۳ صفحہ ۲۴۱ ۔

فسیروا وخیرٌ فی العاقبة — آتی ہیں کہ اس نے بہادروں کی حفاظت
ولا یہام عزٌ ثم روا جمع بالله — ہے ہمارا سو سال کا امن ہے اور
کل یوم هو فی شأن ویزید — عاقبت کی بھلائی ہے۔ نماز کی [illegible]
بن امیر المؤمنین [illegible] — درکار ہم سب پر [illegible] ہے
[illegible] رقصد سیرته — اللہ کی شان ہے [illegible] زندگی میں [illegible]
علی ما علمت وهو من — ہوں کہ یزید بن امیر المومنین اس کام
اعلمنا صلةً وصلتنا وحلمًا — کے لیے نہایت موزوں ہیں [illegible]
[illegible] لولم [illegible] — حسن سیرت کا [illegible] آپ پر عیاں [illegible]
اجمله [illegible] — نیز علم اور دانش میں وہ ہم سب
[illegible] — فائق ہیں۔ پس ان کو اپنے بعد کے لیے
[illegible] فی ظلمه وتکلم عمرو — عمرو کے جانے کے لیے ایک نشان
من سعید [illegible] — [illegible] کا انتظام [illegible]
من ذلک الشام یزید — [illegible] اور سامنے میں [illegible]
[illegible] — پھر [illegible] سعید [illegible]

---

۱ یہ کتاب دستیاب نہیں ہو سکی۔ بعض [illegible] شمار کیا ہے [illegible] ابن اثیر [illegible]
الاول من سلوات السلاطین من الکتاب التمیمی [illegible] کے [illegible]
کے [illegible] حضرت عثمان کی [illegible] حضرت عثمان [illegible] کے گزرے ہیں [illegible]
صاحب کے زمانے میں [illegible] ۳۳ [illegible] سعید [illegible]
[illegible] معلوم [illegible]۔ [illegible]
[illegible] کے گزرے [illegible]۔ [illegible] غالباً [illegible]
کے وقت [illegible] میں انتقال
کے بعد انہیں کوئی جگہ [illegible] دی گئی ہو۔

هذا امیر المؤمنین واشار	اور کچھ یہ باتیں انہوں نے بھی کہیں ۔
الی معاویۃ فان ہلک فہذا	اس کے بعد یزید بن مقنع عذری کھڑے
واشار الی یزید ومن ابی	ہوئے اور معاویہ کی طرف اشارہ کر کے
فہذا واشار الی سیفہ	بولے یہ امیر المومنین ہیں ان کو اگر
فقال معاویۃ اجلس فانت	کچھ ہو جائے تو یزید کی طرف اشارہ
سید الخطباء وتکلم من	کر کے بولے کہ یہ ہیں۔ اور اس
حضر من الوفود فقال معاویۃ	کے بعد اپنی تلوار کی طرف اشارہ کیا
للاحنف ما تقول یا ابا بحر	کہ جو انکار کرے اس کے لیے یہ ہے
فقال نخافکم ان صدقنا	معاویہ نے کہا بس بیٹھ جاؤ تم
ونخاف اللہ ان کذبنا	سب سے خطیب ہو۔ اس کے بعد
وانت یا امیر المؤمنین اعلم	تمام لوگوں نے اپنا خیال کیا۔ احنف
بیزید فی لیلہ ونہارہ	نہیں بولے تھے۔ معاویہ نے ان سے
وسرہ وعلانیتہ و	مخاطب ہو کر کہا کہ ابو بحر کیا کہتے ہیں
مدخلہ ومخرجہ	تم بھی تو کچھ کہو۔ اس پر احنف نے
فان کنت تعلمہ للہ تعالی	کہا کہ اگر سچ کہوں تو آپ لوگوں کا
وللامۃ رضا فلا تشاور	خوف ہے اور جھوٹ میں اللہ کا
فیہ وان کنت تعلم فیہ	خوف۔ امیر المومنین خوب جانتے ہیں

لہ ان صاحب کا حال معلوم نہ ہو سکا۔ سلہ احنف بن قیس بصرہ کا امیر بھی رہ چکے تھے جنگ جمل میں حضرت علی کے طرفدار تھے اگرچہ صحبت نبوی سے محروم رہے لیکن علم وفضل کی وجہ سے حضرت معاویہ کے دل میں بڑی عزت ووقعت تھی۔ ابو بحر کنیت تھی اور کنیت سے مخاطب کرنا عرب میں تعظیم کی علامت تھی

(الکامل ابن اثیر ج ۳، اصابہ ج اول)

غير ذلك فلا تزوده الدنيا
وانت صائر الى الآخرة
وانما علينا ان نقول سمعنا
واطعنا وقام رجل من
اهل الشام فقال ما ندري
ما تقول هذه المعدية
العراقية وانما عندنا
سمع وطاعة وضرب
وازدلاف فتفرق الناس
يحكون قول الاحنف[1]

آپ یزید کے لیل ونہار اور ظاہر و
باطن سے واقف ہیں اگر آپ سمجھتے
ہیں کہ اس کے انتخاب میں اللہ اور
امت کی رضا ہے تو کسی سے مشورے کی
کوئی ضرورت نہیں، اور اگر ایسا نہیں
سمجھتے تو پھر جب آپ کا سفر آخرت
ہے اس کی محض دنیا کا بندوبست
مت کیجئے۔ اور ویسے آپ جو بھی طے
کریں گے ہمارا فرض تو سمعنا واطعنا
ہے، اور اسی پر ایک شامی کھڑا ہوا
اور بولا ہم نہیں سمجھے کہ یہ عراقی دانا
کہنا کیا چاہتا ہے۔ ہم تو بس سمع
وطاعت جانتے ہیں اور سیدھی
سیدھی باتیں۔ اس پر لوگ منتشر ہو گئے
اس طرح کہ احنف کا قول ان کی
زبان پر تھا

اب اندازہ کیجئے کہ وفود کا اجتماع حضرت امیر معاویہ منعقد کر رہے ہیں۔ وفود بھیجے ہوئے ان کے گورنروں کے ہیں۔ ماحول دمشق کا ہے۔ سب تقریریں یزید کی ولی عہدی کی حمایت میں ہو رہی ہیں۔ بعض تقریروں میں بڑی صفائی، اعتراف اور سنجیدگی سے آپ کی سیرت اور ان صفات کا حامل بتایا جا رہا ہے جو منصب خلافت کو درکار ہیں۔ ایسے

---

[1] ابن اثیر ج ۳ ص ۲۵۱ — ۲۵۰ ۔

ماحول میں صرف ایک تقریر روایت میں حضرت احنف بن قیس کی ہوتی ہے جو بہت محتاط اور صلح پسند طبیعت رکھتے تھے وہ مخالف رائے دیتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ جو بھی فیصلہ امیر المومنین کر دیں گے ہم اس کی مخالفت نہیں کر سکیں گے فرمانبرداری کریں گے۔ پھر اس تقریر کے بعد ایک شامی کھڑے ہو کر کہتا ہے کہ یہ کیا ہے دو دلے بول[1] کا انداز ہے ہم شامی صرف ایک اور سیدھی بات جانتے ہیں: سمع اور طاعت!

کیا یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ایسے ماحول میں یہ اجتماع بلا کسی فیصلے کے انتشار پر ختم ہوا ہوگا جیسا کہ ابن اثیر بتلاتے ہیں؟ بظاہر یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے اور اس لیے وہ نتیجہ جو ابن اثیر بتلاتے ہیں کہ —

استوثق اکثر الناس — لوگوں کی اکثریت نے توثیق کر دی

وبایعوا[2] — اور بیعت کر لی۔

یہ نتیجہ اس اجتماع کا ہونا چاہیے جو اسی مقصد کے لیے بلایا گیا تھا لیکن اس خیالی علانات و عطا کا جس کا کوئی ثبوت نہیں اور علامہ ابن اثیر اس نتیجہ کو اسی کا ثمرہ ٹھہراتے ہیں۔

دمشق کے اس اجتماع کی کارروائی کے ذکر سے ہمارا مقصد صرف اس کمی کو پورا کرنا تھا جو طبری کی روایت میں رہ گئی تھی۔ تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اس روایت کے مطابق حضرت معاویہ نے حجاز کا سفر کر کے حضرت حسینؑ اور عبداللہ بن زبیرؓ وغیرہ سے جو یہ کہا کہ سب لوگ یزید کی ولی عہدی کے لیے بیعت کر چکے ہیں تم ہی لوگ کیوں مخالفت کر رہے ہو؟ تو اس کا پس منظر کیا تھا کب اور لوگوں نے بیعت کر لی تھی اور کس طریقے کارروائی ہوئی تھی؟

---

[1] یہ اسی طرح کی بات ولید بن عتبہ کے علاوہ عمرو بن حزمؓ سے بھی منسوب کی گئی ہے لیکن مدینہ کے اجتماع کی کارروائی میں یہ نہیں ہے۔ اس کا اندازہ اس سے ہو جاتا ہے کہ اس اجتماع میں انکی شرکت نہیں دکھلائی گئی۔ اس لیے ہم نے اس کا ذکر یہاں نہیں کیا ہے۔

[2] ایضاً ص ۲۵۱

ابن اثیر اور حضرت معاویہؓ کا سفر حجاز

ابن اثیر کے بیان میں معاملہ کی ٹھیک ٹھیک عکاسی ـــ یا کم از کم اجمالی ـــ معقول صورت کو جس طرح خواہ مخواہ بدصورت کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہ ابھی ہم نے دیکھی اور یہ کہ وہ باتیں ہیں جنھوں نے ہماری تاریخ کے اس باب کو تعصب بغض اور نامنصفانہ رنگ دے دیا ہے۔ اب اس کے بعد ابن اثیر کی زبانی حضرت معاویہ کے سفر حجاز کی روداد بھی سن لیجئے، اس میں ابن کثیر کے اس مجمل بیان کی جو ہم اوپر دے آئے ہیں۔ تفصیل ہے کہ جو ـــ چار یا پانچ ـــ اصحاب مخالفت کر رہے تھے ان کو حضرت معاویہ نے ڈرا دھمکا کر خاموش کیا اور اسی تفصیل کے اجزاء کافی مشہور ہوئے ہیں حالانکہ بے تکے پن کی انتہا نہیں ہے۔ اس کے باوجود ان کی شہرت و قبولیت کو بجز اس روایت پرستی کی مرض کیا کہہ سکتے ہیں؟[1]

ابن اثیر بتاتے ہیں کہ جب مملکت و مختلف علاقات کے ذریعے اکثر انسانوں کی اور خصوصاً اہل عراق و شام کی بیعت یزید کی ولی عہدی کے لیے حاصل کر لی گئی تو معاویہؓ نے ایک ہزار سواروں کے ساتھ حجاز کا رخ کیا، سب سے پہلے مدینے کے پاس پہنچے تھے کہ اول آدمی جو نظر پڑا وہ حسین بن علیؓ تھے، معاویہ انھیں دیکھ کر بولے۔

لا مرحباً ولا أهلاً ببدنة — استغفر اللہ یہ کون نظر آیا، قربانی کا بکرا
يترقرق دمها والله مهريقها. — ہے جس کا خون اچھل رہا ہے اور
اللہ اسے بہا دے گا۔

حسینؓ نے جواب دیا۔

---

[1] اسی روایت پرستی کا ماتم اقبال نے کیا ہے ؎
یہ امت روایات میں کھو گئی — حقیقت خرافات میں کھو گئی

مهلاً ما فی والله لست باهل　　ایکدم سختی سے کیجئے! میں بخدا

لهذه المقالة۔　　ایسی بات کا مستحق نہیں ہوں۔

معاویہ بولے ''اس سے کڑی بات کے مستحق ہو''۔ پھر ابن زبیرؓ کو دیکھ کر بولے ''منافق گوہ اپنا سر بل میں گھسا لیتی ہے اور دم ہلا کرتی ہے لیکن قریب ہے کہ دم سے پکڑ لی جائے گی اور کمر توڑ دی جائے گی اسے مجھ سے دور کرو''۔ چنانچہ ان کی سواری پر بھی چوٹ مار کر راستے سے ہٹا دیا گیا۔ اس کے بعد عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کے مقابل معاویہ نے ''لا مرحبا ولا اهلاً۔ بوڑھا ہے جو سٹھیا گیا اور عقل سے پیدل ہوا''۔ یہ کہہ کر ان کو بھی راستے سے ہٹا دیا گیا اور پھر یہی سلوک ابن عمر کے ساتھ کیا گیا۔ تب یہ لوگ معاویہ کے ساتھ ساتھ مسجد کی طرف کو چل دیئے۔ معاویہ ان کی طرف کوئی التفات نہیں کر رہے تھے۔ مدینہ پہنچ کر یہ لوگ معاویہ کے دروازے پر بیٹھے۔ ان کی اقامت گاہ پر بھی پہنچے۔ جہاں ان کا ان کی حیثیت کے مطابق استقبال نہیں ہوا۔ تب یہ لوگ مدینہ چھوڑ کر مکے چلے گئے۔ معاویہ نے مدینے میں ایک تقریر کی جس میں خلافت کے لیے یزید کی اہلیت اور موزوں ہونے پر اس کی فوقیت بیان کرکے مخالفت کرنے والوں کو دھمکایا کہ اسے اب برداشت نہیں کیا جائیگا اس کے بعد ام المومنین حضرت عائشہؓ کے یہاں حاضری دی۔ جہاں ام المومنین نے ان سے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ تم نے حسینؓ وغیرہ کو قتل کی دھمکی دی ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ام المومنین یہ لوگ فی الواقع اس سے بالاتر ہیں۔ لیکن آپ مجھے یہ بتائیں کہ اگر میں یزید سے بیعت کر چکا ہوں اور ان لوگوں کے علاوہ سب بیعت کر چکے ہیں تو کیا اب یہ بیعت توڑ دی جائے؟ حضرت عائشہؓ نے

---

[1] یہاں ایک بہت اہم نوٹ کیجئے کہ ابن عمرؓ کا نام اس فہرست میں نہیں ہے۔

جواب دیا کہ نہیں، مگر ان کے ساتھ نرمی سے پیش آؤ، مجھے امید ہے کہ جو تم چاہتے ہو وہی ہو جائے گا۔ معاویہ بولے یہ بہت اچھا ہے میں ایسا ہی کروں گا۔ پھر کچھ دن ٹھہر کر مکہ روانہ ہو گئے۔ اور اب خواہش کہ ان چاروں یعنی حضرت حسینؓ وغیرہ سے ملیں جو مکے ہی میں تھے۔ اس خواہش کا علم ان لوگوں کو ہوا تو وہ بطن مرّالظہران[1] میں آگئے۔ سب سے پہلے ملنے والے حضرت حسینؓ تھے۔ انھیں دیکھ کر معاویہ بولے "مرحبا و اھلاً یا ابن رسول اللہ و سید شباب المسلمین" اور حکم دیا کہ ان کے لیے سواری لائی جائے۔ جب وہ سوار ہو گئے تو معاویہ کے ساتھ ساتھ چلے۔ بقیہ تینوں کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا۔ اور اب ان چاروں کے جلو میں اس طرح چلے کہ کوئی پانچواں ان کے ساتھ شریک نہیں تھا۔ اور اسی شان کے ساتھ ان چاروں کو لے کر مکے میں داخل ہوئے۔ پھر جتنے دن رہے ہر دن نیا اکرام نیا احسان تھا۔ اور دوسری کوئی بات نہیں تھی حتی کہ حج کے ارکان ادا ہو گئے اور چل چلاؤ کا وقت آنے لگا۔ تو ان چاروں نے آپس میں کہا کہ کسی دھوکے میں نہ آنا یہ سب جو ہو رہا ہے ہماری محبت میں نہیں ہو رہا ہے" مطلب سعدی دیگر است" لہٰذا اب سوچ لیجیے مطلب کی بات ہم سے کہی جائے گی تو کیا کہنا ہے۔ پس ان لوگوں نے طے کیا کہ جیسے ہی مطلب کی بات کہیں گے تو ابن زبیرؓ ان کو جواب دیں گے۔ چنانچہ وہ وقت آگیا اور معاویہ نے ان کو مخاطب کر کے کہا کہ تمہارے ساتھ جو میرا برتاؤ رہا ہے وہ تم جانتے ہو تم سے رشتہ داری کا جو پاس و لحاظ مجھے رہا ہے وہ بھی تم پر عیاں ہے اور اس کے متعلقین پر جو تم لوگوں کی روش رہی ہے اس کے لیے میرا حق جو تم سے مخفی نہیں۔ اب اس وقت بات یزید کی ہے وہ تمہارا بھائی ہے

---

[1] مکے سے چار پانچ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں کا نام (معجم البلدان) اسکو وادی فاطمہ بھی کہتے ہیں۔

تم لوگوں کو نام کہنا چاہتا ہوں کہ خلافت یزید کے لیے ہے تمہارے آگے بڑھاؤ
سب حکومت کے اختیارات، عزل و نصب، تحصیل خراج، تقسیم دولت اور سب
تمہارے ہاتھ میں ہوں گے۔ یزید تمہارے آڑے نہیں آئے گا۔ یہ لوگ
خاموش رہے کچھ بولے نہیں۔ معاویہ نے دوبارہ کہا کہ تم مجھ کو جواب نہیں دیتے'
پھر ابن زبیر سے مخاطب ہوئے کہ تم بولو۔ تم ہی ان کے خطیب ہو۔ ابن زبیرؓ
نے جواب دیا کہ تین باتیں آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔

۱۔ آپ سب کے لیے ویسے چھوڑ جائیے جیسے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم چھوڑ گئے
تھے کہ کسی کا تقرر نہیں کیا۔ لوگوں نے ابوبکرؓ کو منتخب کر لیا۔
معاویہ نے کہ آج تم میں کوئی ابوبکرؓ جیسا نہیں ہے۔ اس میں اختلاف ہوگا۔

۲۔ ابن زبیرؓ نے کہا کہ پھر ابوبکرؓ کی طرح کیجئے کہ خلیفہ نامزد کیا مگر اپنی اولاد
یا خاندان کا نہیں۔

۳۔ یا عمرؓ کی طرح کیجئے کہ انتخاب خلیفہ کے لیے شوریٰ نامزد کر دی۔ مگر اس میں اپنی
اولاد یا خاندان کے کسی فرد کو نہیں رکھا۔

معاویہ نے کہا اور کوئی صورت تمہارے پاس پیش کرنے کو نہیں ہے۔ ابن زبیرؓ
نے کہا نہیں۔ باقی لوگوں سے پوچھا تو انہوں نے بھی یہی جواب دیا۔
معاویہ نے کہا اچھا اب بات چیت ختم ہوئی۔ میں نے چاہا تھا کہ تم
لوگوں کی رضامندی حاصل کر لوں۔ مگر معلوم ہوا کہ یہ نہیں ہو سکے گا۔ پس
حجت تمام ہو گئی۔ اب کوئی بے الزام نہ دے۔ اب تک میرا معاملہ یہ تھا کہ میں
تقریر کرنے کھڑا ہوتا اور تم میں سے کوئی بھی برسرعام میری تکذیب کرنے کھڑا
ہو جاتا تھا میں سے برداشت کر لیتا اور درگزر کر جاتا تھا۔ لیکن آج مجھے کچھ
میں یہ کہنا ہے۔ اس موقع پر اگر تم میں سے کسی نے میری تکذیب کی تو

خدا اور رسول کا علم پہنچانا ان کے سر پر پہنچ چکی ہوگی۔ یہ کہہ کر آپ نے محافظ دستے کے سربراہ کو بلایا اور کہا کہ ان میں سے ہر ایک کے اوپر دو دو آدمی شمشیر بکف مسلط کر دو اور ہدایت کر دو کہ اگر میری تقریر کے دوران ان میں سے کوئی بول پڑے تو اس کی گردن اڑا دیں۔ اس کے بعد معاویہ ان کے ساتھ حرم میں چلے گئے حتیٰ کہ معاویہ منبر پر پہنچے اور حمد و ثنا کے بعد کہا کہ یہ حسین، ابن الزبیر، ابن عمر ابن ابوبکر سادات مسلمین اور عمائدین ملت ہیں۔ جن کے مشورے ہی سے تمام کام انجام پاتے ہیں انہوں نے یزید کی ولی عہدی قبول کر لی اور بیعت کر دی ہے۔ پس اب آپ سب لوگ بھی اللہ کا نام لے کر بیعت کریں۔ چنانچہ سب اہل مکہ نے بیعت کر لی۔ اور معاویہ نے اسی وقت سواری منگوائی اور مدینہ کو روانہ ہو گئے اب اہل مکہ نے ان لوگوں سے سوال کیا کہ آپ لوگ تو کہتے تھے کہ ہم ہرگز بیعت نہ کریں گے۔ یہ کیا ہوا! ان لوگوں نے کہا کہ بخدا ہم نے بیعت نہیں کی ہے۔ لوگوں نے کہا پھر آپ نے تردید کیوں نہیں کی۔ اس آدمی کو جھٹلا کیوں نہ دیا! بولے اس نے ہمارے ساتھ داؤں کھیلا اور ہم ڈر کے مارے چپ ہو رہے۔ ادھر معاویہ مدینے پہنچ گئے اور مدینے والوں نے بھی بیعت کر لی۔ یہ کام کر کے معاویہ شام روانہ ہو گئے اور بنی ہاشم کے ساتھ اپنے تعلقات میں سختی شروع کی۔ یعنی وظائف وغیرہ روک دیئے۔ اس پر ابن عباس دمشق پہنچے اور کہا کہ یہ کیا قصہ ہے؟ معاویہ نے کہا قصہ کیا ہوتا وہ تمہارے حسین صاحب بیعت نہیں کر رہے ہیں اور تم لوگ ان سے کچھ نہیں کہتے ہو۔ ابن عباس نے کہا: معاویہ تم جانتے ہو کہ میں اگر چاہوں تو بعض ساحلی علاقوں میں جا کر ڈیرا ڈال دوں، اور وہاں کے لوگوں کو تمہارے متعلقات کا ذکر دوں ایسے کہ تمہیں یہیں ایسا تمہیں تمہارے مظالم دیے جائیں گے۔ تمہیں راضی رکھا جائے گا۔

بلکہ پہلے سے زیادہ روایات نقل کیں۔

ایک لمحۂ فکریہ

یہ امر کیا بتلاتا ہے کہ اس طرح سے روایات نقل کرنے والے ان حدیثی عاملوں کے ذہن کا جھکاؤ ام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ اور امیر معاویہؓ کے درمیان ہوا اسی طرح جو اس مختصر سی گفتگو کے جو حضرت ابن زبیرؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان انتخاب یزید کے موضوع پر ہوئی کیا اس بات پر کوئی سنجیدہ آدمی یقین کر سکے! امیر معاویہؓ کے لیے تو یہ بڑی اوچھی بات ہے جسے ان مخالفین نے فرض کر لی ہے۔ اس لیے کہ ستودہ اخلاق، حلم، مدارات، درگزر و عفو کے اعلیٰ کردار کے مالک تھے کہ وہ مدینہ کے پاس حسین بن علیؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، عبداللہ بن عمرؓ اور عبدالرحمن بن ابی بکرؓ کے ساتھ ایسی ہی بدخلقی سے پیش آئے جیسی بدخلقی مذکورہ بالا روایات میں دکھلائی گئی ہے گویا ایسی ہی آسانی سے یہ بھی ماننے کی چیز ہے کہ یہ حضرات امیر معاویہؓ کے ہاتھوں اس حقیر اور ادنیٰ سلوک، تذلیل و تحقیر کا نشانہ بنے ہوں یہ حضرات چار و ناچار راضی ہو گئے بلکہ یہ بھی مدینے پہنچے ہوئے ہر ایک کے پیچھے لگے رہے اور یہ حضرات ان کے ہاتھوں ذلیل ہو کے جا بیٹھے پھر کوئی بات ان کی پوری نہ ہوئی تو ناراض ہو کر شرمندہ ہو کر چلے جانے کا خیال ان کو آیا۔ لیکن ہمارا استدلال یہ ہے کہ یہ بات ثابت نہ ہوئی جیسی کہ کے قریب پہنچ کر امیر معاویہؓ نے ان کو بلا لیا پھر مدینہ کے آگے سے باہر ان کے استقبال کو پہنچ گئے اور پھر ان کی ناز برداری اور عطایا سے نوازا جو کہ پہلے تھے

جو کچھ بھی ہو گیا کہ سب شامل ہونے کے لیے خواہش بیعت کی تھی یہ سب مستفسر تھے۔ یہ وہی ذات ہیں مروان، ابو یحییٰ، ابن [illegible] اور ابن زبیرؓ جن کی ملاقات کے لیے گئے

؎ [illegible] ج ۳ ص ۳۵ [illegible]

ہم پڑھتے ہیں؟ یا جس عظمت سے ہماری کان ان کے ہمراہ چند بونے اور بالشتیے —— یا مسخرے؟ معاویہ دشمنی کا یہ اندھا پن تو دیکھیے:-

"اور ابھی بس کہاں ہے؟ ہم نے تو اس قصے میں یہ بھی پڑھا کہ حسینؓ کے نکلنے کی وجہ یہ ہے کہ ان کا مرنا اور جینا حق کے لیے تھا، انسانی، روحانی اور اخلاقی قدروں کے لیے تھا۔

وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغ ستم نکلے

وہ حسینؓ بن علیؓ جنہوں نے اپنی اور اپنی اولاد کی اور اپنے اہل خاندان کی گردنیں کربلا میں کٹوا دیں۔ مگر عبید اللہ بن زیاد کے چہرے کے آگے کسی قیمت پر جھکنا گوارا نہ کیا۔ وہ ابن زبیرؓ جو شیروں کی موت مرے، روباہ کی زندگی قبول نہیں کی، وہ ابن عمرؓ جنہیں حق بات کہنے سے کبھی کوئی روک نہ سکا اور جو جبابرہ ان کے جبروت کے آگے جھکا اور وہ ابن ابی بکرؓ جو حسب روایات ولی عہدیٔ یزید کی مخالفت میں ہمیشہ سب سے آگے اور سب سے تیز اور صاف گو رہے۔ ان شیران قدر کے بارے میں اس روباہی کا یقین نہیں دلایا جاتا ہے کہ امیر معاویہ نے جو دھمکی دی کہ خبردار اگر زبان کھولی [illegible] سب کے لبوں [illegible] سکتہ طاری ہوا کہ معاویہ خانۂ خدا میں مجمع کے سامنے ان کی موجودگی میں ان کے بارے میں یہ غلط بیانی کرتے رہے کہ یہ چاروں یزید کی بیعت کر چکے ہیں، اور ان میں سے کسی کے لب کو جنبش نہیں ہو سکی!

کیسی ناقابل تصور باتیں ہیں! مگر ہمارے یہاں شک کی سکوں کی طرح چل رہی ہیں۔ ابن کثیر جیسا محتاط مورخ بھی معاویہ دشمنی کی اندھی رو میں بہ کے اس زہر سے نہیں بچ پایا اور تفصیل سے گریز کے باوجود اتنا بہرحال لکھ دیا —— جیسا کہ گزر چکا —— کہ:

"معاویہ نے ان میں سے ہر ایک کو الگ بلا کے ڈرایا دھمکایا پھر ان کی موجودگی میں ممبر پر جا کے تقریر کی جس پر لوگوں نے یزید کی بیعت کر لی

اور یہ خاموش بیٹھے دیکھتے رہے کیونکہ انھیں ڈرا دھمکا یا جا چکا تھا۔ "

اب اگر معاویہ دشمنی کا اندھا پن اسے نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے کہ معاویہ کا چہرہ سواد الشمس سیاہ کرنے کے جوش میں اس بات کا ہوش بھی کھو دیا گیا کہ اُن کے چھینٹے اُن چہروں پر بھی سیاہی پھیری جا رہی ہے جن کی خاطر معاویہ سے دشمنی ٹھیرائی ہے۔

علاوہ ازیں یہ بھی دیکھنے کی چیز ہے کہ یہ واقعہ کس جگہ کا بیان کیا جا رہا ہے؟ ابن اثیر کے بیان کے مطابق حرم مکی (مسجد حرام) کا اور ابن کثیر کے بیان کے مطابق حرم مدنی (مسجد نبوی) کا۔ کیا کسی "معاویہ" کی واقعی یہ جرأت تھی کہ ان دونوں حرموں میں سے کسی حرم کے اندر شمشیر بدست لوگوں کو ان حضرات کے سروں پر مسلط کرتا کہ اگر منہ کھولیں تو گردن اڑا دی جائے۔؟

پھر بات یہ ہے کہ اگر واقعی یہ سب کچھ ہوا تھا اور یہ حضرات خصوصاً حسین بن علی اور عبداللہ بن زبیرؓ اس وقت جرأت دکھانے اور جان پر کھیلنے کے بجائے ڈر سہم کر بیٹھ گئے تھے تو پھر یزید کی خلافت کے قیام کی ذمہ داری میں یہ شریک ہوئے اور تین چار سال اسی خاموشی میں گزار کر سنہ ۶۰ھ میں وفات معاویہ کے بعد جو کھڑے ہوئے تو یہ بھی کھڑے ہوئے سب بے وقت کی۔

علیٰ ہذا یہ اضطراب بیان کس بات کی چغلی کھا رہا ہے؟ ابن اثیر کہتے ہیں کہ واقعہ حرم مکی کے اندر پیش آیا۔ جبکہ ابن کثیر کا بیان ہے کہ حرم مدنی میں پیش آیا؟ ایسی روایت پر کس حد تک اعتبار کیا جا سکتا ہے؟

غرض کوئی ایک نہیں بیسیوں باتیں اس روایت کی تردید میں ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ جیسے تاریخ اسلام اور مشاہیر اسلام کا مضحکہ اڑانے کے لیے یہ روایت بنائی گئی ہے۔

۱؎ اس سلسلے کی روایت کا آخری ٹکڑا حضرت ابن عباس کی (اصل عبارت) بھی دیکھ لیجئے اور پھر حضرت معاویہ کا جواب بھی۔ کیا اسے سرزنش کی بات کے سوا کچھ اور کہا جائے گا؟ اور یہی وہ مسجد حرم ہے۔

مگر ہمارے مؤرخین نے اسے ایک "تاریخی امانت" کے طور پر محفوظ رکھنا ضروری سمجھا۔ ماشاءاللہ، ان حضرات کے سامنے ــ جو کہ علم دین کے بھی ماہر تسلیم کیے جاتے ہیں ــ کیا چیز تھی جس نے حدیث نبوی "کفی بالمرء کذباً ان یحدث بکل ما سمع" آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ جو بات سنے بلا تحقیق کیے نقل کر دے اور آیت قرآنی۔

یا ایہا الذین امنوا ان جاءکم فاسق بنبا فتبینوا ۔ ۔ ۔	اے ایمان والو جب کوئی فاسق کوئی خبر تم کو پہنچائے تو اس کی تحقیق کر لیا کرو۔

کو تاریخی واقعات کی روایتوں کے سلسلے میں قابل اطلاق نہیں سمجھا جبکہ حدیث کی روایات کے سلسلے میں ان ہدایات کا خیال ضروری مانا گیا؟

واقعہ کی قرین قیاس صورت

اوپر کی بحث کا مقصد یہ نہیں ہے کہ سرے سے کسی ایسے واقعے کے وجود ہی کا انکار کر دیا جائے جس میں حضرت معاویہؓ نے رفع اختلافات کی خاطر حجاز کا کوئی سفر کیا ہو اور ان حضرات (حضرت حسینؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ وغیرہ) سے ملے ہوں جن کو یزید کی ولی عہدی قبول کرنے سے ابتداً انکار رہا تھا۔ درحقیقت جیسے حالات تھے ان حالات میں تو یہ دعویٰ کرنا بھی صحیح نہیں ہوگا کہ ان ملاقاتوں میں کوئی تلخی و ترشی کی بات نہیں ہوئی۔ لیکن اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ اس طرح کے قصے ہرگز نہیں پیش آئے جو ابن اثیر کی تاریخ نے بیان کیے ہیں۔ واقعہ کی تمام جزئیات و بیانات کو رکھتے ہوئے اور نیز گزشتہ بالا بحث میں اٹھائے گئے نکات و سوالات کو بھی سامنے رکھتے ہوئے روایات کے جو حصے قابل قبول نظر آتے

[illegible]

ان بیانات کی روشنی میں سارے قصے کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی کہ حضرت امیر معاویہؓ، جیسا کہ ابن کثیر کا بیان ہے، عمرے کی نیت کر کے شام سے حجاز کے لیے نکلے اور عمرے سے فراغت پا کر مدینہ منورہ میں قیام کیا۔ یہاں انھوں نے بیٹے کے ان حضرات سے بات کی جو یزید کی ولی عہدی کے مخالف تھے۔ اس اُلجھن کو دور کرنا چاہا جو ان کی مخالفت کی وجہ سے اس معاملے میں پڑ گئی تھی۔ یہ لوگ تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت حسین بن علیؓ ان حضرات سے حضرت معاویہؓ کی گفتگو کی روداد کے سلسلے میں طبری کی روایت زیادہ قرینِ قیاس تھی جو صـــ   پر گزر چکی ہے۔ کیونکہ:

(الف) یہ چاروں افراد میں سے ہر فرد کے ساتھ علیحدہ گفتگو دکھاتی ہے۔ اور حضرت معاویہؓ جیسے مدبّر اور سیاست داں سے ایسے حالات میں کہ ایک مخالفت کا محاذ انھیں توڑنا ہے، یہی بات قرینِ قیاس ہے کہ وہ ہر فرد سے الگ اور تنہا گفتگو کریں۔

(ب) بیان چار افراد کو تین خانوں میں بانٹتی ہے۔ حضرت حسینؓ اور حضرت ابن زبیرؓ کا ایک خانہ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا اپنا الگ خانہ اور حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کا ایک تیسرا خانہ۔ اور یہ بالکل واقعی تقسیم ہے۔ یہ چاروں حضرات اسی طرح کی تقسیم کے مستحق تھے۔ اور حضرت معاویہؓ جیسے صاحبِ نظر اور صاحبِ بصیرت آدمی سے یہی توقع کی جانی چاہیے کہ وہ ان حضرات کی اسی طرح گروہ بندی کریں۔ اور ہر ایک سے اس کے زمرے کے مطابق گفتگو کریں۔ چنانچہ حضرت حسینؓ اور حضرت ابن زبیرؓ سے انھوں نے بالکل ایک بات کی اور دونوں نے ایک ہی جواب بھی دیا۔ اور یہی دونوں حضرات تھے جنھوں نے حضرت معاویہؓ کے بعد یزید کی خلافت اور حالات کو چیلنج کرنے کی یکساں روش اختیار کی۔ یہ گفتگو دونوں طرف سے بالکل ایسی ہی انداز کی اور نہایت قابلِ قبول نظر آتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی پوری زندگی کی روشنی میں یہ اطمینان کیا جا سکتا تھا

کہ وہ خود پہلے خلافت کے دعویدار نہیں ہو سکتے۔ ان معاملات میں یہاں ایک سب سے بڑی دلچسپی امت کا اتحاد ہے۔ وہ بالآخر یزید پر راضی ہو جائیں گے۔ چنانچہ ان کی گفتگو بھی بہت نرم رہتی ہے اور حضرت معاویہؓ کی طرف سے بات میں بھی ایک کھلا پن اور اعتماد کی کیفیت نظر آتی ہے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ اگر سنہ ۵۶ھ میں زندہ تھے تو خلافت کے دعویدار نہ ہونے میں تو بلاشبہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہی کے درجے کے آدمی تھے مگر یزید کی مخالفت میں سب سے زیادہ متشدد سمجھے جاتے تھے اور اسلامی نظام خلافت میں باپ کی طرف سے بیٹے کی نامزدگی کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں سمجھتے تھے۔ اس کے ساتھ حضرت معاویہؓ کی گفتگو دیکھی جائے تو دونوں ایک دوسرے کے لیے ناقابل برداشت نظر آتے ہیں۔ نہ پیچھے کی کوئی امید پائی جاتی ہے نہ سیاسی مکالمے کی کوئی گنجائش۔ بہت ممکن ہے یہی ناخوشگوار ہو لیکن مؤرخین کی پوزیشن کے پیش نظر سمجھ میں آنے والی ہے۔ طرفین دو انتہاؤں پر تھے۔

طبری کی روایت کے یہ دو پہلو (الف اور ب) ایسے ہیں جو ہمیں آمادہ کرتے ہیں کہ اس روداد گفتگو کو بطور واقعہ تسلیم کر لیں۱؎ مگر روایت کی دوسری تین کمزوریوں کی وجہ سے ہم اس پر اعتماد نہیں کر سکتے۔

۱۔ روایت کا بنیادی راوی قطعی نامعلوم شخصیت ہے۔ رجل بجالة من نخلة (نخلہ کا ایک آدمی)۔ اور پیچھے جہاں روایت گزری وہاں معلوم ہو چکا ہے کہ نخلہ بھی کوئی ایک متعین جگہ نہیں ہے۔ اس نام کی دو بستیوں کا ذکر معجم البلدان میں ہے لیکن دونوں میں سے ایک کا تعین بھی ہو جائے تب بھی مجہولیت تو برقرار ہی رہے گی۔

۱؎ چنانچہ طبری کی روایت میں جو گفتگو پیش کی گئی ہے اس میں صحابیوں کی طرف سے حضرت ابن زبیرؓ کی گفتگو تو قرین قیاس ہو سکتی ہے مگر حضرت معاویہؓ کی طرف سے منسوب باتیں بالکل ہلکی اور خلاف قیاس ہیں۔ نہ سخت ناقدین سے ایسی ہلکی اور چھچھورے پن کی باتیں حضرت معاویہؓ کے متعلق نہیں سوچی جا سکتیں۔

۲۔ یہ روایت ہی تعین میں پانچ آدمیوں کا شمار کرتی ہے۔ اور پانچواں نام حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا دیتی ہے مگر جیسا کہ اوپر ایک جگہ بحث آچکی ہے اس نام کا شمار قطعاً غلط ہے اور اس کی ایک دلیل ۔ یا قرینہ خود روایت ہی کے اندر موجود ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کے ساتھ کوئی گفتگو روایت میں نہیں دکھائی گئی۔

۳۔ اس میں گفتگو کی جگہ کا نام تو نہیں بتایا گیا کہ مکہ تھا یا مدینہ مگر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی زبان سے یہ الفاظ کہلوائے گئے ہیں کہ "یا امیر المومنین عش فی حرم اللہ عزوجل" (امیر المومنین آپ اس وقت حرم الٰہی میں ہیں) جس سے ظاہر ہوتا کہ بات چیت مکہ مکرمہ میں ہو رہی تھی جبکہ جن لوگوں نے حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کو اس گفتگو کے وقت تک زندہ بتایا ہے انہوں نے بھی کہا ہے جیسا کہ پیچھے اس سلسلے کی بحث میں گزر چکا ہے ۔ کہ وہ حضرت معاویہؓ کے اس سفر ہی کے دوران بیعت یزید کے لیے ان کی مہم سے ناراض ہو کے چلے گئے تھے اور اسی سفر ہی میں مکہ سے دس میل پہلے راستے ہی میں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ تب اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ کا اگر ۵۳ھ میں انتقال نہیں ہو چکا تھا جو کہ عام طور پر ان کا سن وفات مانا گیا ہے اور ۵۶ھ میں حضرت معاویہؓ کے اس سفر کے وقت بقید حیات تھے تو لامحالہ حضرت معاویہؓ سے ان کی ملاقات کی جگہ مدینہ سمجھنا ہوگا۔

ان تین مواقع پر آکر اصحاب طبری کی روایت کے متعلق یہ اطمینان تو نہیں کر سکتے کہ کوئی اطلاع بھی گفتگو ان حضرات کے درمیان پیش آئی ہوگی مگر اس کے حق میں بولنے والے قرائن کو دیکھتے ہوئے اور ابن اثیرؒ وغیرہ کے بیانات کے سلسلے میں دیکھتے ہوئے کہ ایک طرف تو وہ قطعاً ناقابل تصور ہیں جیسا کہ تفصیلی بحث کر کے دکھا جا چکا۔ اور دوسری طرف سرے سے کوئی سند ہی اپنے ساتھ نہیں رکھتے۔ یہی مختصر گفتگو کی حد تک طبری کا بیان بہرحال نقلاً ترجیح اور واقعیت سے قریب تر

معلوم ہوتا ہے۔

اور اس گفتگو کے بعد بھی یہ کوئی خاص امید افزا بات نہیں تھی کیونکہ ظاہر ہے کہ حضرت معاویہؓ کو اس نتیجہ پر پہنچ جانا تھا کہ یہ لوگ فی الحال بیعت کرنے والے نہیں ہیں۔ جبکہ اور سب جگہ بیعت ہو چکی ہے۔ تو اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ بیعت اور ولی عہدی آخری جانے مانی کر لی جائیگی؟ اسے منضبط اور مکمل کیا جائیگا یا ایک مبہم غیر منفصل یا غیر یقینی حالت میں رکھا جائیگا؟

حضرت معاویہؓ جیسے ایک منضبط ارادے کے شخص سے ایک انتہائی ذمہ دار حیثیت کے شخص سے یہ توقع ہرگز نہیں کی جا سکتی کہ وہ ایک ایسے علاقے کے تین چار افراد کے اختلافات کی بنا پر جس کا سیاسی وزن حضرت علیؓ کے مدینے کو چھوڑ کر کوفہ کو دارالخلافہ بنا لینے کے بعد سے ختم ہو گیا تھا۔ اپنی اب تک کی ساری کاروائی لپیٹ کر رکھ دیں گے اور اپنے بارے میں ایک کمزور اور ناکام حکمران ہونے کا تاثر دیں گے؛ جبکہ وہ ولی عہدی کو ملت کی ایک ناگزیر ضرورت کی نظر سے بھی دیکھ رہے تھے جیسا کہ آگے آئیگا۔

ہمارے نزدیک قرین قیاس یہ ہے کہ انہوں نے ان حضرات کو ان کی ذاتی حیثیت کے باوجود نظر انداز کر کے دیگر اہل مدینہ کو خطاب کرنے اور اعتماد میں لینے کا فیصلہ کیا ہو۔ اور یہی وہ خطاب ہوگا جس کا ذکر ابن اثیر کی روایت میں گزرا جس کا خلاصہ ان کے بیان کے مطابق یہ تھا۔

فخطب معاویہ بالمدینۃ	اور ساتھ ہی مدینے میں خطاب کیا
فذکر یزید ومدحہ	جس میں یزید کا ذکر کر کے اس کی
وقال من احق منہ بالخلافۃ	خوبیاں بیان کیں اور کہا عقل
فی فضلہ وعقلہ وموضعہ	فضل اور حسب کے خلافت کے
وما اظن قوما بمنتہین حتی	لیے موزوں تر بتاتے ہوئے کہا کہ

نصیبهم بی لی بعضاً منهم — جو لوگ ملامت کر رہے ہیں میں
وقد نذرت ان اخذت — سمجھتا ہوں کہ وہ اپنے آپ کو تنبیہ
استلذ ولنا — کیے بغیر باز آنے والے نہیں ہیں۔

ابن اثیر کے اس بیان کی بھی ایسی کوئی سند نہیں ہے کہ اس کو رد کرنا مشکل ہو۔ بلکہ سرے سے سند ہے ہی نہیں۔ لیکن اس وقت کے جو حالات ہمارے سامنے آتے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے یہ بات کچھ بعید نظر نہیں آتی کہ حضرت معاویہؓ ان حضرات کے خلاف سے تنگ آ رہے ہوں اور اپنی ذمہ داری کا تقاضا سمجھ رہے ہوں کہ سختی کا انداز اختیار کر کے اس اختلاف کو دبا دیا جائے چنانچہ انہوں نے اپنے اس خطاب میں اس طرز کے جملے بھی کہے ہوں جن کی ترجمانی ابن اثیر نے مذکورہ بالا الفاظ سے کی ہے۔ مگر سختی کا یہ انداز کہ ان لوگوں کو جلسے میں شریک کر کے زبان بند رکھنے کا حکم دیا جائے اور شمشیر بکف سپاہی ان کے سر پر مسلط کیے جائیں اگر خوف کا عالم ان پر طاری رہے۔ یہ بھی ناقابل یقین بات ہے نہ حضرت معاویہؓ کے بیس سالہ دور میں اس جبر و تشدد کی ـــــ اور خاص طور سے ان معزز حضرات کے ساتھ ـــــ کوئی مثال ملتی ہے نہ ان سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ جبر کا یہ معاملہ دیکھتے ہوئے خاموش ہو جاتے۔ اور نہ ہی ان بزرگوں کے متعلق تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ اتنے بزدل اور پست ہمت تھے کہ مالک بن انسؒ، احمد بن حنبلؒ اور ابو حنیفہؒ کی شان بھی پیش کرنے کے قابل نہ ہوتے اور مزید برآں یہ جبر بالکل بیکار تھا۔ اگر ان حضرات کو اس کے بعد پابند نہ کیا جاتا ـــــ ـــــ ـــــ کہ اب یہ اپنا اختلاف کسی پر ظاہر نہ کریں گے۔ مگر اس جبر کے قصے ہی میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جیسے ہی معاویہؓ جلسہ ختم کر کے رخصت ہوئے

لہ ابن اثیر ۳۵ ص ۲۵۱ ۔

ویسے ہی ان حضرات نے اس بات کا اظہار بھی کر دیا کہ ان کے متعلق جھوٹ بولا گیا ورنہ انھوں نے بیعت کی ہے نہ وہ اس سے راضی ہیں۔

فیصلہ کن بات

واقعہ یہ ہے کہ اس جبر و دباؤ والے قصے کی روایتیں اتنی مختلف قسم کی ہیں کہ باہم ان کا اختلاف ہی ان کو ناقابل توجہ بنا دینے کے لیے کافی ہے۔ اور وہ کافی نہ ہو تو جبر و دباؤ کے قصے پر جو اشکالات وارد ہوتے اور سوالات اٹھتے ہیں ان کی تاب یہ قصہ کسی طرح نہیں لا سکتا اور ان سب پر مزید آخری وجہ کی اور نہایت واضح فیصلہ کن بات یہ ہے کہ یہ سب ہی مختلف روایتیں یہ بھی بتاتی ہیں کہ جبر کا عمل کر کے بیعت حاصل کرنے کے بعد معاویہ فوراً [illegible] دمشق کے لیے روانہ ہو گئے اور ان کے بعد حضرات کی زبانی سب اہل مدینہ کے سامنے اس جبر کا راز کھل گیا جس میں ان حضرات پر جبر کے ساتھ باقی اہل مدینہ سے صرف مغالطہ بازی بھی شامل تھی۔ سوال یہ ہے کہ کیا کوئی عقل باور کر سکتی ہے کہ اہل مدینہ سے جو بیعت ان کی لاعلمی میں ایسے جبر اور جھوٹ کے بل پر لی گئی تھی اس کے خلاف ان کے اندر کوئی ردعمل اس وقت نہیں ہوا ہوگا جب انہیں فوراً ہی یہ پتہ چلا ہوگا کہ ان کے امیر المومنین معاویہ ان کے ساتھ کیسا فریب (معاذ اللہ) کر گئے ہیں؟ کیا کوئی امکان سوچا جا سکتا ہے کہ ایسی بیعت جوں کی توں قائم رہ جائے۔ ایک آدمی بھی نہ نکلے جو اپنی گردن سے اس دھوکے کی بیعت کو نکال کر پھینکتا ہوا بتایا جائے؟

سب روایتیں بتاتی ہیں کہ جبر کا ماحول فوراً ہی ختم ہو گیا تھا۔ معاویہ اپنے مسلح سواروں کو ساتھ لے کر واپس جا چکے تھے لیکن ایک روایت بھی یہ نہیں بتاتی

کرادی شورش اور اونی دخل بھی مدینے کی آبادی میں۔ سب جبر و فریب کے خلاف عملاً ہو۔ تب کیا یہ جبر اور جھوٹ کے قصے سوائے جھوٹ کے اور کچھ ہو سکتے ہیں بلا اللہ پر کان دھرنا عیب ہے! مگر افسوس یہ خرافاتی باتیں آج کے تحقیق پسند دور میں بھی جعلی سکوں کی طرح چل رہی ہیں۔ کیونکہ ہم ان باتوں کو پہلے زمانے کے پشتہا پشت سے عادی ہو گئے۔ اور جس چیز کے ہم قدیم سے عادی بنے ہیں وہ ایک تو عادت کی وجہ سے نہیں چھوٹتی۔ دوسرے اس کی تلاوت بھی ایک طرح کا تقدس اور ایک وزن اسے بخش دیتی ہے۔ اے اللہ تو ہی مدد فرما۔

باب ششم

یزید کی ولیعہدی پر حضرت معاویہ کو اصرار کیوں؟

اور

دیگر حضرات کو اس سے اختلاف کیوں؟

اصرار اور اس کی بنیاد

ہمارے سامنے ایسی کوئی تحریر نہیں ہے جس کی بنا پر قطعی انداز میں کہا جا سکے کہ امیر معاویہ کو کیوں اصرار تھا کہ اپنے بعد کے لیے اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد بنائیں۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ :۔

وذاك من شدة محبة الوالد	یہ بات اس شدید محبت کی وجہ
لولده وما كان يتوسم	سے تھی جو ایک باپ کو بیٹے سے ہوتی
فيه من النجابة الدنيوية	ہے۔ نیز اس کی دنیوی شرافت و
وسيما اولاد الملوك ومعرفتهم	نجابت کی بنا پر اور شاہی گروہ
بالحروب وترتيب الملك	جو بادشاہوں کی اولاد میں شامل
والقيام بأبهته وكان يظن	جنگ اور نظم مملکت سے واقفیت

ان لا یقدم احدًا من امة محمد ﷺ
فی مدل لمعنی ولحدا
قال لعبد اللہ بن عمر
بما خاطبہم فی ذمت
انی اذر الرعیة من بعدی
کالغنم مطیرة لیس
لہا راع [1]

اور شاید کہ وہ فرقہ کی بیعت بھی نہ کرے
نیز آپ سمجھتے تھے کہ اس دور میں
صحابہ کی اولاد میں کوئی دوسرا نہیں
ہے جو کاروبار سلطنت سنبھال سکے
.. چنانچہ عبداللہ بن عمرؓ سے انہوں
نے کہا تھا کہ میں اگر یزید کو نہ بناؤں
تو خطرہ ہے کہ رعیت کو اپنے بعد ایسے
چھوڑ جاؤں گا جیسے بدشتر بکریاں
کہ جن کا کوئی چرواہا نہ ہو۔

اسی ذیل میں ابن کثیرؒ نے امیر معاویہؓ کی وہ گفتگو بھی نقل کی ہے جو انہوں نے حضرت عثمانؓ کے بیٹے سعید بن عثمانؓ سے اس معاملہ میں کی تھی۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ سعید نے یزید کے مقابلے میں اپنا استحقاق جتایا تھا اس پر امیر معاویہؓ نے وہ بات کہی تھی مگر طبری اور ابن اثیر کے مطابق اصل بات یہ تھی کہ اس زمانے میں جب کہ یزید کی ولی عہدی کا قضیہ چھڑ رہا تھا سعید نے اصرار شروع کیا کہ ان کو خراسان کی ولایت دے دی جائے امیر معاویہؓ نے معذرت کی کہ وہاں تو ابن زیاد کی تحویل میں ہے۔ اس پر سعید بگڑ گئے اور کہا کہ تم جو کچھ ہو میرے باپ کی وجہ سے ہو اور آج تم نے اس طرح کا جواب دیکر حال یہ ہے کہ اپنے بیٹے کے لیے تم خلافت کا بندوبست کر رہے ہو۔ حالانکہ میں کیا اپنی ذات سے اور کیا اپنے ماں باپ سے ہر لحاظ سے یزید پر فائق ہوں۔ اس پر امیر معاویہؓ کا جو جواب نقل کیا گیا ہے وہ ابن کثیر نے اپنے مذکورہ بالا بیان ہی کے ذیل میں نقل کیا ہے کہ امیر معاویہؓ نے جواب میں کہا کہ ۔

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۸۰۔

بے شک تمہارے وعدے کے احسانات ناقابل انکار ہیں اور تمہارے باپ بے شک
یزید کے باپ سے بہتر ہی تھے، تمہاری ماں بھی یزید کی ماں سے اس بنا پر
فائق کہ وہ قریشی ہیں اور یزید کی ماں کلابیہ کی۔ لیکن تم جو اپنے بارے
میں کہتے ہو تو سنو کہ تمہارے جیسے اگر تم سے بھی ہو سارا غوطۂ دمشق بھر جائے
تب بھی یزید مجھے تم سب سے محبوب تر ہوگا۔[1]

گویا ابن کثیر کہنا یہ چاہتے ہیں کہ گو حضرت امیر معاویہؓ کے اس بیٹے میں محبت پدری کا بھی دخل تھا مگر تنہا یہ بات نہیں تھی بلکہ وہ یزید کو معیار مملکت کے لئے اہل تر بھی جانتے تھے۔
اسی سیاق میں وہ مزید لکھتے ہیں کہ :-

وروی عن معاویۃ انہ قال	ہم معاویہ کے سلسلے میں نقل کرچکے ہیں
یوما فی خطبتہ اللّٰہم ان	کہ انہوں نے ایک دن اپنے خطبے میں کہا
کنت تعلم انی ولیتہ لانہ فیما	خدایا اگر تو جانتا ہے کہ میں نے
اراہ اھل لذلک فاتمم لہ	اس کو ولی عہد اس کی اہلیت کی بنا پر
ما ولیتہ وان کنت ولیتہ	ولی عہد بنایا ہے تو اس ولایت کو تو
لانی احبہ فلا تتمم لہ	تکمیل تک پہنچا دے اور اگر میں نے
ما ولیتہ[2]	اس لئے کہ مجھے اس سے محبت ہے
	تو پھر اسے تو پورا نہ ہونے دے۔

اس خطبے کے پیش نظر جو منبر پر دوران جمعہ دیا گیا بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس کے بعد اس ہنگامے کی گنجائش نہیں رہتی کہ یزید کی ولی عہدی بربنائے محبت تھی یا بربنائے اہلیت[3] اور واقعہ یہ ہے کہ اس دعا کے ثبوت میں اگر کوئی کلام نہ ہو تو پھر بدگمانی واقعی بڑے دل گردے کا کام ہے۔

---

[1] البدایہ والنہایہ جلد ۸ [2] ایضاً [3] حضرت معاویہ اور تاریخی حقائق۔ از مولانا تقی عثمانی۔

اس عرض ابن کثیر کے تذکرہ بالا بیان کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ حضرت امیر معاویہؓ کو یزید کی دینی حیثیت پر اصرار اس لیے نہیں تھا کہ وہ ان کا بیٹا ہے بلکہ بتانے اصرار یہ تھا کہ وہ اس کام کا اہل ہے کہ یہ صفات ایمان سے تھے۔ گزشتہ باب میں بھی دو روایتیں ہم دیکھ آئے ہیں کہ حضرت معاویہؓ نے ایک تو عوام کی مجلس میں اور دوسرے اپنے مکتوب میں صاف طور پر یزید کی اہلیت اور شخصیت کا حوالہ دیا ہے جس کو بالکل نظر انداز کرنا تو بہر حال مناسب نہیں ہوگا

ابن خلدون کا کلام

ابن خلدون نے اپنے شہرہ آفاق "مقدمہ" میں اس مسئلہ پر بہت شرح و بسط سے کلام کیا ہے۔ آئیے دیکھیں اس سے کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> امامت اور خلافت کے معنی اصل میں امت کی دینی اور دنیاوی مصالح کی نگرانی اور حفاظت کے ہیں۔ پس امام لوگوں کے مصالح کا امین اور ان کی بہبود کا ذمہ دار ہے۔ اور جب وہ اپنی زندگی میں اس کا ذمہ دار ہے اور اسے مسلمانوں کی اصلاح و بہبود عزیز ہے تو قدرتی طور پر اس کی خواہش بھی یہی ہونی چاہیے اور اس کا اخلاقی فریضہ بھی ہے کہ اپنی موت کے بعد کے لیے بھی ان کی بھلائی کی فکر کرے اور کسی ایسے آدمی کو قائم مقام کر جائے جو اسی کی طرح ان کے معاملات کی دیکھ بھال کرنے والا ہو اور لوگ اس سے اسی طرح مطمئن رہیں جیسے اس کے پیشرو سے مطمئن تھے (اسی کا نام ولایت عہد ہے اور یہ شرعاً بالکل جائز ہے کیونکہ اس کے جواز پر اسی طرح امت کے انعقاد امامت کا اجماع ہو چکا ہے۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے صحابہؓ کی موجودگی میں عمرؓ کو اسی طرح قائم مقام بنایا تھا جس کو صحابہؓ نے جائز ٹھہرایا اور عمرؓ کی اطاعت اپنے اوپر لازم کر لی۔ بعد ازاں جب

حضرت عمرؓ کی وفات کا وقت آیا تو آپ نے چھ شخص نامزد فرما کر مشورہ جن میں سے کسی ایک کو
چھ صحابہ کو سونپ دیا کہ وہ شوریٰ کر کے خلافت کسی ایک کے سپرد کر دیں
پھر ان میں سے بعض بعض پر فیصلہ چھوڑ کر ہٹ گئے یہاں تک کہ معاملہ عبدالرحمٰن
بن عوف کے اختیار کا رہ گیا۔ پس انہوں نے جستجو سے ہر ایک سے مشورہ کر کے عام
مسلمانوں کے خیالات کا جائزہ لیا تو عثمانؓ اور علیؓ پر سب کو متفق پایا۔ اب
ان دو میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا تو انہوں نے عثمانؓ کی بیعت کو ترجیح
دی کیونکہ وہ نہایت سختی کے ساتھ شیخین ابوبکرؓ و عمرؓ کی اقتدا پسند کرتے تھے
اور اس باب میں عبدالرحمٰن بھی ان کے ہم خیال تھے کہ ہر ایک موقع پر اجتہاد کے
بجائے شیخین کی اقتدا کرنی چاہیے۔ چنانچہ عثمانؓ کی خلافت منعقد ہو گئی
اور سب نے ان کی اطاعت پسند بغیر کسی ـــــــ الغرض دونوں موقعوں پر جماعت صحابہ کا
کی اولیٰ تصدیق ہو چکی تھی کسی ایک نے بھی اس بیعت پر انکار اور اعتراض نہیں کیا
پس اس سے ثابت ہو گیا کہ تمام صحابہ کرام بیعت کے جواز پر متفق تھے اور
اجماع جیسا کہ معلوم ہے حجت شرعی ہے۔ پس امام اس معاملہ میں متہم نہیں ہو سکتا
اگرچہ وہ یہ معاملہ اپنے باپ یا بیٹے کے حق میں کیوں نہ کرے۔ اس لیے کہ
جب اس کی خیر خواہی پر اس کی زندگی میں وثوق ہو تو مرنے کے بعد تو بدرجۂ
اولیٰ اس پر کوئی الزام نہیں آنا چاہیے کیونکہ زندگی بھر اپنے آپ کو خیر خواہ
ثابت کر چکا ہے تو مرتے وقت وہ اس کا الزام اپنے سر لے کر جانا کبھی گوارا
نہ کرے گا۔ بعض لوگوں کی رائے ہے کہ باپ اور بیٹے کو ولی عہد بنانے میں امام
کی بابت تہمت کی جا سکتی ہے اور بعض صرف بیٹے کے حق میں یہ رائے رکھتے
ہیں۔ مگر ہمیں ان دونوں سے اختلاف ہے۔ ہمارے نزدیک کسی کی بھی صورت
میں بھی بدگمانی کی کوئی وجہ نہیں ہے اور خاص کر ایسے موقع پر کہ جب اس کی ضرورت

ایسی کوئی دلیل ہو مثلاً کسی مصلحت کا حصول یا کسی مفسدہ کا ازالہ اس میں مضمر ہو تب تو کسی بدگمانی کے سوء ظن کی کوئی وجہ ہی نہیں ۔ جیسے کہ معاویہؓ کا اپنے بیٹے یزید کا ولی عہد بنانے کا واقعہ ہے تو اگر معاویہؓ کا لوگوں کے عمومی اتفاق کے ساتھ ایسا کرنا اس باب میں بجائے خود ایک حجت ہے اور پھر انہیں متہم بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے پیش نظر بجز اس کے کچھ نہیں تھا کہ امت میں اتفاق باہمی برقرار رہے ۔ اور اس کے لیے ضروری تھا کہ اہل حل و عقد میں اتفاق ہو اور اہل حل و عقد حضرت یزید ہی کو ولی عہد بنانے پر متفق ہو سکتے تھے کیونکہ وہ بنو امیہ ہی میں سے تھے اور بنی امیہ اس وقت اپنے میں سے باہر کسی کی خلافت پر راضی نہیں ہو سکتے تھے ۔ اور ان کی ناراضگی سخت افتراق و اختلاف کا باعث ہوتی ، کیونکہ وہ قریش بلکہ پوری ملت کا سب سے بڑا بااثر طاقتور گروہ انہی ضرورتوں کے پیش نظر معاویہؓ نے یزید کو ولی عہدی کے لیے ان حضرات پر ترجیح دی جو اس کے زیادہ مستحق سمجھے جاتے تھے اور افضل کو چھوڑ کر مفضول کو اختیار کیا تاکہ مسلمانوں میں جمعیت اور اتفاق باقی رہے جس کی شارع کے نزدیک بڑی اہمیت ہے ۔[1]

مزید لکھتے ہیں کہ :-

خلفائے اربعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے عہد میں اور معاویہؓ کے دور میں ایک بہت بڑا فرق ہو گیا تھا اور وہ یہ تھا کہ خلفائے اربعہ کے دور میں بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ شیخین کے دور میں مسلمانوں کی طبیعتوں پر دین کی گرفت بہت سخت تھی ، ان کی پسند و ناپسند اور رضا و عدم رضا کا معیار صرف دین تھا اور ان کا

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ولی عہدی کا بیان ص ۱۶۵-۱۶۶ مطبوعہ مصر

رہی پھر انہیں بغاوت سے باز رکھنے کے لیے کافی نہ ہو، دینی نقطۂ نظر سے نامناسب تھی اور پھر اس بات پر آمادہ کر دیتا تھا جس میں بڑی بدنامی ہوتی۔ پس اب تیسرا بچا ہے جس سے، پہلے بعد کے لیے خلیفہ کے طور پر کسی کا انتخاب کیا جائے کہ منتخب کیا ہوا دینی نقطۂ نظر سے منتخب ہونا چاہیے تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی وجہ ترجیح ان کے یہاں نہیں تھی۔ بس یہی کچھ دیکھ کر وہ چاہتا ہے امامت کسی کو سونپ دیتے اور پھر اس شخص کو امر کے دینی منصب کے سپرد کر دیتے جو اس وقت بہت ہی حساس اور قابلِ اعتماد تھا، لیکن ان کے بعد حالات بدل گئے بلکہ معاویہ کے دور جب سے شروع ہوا تو وہ تغیر و تبدل کی صورت پر آگے بڑھے تھے اس وقت اسی طرح ظاہر ہو گئے تھے۔ ایک تو وہ عصبیت جو دین کے تقاضوں کے سبب دب گئی تھی بلکہ دینی عصبیت میں تبدیل ہو گئی تھی، اس دور سے نکل کر اپنی جبلی انتہا یعنی ملوکیت پر پہنچ گئی تھی، اور دوسرے دینی اخلاق کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ لہٰذا اب امت کی شیرازہ بندی اور جماعت کے اجتماعیت کی بقا کے لیے شخصی حکومت اور عصبیت کا سہارا لینا ضروری ہو گیا تھا یہ کہ سارا اقتدار ایک ایسے فرد واحد کے ہاتھ میں دے دیا جائے جس کی ذات کو سب بڑی حسن و خوبی کی حیثیت سے پذیرائی حاصل ہو۔ پس اگر معاویہ[1] کسی ایسے شخص کو ولی عہد نامزد بنا جاتے جس کو وہ اور سب قوم کی عصبیت نہ چاہتی ہوتی تو وہ یقیناً اسے کنارہ کش کر دیتے۔ تو ان کی یہ کامیابی ختم الٹ دی جاتی، نظم خلافت درہم برہم ہو جاتا اور امت کا شیرازہ بکھر جاتا۔ تم نہیں دیکھتے کہ مامون رشید جو کہ خلیفہ نے زمانے کی تبدیلی کا یہ حکم ظاہر کر کے علی بن موسیٰ بن جعفر صادق کو اپنا ولی عہد مقرر کر دیا تھا تو کیا نتیجہ ہوا۔ عباسی خاندان نے اس سے سختی میں بغاوت کر دی، تمام معاملات درہم برہم ہو گئے اور سب لوگ بغاوت پر آمادہ ہو گئے

---

[1] یعنی معاویہ

اس کلام پر ایک تنقیدی نظر

ابن خلدون کے کلام سے معلوم ہوا کہ ان کی نظر میں معاملہ کی نوعیت یہ تھی کہ امت کے سامنے یزید کے لیے ولی عہدی کا فیصلہ کیا جا رہا تھا اس دور میں امت کے اتحاد اور اس کی اجتماعیت کے بقا کے نقطۂ نظر سے اس کے سوا کوئی دوسرا فیصلہ ممکن نہیں تھا کیونکہ اس دور میں دینی ضمیر اصل اجتماعی طاقت نہیں رہا تھا بلکہ قبائلی عصبیت نے پھر اصل اجتماعی طاقت کا مقام حاصل کر لیا تھا اور حالات کے اس نقشے میں بنی امیہ کی عصبیت سب سے بڑی عصبی طاقت تھی اور یزید ہی ایسا ولی عہد تھا جس کے بارے میں سب سے زیادہ اعتماد کیا جا سکتا تھا کہ یہی طاقت اس کی اطاعت گزار ہو کر اور خلافت کی پشتی بان ثابت ہوگی

اجتماع و عمران کے معاملے میں ابن خلدون کے تجربوں اور فیصلوں کو جو اہمیت حاصل ہے اس سے انکار کسی کے لیے ممکن نہیں۔ اس لیے ان کا یہ تجزیہ کسی خوش عقیدگی کی بنا پر نہیں بلکہ سنجیدگی کی بنا پر لائق مطالعہ ہونا چاہیے کہ یزید کی ولی عہدی کے پیچھے کوئی اور چیز نہیں بلکہ صرف اس اجتماعی مصلحت کا شعور کام کر رہا تھا کہ اس کے تغلب کے ذریعہ خلافت کا ادارہ ٹوٹ پھوٹ سے بچ جائے گا۔ اور اس تجزیے کی روشنی میں اگر پورے اطمینان کے ساتھ یہ سمجھنے کی گنجائش ہے کہ حضرت معاویہ کو اپنی تجویز پر اصرار تھا اس کی اصل وجہ امت کی مصلحت ہی تھی ـــــ لیکن یہ سمجھنا کہ یہ مصلحت آمیزی بالکل بجا ہی تھی اور اس میں کوئی کلام نہیں کیا جا سکتا تھا جیسا کہ بظاہر ابن خلدون کا نقطۂ نظر ہے سو یہ صرف اس وقت ممکن ہے جبکہ ہم ابن خلدون کا یہ بیان بھی تسلیم کر لیں کہ یزید کی ولی عہدی سے اختلاف کرنے والی صرف ایک شخصیت عبداللہ بن زبیر کی تھی[1]

---

[1] مقدمہ ابن خلدون بیان ولایت عہد صفحہ 193

بے شک مگر واقعہ میں ایک عبداللہ بن عمرؓ کے علاوہ کوئی قابل ذکر شخصیت نہ تھی جس کو یزید کی ولی عہدی کے مسئلے سے اختلاف رہا ہو تو پھر ابن خلدون کی اس رائے سے اتفاق ہی کرنا پڑے گا "ایک یا دو آدمی کے اختلاف سے بھلا کہاں بچا جا سکتا ہے اور کیونکر اسے کوئی بڑی اہمیت دی جا سکتی ہے[۱]۔" مگر ابن خلدون کا یہ بیان تو بالکل ایک لغو بیان ہے۔ چار اہم شخصیتیں یعنی عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر، عبدالرحمن بن ابی بکر اور حسین بن علی رضی اللہ عنہم (اور خود انہی کے بیان کے مطابق اس سلسلے میں مخالفت کرنے والی رہی ہیں۔ حتیٰ کہ ابن خلدون نے تعداد بھی بتا دی ہے اور ان چاروں کا نام دیا ہے) اور واقعہ کی اس صورت میں کہ یہ چار شخصیتیں بہت صاف اور نمایاں طور پر مخالف تھیں، یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے جو کچھ از راہ مصلحت اندیشی کیا تھا وہ واقعی بھی پوری طرح مصلحت عامہ پر مبنی بات تھی کیونکہ ان چار آدمیوں کا اختلاف ہوتے ہوئے یہ بات ماننا مشکل ہے کہ یزید کی ولی عہدی کے ذریعے امت کو انتشار و افتراق سے بچانے کا اطمینان کیا جا سکتا تھا۔

یہ کیسے چار آدمی تھے؟ عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر تو اس مرتبے کے لوگ تھے کہ جب حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان "تحکیم" کا قضیہ پیش آیا کہ دو حکم بیٹھ کر قرآن کی رو سے فیصلہ کریں کہ اس اختلاف کا حل کس طرح ہونا چاہیے؟ اور ان دو حکموں (حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ) کا اجلاس اس فیصلے کے لیے منعقد ہوا تو اس کی غیر معمولی اہمیت کی بنا پر اسلامی عرب پر کچھ چھایا ہوا تھا، اس کے نتیجہ خیز ہونے پر امت کی اصلاح و بقا کا انحصار تھا۔ جن اہم لوگوں کو حکمین نے اس موقع پر بلانے کی خاص ان سے درخواست کرنے کی ضرورت سمجھی کہ وہ ضرور اس موقع پر موجود ہوں تو ان میں یہی دو (عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ) تھے جن کا نام کے ساتھ تاریخ ذکر کرتی ہے۔

---

[۱] ایضاً

فلما اجتمع الحكمان بأذرح	جب دونوں حَکَم اذرُح[1] کے مقام پر جمع ہوئے
وافاهم المغيرة بن شعبة	تو بہت سے لوگ وہاں پہنچے جن میں
فيمن حضر من الناس فأرسل	مغیرہ بن شعبہ بھی تھے نیز دونوں حکمین نے
الحكمان الى عبد الله بن عمر	عبد اللہ بن عمر اور عبد اللہ بن زبیر کے
بن الخطاب وعبد الله بن	پاس بلاوا بھیجا کہ وہ اس موقع
الزبير في اقبالهم في رجال	پر ضرور آجائیں
كثير[2]	

طبری[3] کی روایت کے یہ الفاظ [illegible] ہیں۔ مصنف عبد الرزاق[4] کی عبارت بہت صاف ہے لہٰذا ہم اسے بھی نقل کرتے ہیں:۔

فلما حكم الحكمان ثم اجتمعا	پس جب دونوں کو حکم بنا دیئے گئے تو
بأذرح وافاهم المغيرة بن	وہ اذرح میں جمع ہوئے اور مغیرہ بن شعبہ
شعبة وارسل الحكمان الى	بھی وہاں پہنچ گئے اور دونوں حکمین نے
عبد الله بن عمر والى عبد الله	عبد اللہ بن عمر اور عبد اللہ بن زبیر کو
بن الزبير في رجال كثير	(بلوا بھیجا) اور ان کے
من قريش[5]	علاوہ قریش کے بہت سے لوگ پہنچے۔

---

[1] یہ شام کے حدود میں ایک مقام کا نام ہے۔ [2] طبری ج ۶ ص ۳۲۔ [3] یہ ابوبکر عبد الرزاق بن ہمام صنعانی م (۲۱۱ھ) کا ترتیب کیا ہوا حدیث کا مجموعہ ہے۔ امام عبد الرزاق امام بخاری کے اساتذہ میں ہیں۔ اس کتاب کے نسخے ابھی تک قلمی تھے ۱۳۹۰ھ میں پہلی بار مطبوعہ شکل میں سامنے آئی ہے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی دامت برکاتہم نے اس کو ایڈٹ کیا ہے اور یہ گیارہ جلدوں میں تمام ہوئی ہے [4] ج ۵ ص ۴۶۴۔ مزید برآں امام بخاری کی بھی ایک روایت ہے جس سے حضرت عبد اللہ بن عمر کا اس موقع پر بلایا جانا معلوم ہوتا ہے۔ دیکھئے کتاب المغازی باب غزوة الخندق کی روایت (ج ۲ ص ۵۸۹) ہے۔ اس میں [illegible] نیز عن عکرمۃ عن ابن عمر۔ صاحب [illegible] (فتح الباری) نے بھی حضرت [illegible] ان واقعات کے سلسلے میں نقل کیا ہے جس کا تعلق یزید کی [illegible] معاملہ [illegible]

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی ہردلعزیزی کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اس موقع پر حکمین کے درمیان ایک غیر جانبدار شخصیت کی تلاش میں سب سے پہلا نام عبداللہ بن عمرؓ ہی کا آیا کہ علیؓ اور معاویہؓ دونوں کو چھوڑ کر ان کو خلیفۂ اسلام مان لیا جائے۔

قال عمرو یا ابا موسیٰ أأنت
علی ان نسمی رجلا یلی امر
هذه الامة فسمّه لی فان
اقدر علی ان تابعك فلك
علیّ ان اتابعك والا فلی علیك
ان تتبعنی قال ابو موسیٰ
اُسمی لك عبد الله بن عمر
وكان ابن عمر فیمن اعتزل۔

عمرو بن العاص نے ابو موسیٰ سے کہا کیا آپ
اس امر پر راضی ہیں کہ ہم دونوں یہاں بیٹھ کر
کریں پھر کہا کہ ابو موسیٰ کیا تم بتا سکتے
ہو کہ ہم امت کی سربراہی کے لیے کس ایک
شخص کو نامزد کریں؟ اگر بتا سکتے
ہو تو نامزد کرو میرے لیے لازم ہوگا کہ
تمہارا نامزد کیا ہوا آدمی قبول کر لوں یا
جس کو میں نامزد کروں وہ تم قبول کر لو
تو اس پر ابو موسیٰ اشعری
نے کہا میں عبداللہ بن عمرؓ کا نام تجویز کرتا
ہوں ۔ اور ابن عمرؓ ان لوگوں میں سے
تھے جو اس دور کے اختلافات سے الگ رہے تھے

الغرض ان افراد کا یہ مقام ہو کہ مشکلات کے وقت یہ گتھی سلجھانے جاتے ہیں ان کی موجودگی بطور خاص ضروری تھی۔ کبھی یہ حالت ہوتی ہو اور قول حق کے لیے ان کا انتظار کرتے تھے۔

(بقیہ ۱۲۲) کا حوالہ ملتا ہے کہ حضرت معاویہؓ کا تشریف لانا صحیح نہیں ہے یہ کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ اس حدیث کا متن مختلف ہے جیسا کہ مصنف عبدالرزاق کی مذکورہ بالا روایات کے الگ حصے سے تعلق معلوم ہوتا ہے۔ دیکھئے مصنف ج ۵ ص ۴۶۵ ۔ فتح الباری ج ۷ ص ۳۲۵ (طبع جدید مصر)

سے ابن حجر ج ۱ ص ۲۲ مصنف ج ۵ ص ۴۶۵ ۔ ایک اہم فائدہ ---- اس مقدمہ کے لیے ملاحظہ ہو ضمیمہ ---- اس باب کے آخر میں ۔

اور مزید برآں ان میں سے ایک کا یہ مذہب بھی تھا کہ اس کی ذات میں مسند خلافت کی پیچیدگی کا حل پوشیدہ ہے۔ جبار یا ہو ایسے اشخاص کے اختلافات کے ساتھ کیسے قطعی توقع کی جا سکتی تھی کہ یزید کے ماتحت نظم خلافت استوار رہ سکے گا؟ پھر یہ وہی نہیں ہے حضرت حسین بن علیؓ بھی خلافت کے لیے حتمی طور پر موجود تھے۔ اور تنہا انہی کا اختلاف اس بات کا اندیشہ رکھنے کے لیے کافی تھا کہ یزید کے خیالات کا معیار آسان نہیں ہو سکے گا اور اگر عبدالرحمن بن ابی بکرؓ بھی ولی عہدی کی کارروائی کے دنوں میں بقید حیات تھے تو وہ بھی بالکل شہرت یافتہ تھے۔ خود حضرت معاویہ کا جو وصیت نامہ یزید کے لیے نقل کیا گیا ہے وہ اگرچہ بعض وجوہ سے مشکوک ہے تاہم اس میں بھی یہی کہ ان چاروں اشخاص کے اختلاف سے آگاہی اور مناسب ہدایات دی گئی ہیں۔

بہرحال یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت کے حالات میں یزید کے ماتحت ادارہ خلافت کو کم سے کم خطرہ ہو سکتا تھا۔ لیکن وہ بات جو ابن خلدون نے کہی ہے کہ یزید کی ولی عہدی کے ذریعہ ادارۂ خلافت کو کسی خطرات سے محفوظ کر دیا گیا، یہ کچھ زیادہ ہی بات ہے جبکہ عبداللہ بن عمرؓ نے بیٹی بیٹے کے خلافت کو ولی عہد بنانا پسند نہیں کیا جیسا کہ ان کا مزاج تھا اور جیسا کہ حسنؓ کے بارے میں حضرت معاویہؓ کا اندازہ تھا اور بے شک حضرت حسینؓ کے معاملے میں بھی حضرت معاویہ کا اندازہ صحیح تھا کہ اگرچہ کوفی انہیں حرکت میں لائے بغیر نہ چھوڑیں گے مگر وہ یزید کی عزت ان کے لیے کافی ہو جائیں گے جیسا کہ ان کی پرانی عادت رہی ہے۔ مگر عبداللہ بن زبیرؓ کی سرگرمی شدید رہی۔ یہ وہ آدمی تھا جس سے حضرت معاویہؓ کو بھی پورا خطرہ تھا حضرت حسینؓ کی شہادت کے اثرات سے مل کر بالآخر یزید کی خلافت کے لیے موت کا پیام بن ہی گئی۔ ایسی موت کہ پھر اس گھرانے میں سے خلافت نکل گئی۔ اس لیے اگرچہ یہ مسلم ہے کہ حضرت معاویہ کا یزید کو ولی عہد بنانا اعلیٰ مصلحت اندیشی ہی کے ماتحت تھا کہ ادارہ بھی اس کے ماتحت، اگر یہ تسلیم کیا مشکل ہے کہ ایسے اہم افراد کے اختلافات کے

ساتھ یہ تجویز مستقبل اندیشی کا بہترین نمونہ بھی تھی۔

اہلِ اختلاف کے اختلاف کی بنیاد

یزید کی ولی عہدی سے جن حضرات نے تا بایں اختلاف کیا اور آخر تک اختلاف جاری رکھا یعنی حضرت عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، عبدالرحمن بن ابی بکرؓ اور حضرت حسین بن علیؓ ان کے اختلاف کے سلسلے میں یہ بات بڑی طرح مشہور ہو گئی ہے کہ یزید ایک فاسق و فاجر انسان تھا اس لیے ان حضرات کو یہ بات قبول نہیں تھی کہ اُسے اسلامی خلافت جیسا مقدس اور محترم منصب دیا جائے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جو حضرات حضرت معاویہؓ کی زندگی میں سرگرم اختلاف رہے تھے ان کی زبان سے کہیں کوئی لفظ ایسا نہیں ملتا جس سے اس شہرت عام کی تصدیق ہو سکتی ہو۔ ان حضرات کا صرف ایک اختلاف ریکارڈ پر ہے کہ یہ اسلام میں قیصریت و کسرویت کی بنیاد ڈالی جا رہی ہے کہ باپ کے بعد بیٹا حکومت سنبھال لے خلفائے راشدینؓ کے انتخاب کے طریقے سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ باب میں وہ گفتگوئیں طبری اور ابن اثیر وغیرہ کے حوالے سے گزر چکی ہیں جن میں ان اختلاف کرنے والے حضرات نے حضرت معاویہؓ اور ان کے نمائندوں مروان بن الحکم وغیرہ سے اپنے اختلاف کی بنیاد بیان کی ہے۔ ان گفتگوؤں اور ملاقات میں سوائے خلافت کے کوئی دوسری بات نہیں۔ مگر جن لوگوں کے متعلق یہ نسبت دی ہے اصل بات تسلیم اور بالکل ایک تاریخی واقعہ بن گئی ہے کہ حضرت حسینؓ اور ابن زبیرؓ وغیرہ کے اختلاف کی سبب وجہ تھی کہ یزید ایک زبردست فاسق و فاجر تھا۔ ان کی جرأت اولیٰ کا عالم تو یہ ہے کہ جو اس وجہ ہی پر نہیں رکتے بلکہ ہو سکتی ہے حقیقت معاویہؓ کیونکہ صحابہ کرامؓ کو مطعون کرنا ان کا دین و مذہب ہے ان ایسے لوگوں کا کام تو بہت آسان ہے راشد حضرت معاویہؓ کی ذات میں ایسا ظن ہے کہ یزید کا اس طرح سے فاسق و فاجر تھا کہ یہ خیال مسلمانوں کے دلوں میں بٹھا دیا جائے کہ ایسی نااہل اولاد کی ان سے جس کو

صحابی رسول کہا جاتا ہے تخت خلافت پر بٹھایا اور اس وقت موجود کئی اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے بھی چند ایک کے سوا کسی کو توفیق نہ ہوئی کہ اس کی مخالفت کرے۔ جناب علی نقی صاحب لکھنوی کی کتاب "شہید انسانیت" کا ذکر پچھلے باب میں آچکا ہے۔ ایک خوفناک غلط بیانی کی مثال وہاں دی گئی تھی اسی طرح کی ایک دوسری مثال اس باب کی بحث سے متعلق ہے۔ باب ۵ میں البدایہ کے حوالے سے یہ روایت گزر چکی ہے کہ گورنر مدینہ مروان بن الحکم نے حضرت معاویہ کی ہدایت پر اہل مدینہ کے سامنے یزید کی ولی عہدی کی تجویز منظوری کے لیے رکھی تھی تو حضرت عبدالرحمن بن ابی بکرؓ نے نہایت سختی سے رد کرتے ہوئے کہا کہ کیا یہ کسرویت اور قیصریت کی بنیاد ڈالی جا رہی ہے؟ اس تجویز میں ہرگز دین و ملت کا مفاد ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ اس سے زیادہ حضرت عبدالرحمن کا کوئی تبصرہ نہیں تھا اور یزید کے کسی فسق و فجور کا ذکر نہیں تھا۔ مگر جناب علی نقی صاحب نے اسی واقعہ کا حوالہ دیتے ہوئے حضرت عبدالرحمن کے منہ میں یہ الفاظ بھی ڈال دیے ہیں کہ:۔

"ہم ہرگز اس شرابی اور زانی کی بیعت نہ کریں گے۔" ص۱۵۔

بھلا کون سمجھے گا کہ قبلہ اپنی طرف سے ایک جھوٹ کا اضافہ کر رہے ہیں؟ مگر واقعہ یہی ہے کہ بالکل خالص جھوٹ ہے جس کا کوئی سر پیر نہیں۔ حضرت ابن ابی بکرؓ نے یہ الفاظ نہیں کہے۔ گو سنی سنائی باتوں پر اپنا خیال قائم کر لینا ٹھیک نہ تھا مگر علی نقی صاحب کی علمی شخصیت میں راقم پہلے ہی سے متاثر ہو چکا ہے، اس گمان میں مزید اضافہ لندن کے "مرکز سید خوئی" کے لائبریرین صاحب سے کیا جن کے پاس راقم السطور کچھ کتابوں کی تلاش میں گیا تھا۔ لائبریرین صاحب (جن کا میں ممنون ہوں کہ چند کتابیں انہوں نے مجھے چند ہفتے کے لیے مستعار دیں) افسوس ہے نے مجھے کچھ زیادہ ہی بلا صلاحیت یہ مشورہ بھی دیا کہ اس موضوع پر کچھ لکھنے سے پہلے میں مولانا سید علی نقی صاحب کی "شہید انسانیت" ضرور دیکھ لوں۔ ان کے مشورہ چونکہ موصوف کے اس نوٹ کے پس منظر میں سے ملا تھا کہ پتہ نہیں یہ شخص کیا راقم

کیا ستم" ڈھانے کی تیاری کر رہا ہے۔ اس لیے مجھے قدرتی طور پر گمان ہوا کہ شہید ملت مرحوم شیعی نقطۂ نظر کے سلسلے میں کوئی علمی وزن کی کتاب ہوگی۔ اس لیے بطورِ خاص اس کو باہر سے منگانے کا اہتمام کیا گیا۔ مگر اس کا جو حال نکلا وہ اس کتاب سے دی گئی ان مثالوں سے ظاہر ہے۔

بہرحال پروپیگنڈے کے فن سے کام لے کر یہ بالکل بے اصل بات ایک ذاتی حقیقت بنا دی گئی ہے کہ حضرت حسین وغیرہ کو یزید کی ولی عہدی قبول کرنے سے انکار اس کے فسق و فجور کی وجہ سے تھا۔ حالانکہ تاریخ کے بیانات میں اس کا سلسلہ کہیں بھی پتہ نہیں ہے بلکہ جیسا کہ اپنے موقع پر آئے گا ولی عہدی کی بیعت کے چار سال بعد سنہ ۶۰ھ میں جب حضرت معاویہؓ کے انتقال پر یزید کے خلاف عملاً حضرت حسینؓ نے اس کے خلاف کھڑے ہونے کا فیصلہ فرمایا تب بھی یزید کے کسی فسق و فجور کی بات آپ کی زبان پر کبھی نہیں آئی حتی کہ کوفہ کا سفر اور شہادت؛ ساری منزلیں گزر گئیں مگر کہیں یہ بات "نالائق ہے شرابی ہے" آپ کی زبان پر نہیں آئی۔ بات صرف اتنی ہی تھی کہ باپ کی طرف سے بیٹے کی ولی عہدی ان حضرات کے نزدیک اسلامی اصولِ خلافت کی رو سے صحیح نہیں تھی یا مصلحت نہیں تھی۔ مزید برآں اگر کچھ کہا جا سکتا ہے تو یہ ہے کہ جس کے واضح شواہد و قرائن موجود ہیں کہ یہ سب حضرات وہ تھے جو دراصل حضرت معاویہؓ کو اس منصب کا اہل نہیں سمجھتے تھے اور مصالحت کی بنا پر کہ وہ ایک مجبوری کے طور پر انھیں گوارا کرتے رہے تھے[1] بلکہ صاف کہا جائے تو ان میں سے شاید ہر ایک اپنے آپ کو بھی حضرت معاویہؓ کے مقابلے میں بجا طور پر بہتر سمجھتا تھا۔ حد یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ جیسے زاہد و متقی انسان کی بھی مخالفت سے

---

[1] یہ بات کہ یہ حضرات حضرت معاویہؓ سے مستفیض ہونے کے باوجود ان کے ساتھ نباہ کرتے رہے ہمارے اس بیان کے خلاف نہیں جاتی کیونکہ [illegible] کے ساتھ بھی کیا جانا ہے جبکہ ایک صحابیِ رسول [illegible] حق کے [illegible] سے تھی۔

ہو گا کہ شاید یہ سمجھنا مشکل ہو سکتا ہے کہ وہ بھی اس معاملے میں اپنی برتری کا احساس رکھتے تھے ان کے بارے میں یہی سوال کا اپنا بیان بخاری شریف کی اس روایت میں مذکور ہے جس کا ذکر ابھی چند صفحات پہلے ایک حاشیہ میں [illegible] کے حوالے سے گزر چکا ہے اس روایت کے مطابق حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے مابین جنگ کے موقع پر حکمین کے اجلاس میں اپنے جانے کا قصہ بیان کرتے فرمایا۔

فلما افترق الناس خطب معاوية	جب لوگ منتشر ہو گئے ابن عمرؓ کہتے ہیں
قال من كان يريد ان يتكلم فى	تحکیم ہوئی اور اس کے بعد جو
هذا الامر فليطلع لنا قرنه	حکم کے لوگ چلے گئے تو ایک مجلس میں
فلنحن احق به منه ومن ابيه	معاویہؓ نے عراقی لوگوں سے خطاب کیا
قال حبيب بن مسلمة فهلا اجبته	کہا اگر کسی کو اس سلسلہ خلافت میں
قال عبد الله فحللت حبوتي	دعویٰ ہو تو اپنا سر اٹھائے ہم
وهممت ان اقول احق بهذا	[illegible] اس سے اس کے باپ سے
الامر منك من قاتلك واباك	حق دار ہیں ابن عمرؓ یہ بیان سن کر
على الاسلام فخشيت ان اقول	معاویہ کے ایک طرفدار حبیبؓ بن مسلمہ
كلمة تفرق بين الجمع وتسفك	بولے تم نے کیوں جواب نہ دیا ! میں نے
الدم ويحمل فيها على غير [illegible]	کہا کہ میں نے اپنی نشست بدل
فذكرت ما اعد الله فى	کر جواب دینا چاہا تھا کہ تم سے زیادہ
الجنان[1] ۔	مستحق وہ ہے جس نے تم سے اور تمہارے باپ سے اسلام
	جنگ کی لیکن مجھے خیال ہوا کہ

---

[1] مصنف عبدالرزاق [illegible]
نے بھی بیان [illegible] مصنف کے [illegible] ہے [illegible]۔

امت کی جماعت میں تفرقہ ڈالا گیا ہے[1]
خونریزی کی آگ بھڑکا سکتی ہے اور دوسرے
بلاد میں سطوت بھی پھیلا سکتی ہے اور اسکے
بعد بہت سے اللہ کے بندوں کو گمراہ کیے
مجھ کو یہی ڈر لگا کہ رحمت [illegible]

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے جو جواب دینا چاہا تھا اگرچہ روک لیا اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں کو بھی اسلام میں سابقیت حاصل ہے کے لیے قرب نبوت کا فخر حاصل ہے وہ منصب خلافت کے زیادہ حقدار ہیں جن میں خود حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی داخل ہوتے تھے۔ لیکن اسی واقعہ کی ایک دوسری روایت جو الطبرانی کے بارے میں حافظ ابن حجر شارح بخاری بتلاتے ہیں کہ اس میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے یہ الفاظ بھی پائے جاتے ہیں کہ:

فحدثت نفسی بالدنیا	پھر اس وقت میں نے اپنے دل میں دنیا کی بات
فما حدثت نفسی بالدنیا قبل یومئذ[2]	اس دن سے پہلے کبھی حکومت کا خیال دل میں پیدا ہوا

ان الفاظ کی رو سے حضرت معاویہؓ کے مقابلے میں حضرت ابن عمرؓ کے دل میں آنے والی بات (اس وقت) تو ان کی اپنی ہی ذات سے متعلق ہو جاتی ہے۔

اس کے علاوہ حضرت حسینؓ جیسے خلافت حضرت معاویہؓ کے بارے میں کہتے تھے وہ تو کوئی ڈھکی چھپی بات ہی نہیں ہے باب دوم میں ان کا ایک خط خود حضرت معاویہؓ کے نام گزر چکا ہے جو صاف الفاظ میں بتلاتا ہے کہ وہ ان کی حکومت کو کیا سمجھتے تھے۔

بہرحال یہ بات کوئی راز نہیں ہے کہ ان حضرات نے اگرچہ حضرت معاویہؓ سے بیعت کر لی تھی، مگر ایک مجبوری کے سبب جس کی نوعیت پوری طرح پہلے کھولی نہیں گئی تھی۔ اور زیادہ وجہ

---

[1] یہ جزو اہم جملہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ کسی ایسے شخص پر ختم ہوا تھا جس کی امامت کے لیے اہل ہو چکی تھی مگر اس میں [illegible] تفصیل بیان نہیں کی گئی [2] فتح الباری کتاب المغازی غزوۂ خندق

دی گئی تھی جس کا اظہار حضرت ابن عمرؓ کے مذکورہ بالا بیان سے ہوتا ہے کہ وہ سابقین اولین و تابعین کے ہوتے ہوئے متاخرین کے لیے خلافت اسلامی کا حق نہیں مانتے تھے (الا یہ کہ وہ حضرات مصالح کی وجہ سے ان کو مجبوراً قبول کر لیا جائے) یہی کیا گنجائش تھی کہ وہ یزید کو ان جیسوں کی موجودگی میں خلیفۂ اسلام ماننے کے لیے تیار ہو جاتے! لہٰذا علاوہ ان حضرات کے اس صریح موقف کے کہ باپ کی طرف سے بیٹے کی نامزدگی اور گویا خلافت بطور وراثت ایک غیر اسلامی طریقہ ہے۔ یہ بات بھی تقریباً یقینی ہے کہ وہ یزید کو اس بنا پر بھی منصب خلافت کیلئے ناقابل قبول سمجھتے تھے کہ وہ ان سے عمر اور صلاحیت سے بھی قطعی طور پر فروتر تھے۔ لیکن یہ بات قطعی جھوٹ اور افتراء ہے کہ یزید کے بارے میں کسی فسق و فجور کا مسئلہ بھی اٹھایا گیا تھا۔ یہ مسئلہ اگر اٹھا ہے تو حضرت حسینؓ کی شہادت کے تین سال بعد کچھ اہل مدینہ کی طرف سے اٹھا ہے اور اسے رد کرنے والے بھی اسی مدینے میں حضرت حسنؓ و حسینؓ کے بھائی حضرت محمد ابن حنفیہ بن حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ جیسے حضرات بھی تھے جن کے رد کا ذکر انشاء اللہ آگے کیا جائے گا

یزید اپنے ایک خطبے کے آئینے میں

حضرت معاویہؓ کی وفات کے وقت تک یزید کے مزاج و کردار کا ایک اچھا نقشہ ہمارے خیال میں ان کا وہ مختصر سا خطبہ ہے جو اہل تاریخ کے بیان کے مطابق انہوں نے اپنے والد حضرت معاویہؓ کی وفات کے بعد دیا تھا۔ اس خطبے کے آئینے میں ان کی شخصیت ایک سنجیدہ باوقار اور ذی علم انسان کی نظر آتی ہے نہ کہ شراب و کباب، رقص و سرود اور لہو و لعب کے ایک رسیا کی۔

ابن کثیر لکھتے ہیں کہ معاویہ کا انتقال ہوا تو یزید حوارین[1] میں تھے۔ ضحاک نے یزید کو حوارین شہر میں اطلاع کرائی۔ جب وہ آئے تو ضحاک نے شہر سے باہر ان کا استقبال کیا۔ یزید باب توما سے اندر داخل شہر میں جانے کے بجائے قبرستان کا رخ کیا۔ والد کی قبر پر نماز جنازہ ادا کی پھر

---

[1] حوارین شام کے علاقۂ حلب میں ہے۔

سے فارغ ہو کر شہر میں آئے حکم دیا کہ الصلوٰۃ جامعۃ کی منادی کرائی جائے پھر اپنی اقامت گاہ خضراء میں داخل ہو کر غسل کیا اور لباس بدلا۔

ثم خرج فخطب الناس اول خطبة	پھر باہر آئے اور بحیثیت امیرالمؤمنین
وهو امير المؤمنين فقال بعد	لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے حمد و ثنا کے
حمد الله والثناء عليه اما	بعد کہا کہ لوگو! معاویہ اللہ کی رسیوں میں سے
الناس ان معاوية كان حبلا	ایک رسی تھے اللہ نے جب تک چاہا
من حبال الله مده الله ما شاء	لمبا کیا پھر اپنے حضور میں بلا لیا وہ پہلے
ثم قبضه اليه وهو خير ممن	والوں سے کمتر اور پچھلوں سے بہتر تھے
بعده ودون من قبله ولا ازكيه	لیکن میں اللہ کے سامنے ان کا تزکیہ کرنے
على الله عز وجل لانه اعلم	وہ اللہ کے نزدیک کیسے ہیں یہ وہی
به ان عفا عنه فبرحمته وان	کیونکہ وہی زیادہ بہتر جانتا ہے اگر اس نے
عاقبه فبذنبه وقد وليت الامر	معاف فرما دیا تو یہ اس کی رحمت ہوگی اور اگر
من بعده ولا ...... ؎	گرفت فرمائے تو یہ ان کے گناہوں کی وجہ
	ہوگا۔ اور آپ جانتے ہیں کہ ان کے بعد
	خلافت کی ذمہ داری مجھ پر ڈالی گئی ہے ؎

ہمارا خیال ہے کہ اس خطبے کی عبارت اس کا مضمون اور اس کا لہجہ خود اس شخص (یزید) کے بارے میں اس عام خیال کی تردید کرتی ہے جو کہ عباسی زمانے کے مؤرخین اس لیے پھیلانے میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ اس شخص کی حکومت کے زمانے میں اسی کے حکام اور لشکریوں کے ہاتھوں ریحانۂ رسول ﷺ جگر گوشۂ بتول حضرت حسینؓ کی شہادت کا المناک واقعہ پیش آیا۔ اور انہوں نے اپنے حکام سے اس کی بازپرس نہ کی تھی اس لیے اپنے کو اس سے متعلق تو بھی برا لکھ کے سزا دی ہو

؎ البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۴۳

قابل یقین ہو گئی۔ مگر یہ بات قطعی اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے کہ کسی کے ایک جرم کی سزا میں جو اس جرم سے پہلے کی اس کی زندگی کو بھی خواہ مخواہ بدنام کیا جائے۔ پھر جن لوگوں کے نزدیک جھوٹ سچ ہر طریقے سے صحابہ کرام کو بدنام کرنا ایک کار ثواب ہے ان کے لیے بالکل ٹھیک ہے کہ وہ پروپیگنڈے کا یہ تیر بھی جو بہت موقع کا ہے صحابہ کرام ہی کو نشانہ بنانے کی نیت سے چلائیں۔

یزید کا معاملہ اتنا نازک ہے کہ ان کے حق میں بالکل سیدھی اور معقول بات کہتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے، اس لیے یہ بات اچھی طرح سمجھ لی جائے کہ مذکورہ بالا خطبے سے ہم صرف یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ وہ بندروں اور چیتوں کے ساتھ کھیلنے والا، شراب و کباب میں غرق اور لہو و لعب میں بدمست اور زنا کاری کا رسیا انسان نہیں نظر آتا جیسا کہ بتایا جاتا ہے کیونکہ اس قماش کے لوگ ایسی متانت و شائستگی اور دین و دنیا کی نزاکتوں پر حاوی زبان نہیں بولا کرتے۔ رہا یہ کہ وہ کوئی بڑا متقی و پرہیزگار ہو یہ اس خطبے سے نہیں نکالا جا سکتا۔ ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ وہ جس نسل اور جس طبقے سے تعلق رکھتا تھا اس کے بارے میں بہترین قرنوں کی نسل اور صحابہ کرام کے طبقے والے تقویٰ و پرہیزگاری کی توقع تو بہرحال مشکل ہی سے کی جا سکتی ہے۔

ابن کثیر نے لکھا ہے کہ

وقد كان يزيد فيه خصال محمودة	یزید میں اعلیٰ درجہ کی عمدہ خصلتیں تھیں
من الكرم والحلم والفصاحة و	حلم و کرم فصاحت شجاعت
الشعر والشجاعة وحسن الرأي	اور سلطنت میں حسن تدبیر، اس کے ساتھ
في الملك وكان فيه أيضا إقبال على	اس میں خواہشات نفس کی طرف بھی
الشهوات وترك بعض الصلوات	میلان اور بعض اوقات نماز سے لاپروائی
في بعض الأوقات وإماتتها	بھی تھا اور نمازوں کے بارے میں

وقات الاوقات۔ ۱؎ بے احتیاطی تو اس سے کم سا سرزد ہوئی تھی۔

اس عبارت میں آخری دو باتیں یعنی کبھی کبھی ترک نماز اور اکثر نمازوں کے سلسلے میں بے احتیاطی کے سوا اور جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ ہمارے نزدیک بالکل بے بنیاد ہیں۔ مسلمہ تاریخ کے مطابق ان کے دور میں ان کا دور شروع ہو چکا تھا۔ اور ایسی روایتیں بھی پائی جاتی ہیں جو حضرت حسینؓ و شہدا کے قتل سے گزرنے کے بعد اس طرح کی کمزوری کا یزید کے بارے میں گمان قابلِ قبول ہو سکتی ہیں البتہ آخری دو باتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں ثبوت کی ضرورت ہے۔ جو ابن کثیر نے فراہم نہیں کیا۔ علاوہ ازیں یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ذاتی رنجشیں عیب یزید میں پائے جاتے اور اسی کی وجہ سے شدید اختلاف کرنے والے حضرات ان کی طرف اشارہ کرتے بلکہ یہ پیش ہونے والے عیب نہیں تھے۔ اور نہ ہی حقیقت میں یہ ہو سکتا تھا حضرت معاویہ ایسے یزید کو جو کہ نماز اور اقامتِ صلوٰۃ کا عادی ہو اس امت پر خلیفہ بنا کر مسلط کریں جس کی سب سے بڑی پہچان "اقامتِ صلوٰۃ" ہے۔ بہرحال دوسرا اختلاف یہ ہی لیکن ان عیبوں کی نسبت اس کی طرف بعد میں زیادہ کی گئی ہے جو مشہور کر دیئے گئے ہیں اور خاص کر یہ تو بالکل ہی بے بنیاد بات ہے کہ اختلاف کرنے والے حضرت اس کے ان عیبوں کو ہی اختلاف کی وجہ سمجھتے تھے۔

> حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی خدمت میں سوال بھیجا گیا کہ "حضرت معاویہؓ نے اپنے بعد یزید پلید کو ولی عہد کیا ہے یا نہیں؟ ___ آپ نے جواب تحریر فرمایا:
>
> "حضرت معاویہؓ نے یزید کو خلیفہ کیا تھا اس وقت یزید اچھا صالح ہی تھا۔"
>
> (فتاویٰ رشیدیہ ایچ۔ ایم سعید کمپنی کراچی صفحہ)
>
> ایک سوال اسی مضمون کا ہے جس پر جواب تحریر فرمایا گیا
>
> "یزید اول صالح تھا بعد خلافت کے خراب ہوا۔"
>
> (فتاویٰ ص [illegible])

۱؎ البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۲۳۰۔

ضمیمہ

متعلقہ ص ۱۳۵

ایک اہم فائدہ

ہم نے تو یہ روایت صرف یہ دکھانے کے لیے نقل کی ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان کشمکش کی صورت ختم کرنے کے لیے حکمین نے جب یہ طے کیا کہ خلافت کے لیے کسی اور آدمی کا انتخاب کر لیا جائے تو اس کے لیے سب سے پہلا نام حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا لیا گیا۔ لیکن یہ روایت اس لحاظ سے بھی بہت اہم ہے کہ "تحکیم" کے سلسلے میں واقعہ کی شکل اب تک یہ بتائی جاتی رہی ہے کہ حکمین (حضرت ابو موسیٰؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ) کے درمیان یہ بات طے ہوئی تھی کہ نہ علی کی خلافت رہے نہ معاویہ کی۔ بلکہ مسلمان کسی تیسرے آدمی کا انتخاب کر لیں، چنانچہ ان دونوں نے اپنی تجویز کی اس قرارداد کے مطابق یہ طے کیا کہ مجمع کے سامنے علی اور معاویہ کی معزولی کا اعلان کر دیا جائے اور یہ کہ اول پہلے ابو موسیٰؓ نے کہا اس کے بعد حضرت عمرو بن العاصؓ کھڑے ہوئے تو انہوں نے کہا کہ علی کی حد تک میں بھی ابو موسیٰ کے اعلان سے متفق ہوں لیکن معاویہ کو معزول نہیں کرتا ہوں جس پر دونوں میں بڑی تلخ کلامی ہوئی اور جھگڑا بڑھ گیا۔ یہ روایت بھی طبری ہی میں ہے (ج ۶ ص ۳۹-۴۰) لیکن جو روایت اوپر نقل کی گئی اس کی رو سے واقعہ کی شکل بالکل مختلف ہو جاتی ہے اور وہ اس لحاظ سے زیادہ قابل قبول بھی ہے کہ اول تو اس میں حضرت معاویہ کو "معزول کرنے" کی بے تکی بات نہیں پائی جاتی۔ حضرت معاویہؓ تو خلیفہ تھے ہی نہیں کہ ان کو "معزول" کیا جاتا۔ خلافت کا دعویٰ حضرت علیؓ کو تھا، حضرت معاویہؓ کو ان کی خلافت کو اس وقت تک تسلیم کرنے سے انکار تھا جب تک کہ وہ حضرت عثمانؓ کا قصاص نہ دلوا دیں۔ اس لیے معزولی صرف حضرت علیؓ کی

ہو سکتی تھی نہ کہ حضرت معاویہؓ کی۔ دوسرے، واقعہ کی یہ شکل ابن جریر طبری ج ۴ ص ۳۹ والی روایت کی رو سے سامنے آتی ہے۔ اس میں اسلامی تاریخ کے ایک ہیرو اور صحابیٔ رسول ﷺ (حضرت عمرو بن العاصؓ) کے دامن پر دھوکہ دہی کا جو دھبہ بھی نظر آتا ہے نہایت شرمناک اور کسی طرح بھی آسانی سے قابل قبول نہیں کہ ایک بات تنہائی کی مجلس میں طے کی اور مجمع عام میں اس کے خلاف کہا۔

یہاں جو واقعہ کی شکل بیان ہوئی ہے اس کی رو سے حضرت ابو موسیٰؓ نے خلافت کے لیے قابل امام کے طور پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا نام پیش کیا۔ اس کے آگے کا حصہ روایت میں یوں ہے کہ قال عمرو انی اسمی لک معٰویۃ بن ابی سفیان۔ عمرو بن العاصؓ نے (ابو موسیٰ کا پیش کردہ نام نہ قبول کرتے ہوئے) کہا کہ میں معاویہ بن ابی سفیان کا نام تجویز کرتا ہوں۔ اور اس کے بعد جیسا کہ واقعہ کی دوسری روایت میں، جو کہ مشہور ہے، آتا ہے دونوں حضرات میں تلخ کلامی ہوئی اور حضرت ابو موسیٰؓ اپنی مغلوبیت کے احساس سے بوجھل ہو کر بجائے حضرت علیؓ کے پاس جانے کے مکہ چلے گئے۔

اس روایت کی رو سے حضرت عمرو بن العاصؓ نے کوئی ایسی بات نہیں کی جس کی بنا پر انہیں بدعہدی اور دھوکہ بازی کا وہ الزام دیا جا سکے جو مشہور روایت کی بنا پر عائد ہوتا ہے۔ انہوں نے حضرت ابو موسیٰ سے کہا تھا کہ آپ نام پیش کریں اگر میرے لیے قابل قبول ہوا تو فوراً قبول کر لوں گا ورنہ میرا پیش کردہ نام آپ قبول کریں گے۔ اس قرارداد کے بعد حضرت عمرو پر ذمہ داری نہیں آتی تھی کہ وہ حضرت ابو موسیٰؓ کا دیا ہوا نام قبول ہی کریں۔ البتہ حضرت ابو موسیٰؓ کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ روایت کے ظاہری الفاظ کے لحاظ سے ان پر ذمہ داری آتی تھی کہ حضرت عمروؓ کا دیا نام قبول کر لیں گے کیونکہ انہوں نے حضرت عمرو بن العاصؓ سے بات کرتے یہ نہیں کہا کہ میں بھی تمہارے دیئے ہوئے نام کو قبول کرنے کا پابند نہیں بلکہ ان کی یہ بات مان لی کہ "ورنہ پھر میں جو نام دوں گا آپ اسے قبول کریں گے" اور ایک نام پیش کر دیا۔ البتہ الفاظ کے اس ظاہری مطلب کے برخلاف ہم حضرت ابو موسیٰ کی صفائی میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ "تحکیم" کے خاص حالات میں انہیں یہ گمان نہیں تھا کہ عمرو بن العاص "معاویہ بن ابی سفیان" کا نام بھی پیش کر سکتے ہیں۔ ان کے خیال میں شاید یہ مناسب نہیں تھا۔ اس لئے انہوں نے باوجود قول دے چکنے کے، اپنے آپ کو اس نام کے قبول کرنے کا پابند نہیں جانا۔ مگر یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ عبارت کا بالکل حتمی مطلب نہ لیا جائے اور سمجھا جائے کہ حضرت

ابو موسیٰ بھی حضرت عمروؓ کی طرح آزاد تھے کہ حضرت عمروؓ کی تجویز کو نہ مانتے۔ رہا یہ حیثیت جیسا کہ شاید حضرت ابو موسیٰ کا تھا کہ عمرو بن العاص نے ایک ایسی بات کی جس کی قول و قرار کے الفاظ کی رو سے اگرچہ پوری گنجائش تھی مگر معاہدے کے جس عام ماحول میں تحکیم کا فیصلہ صادر کیا گیا تھا اس ماحول کے اعتبار سے یہ بات مناسب نہ تھی تو یہ ایک نقطۂ نظر ہو سکتا ہے، جبکہ دوسرا نقطۂ نظر یہ ہو سکتا ہے اور بظاہر یہی حضرت عمرو بن العاص کا تھا کہ عملی اعتبار سے امت کے مفاد میں اس وقت اس سے بہتر کوئی دوسری شکل دستیاب نہ تھی کہ خلافت ـــــ یا کم از کم اسلامی جماعت کی ذمہ داری ـــــ معاویہ بن ابی سفیان کے ہاتھ میں دے دی جائے۔ ظاہر ہے کہ نظریاتی طور پر یہ بات سخت ناقابل فہم ہے اس لیے کہ حضرت علی مرتضیٰ کی موجودگی میں معاویہ بن ابی سفیان کو امت کی باگ ڈور سونپ دینے میں امت کی بھلائی کیسے ہو جائے، مگر جب ان حقائق پر نظر ڈالی جائے جو حضرت عمرو بن العاص کے سامنے کھلے ہوئے تھے کہ خود علی مرتضیٰ کو اپنی خلافت میں اتنا اقتدار بھی حاصل نہیں تھا کہ وہ اپنی طرف سے حکم بھی اپنی مرضی کے مطابق مقرر کر سکیں۔ ابو موسیٰ اشعری کے تقرر کے حق میں وہ ایک مدت کے لیے نہیں تھے۔ ہر ممکن کوشش کی کہ ابو موسیٰ کے بجائے حضرت عبداللہ بن عباس کو مقرر کیا جائے کیونکہ ابو موسیٰ اس نازک جنگی کام کے لیے اول تو موزوں نہیں تھے، دوسرے حضرت علی کے کیمپ میں ہوتے ہوئے وہ حضرت علی کی جنگ پالیسی کے کھلے مخالف تھے اور لوگوں کو جنگ میں شرکت سے روکتے تھے۔ جس کا ذکر اس مضمون کے شروع میں بھی آ چکا ہے۔ مگر قراء اور ساتھیوں نے انہیں مجبور کیا کہ ابو موسیٰ ہی جائیں گے۔ وہ مجبور ہو گئے۔

حضرت علیؓ کی طرف سے حضرت ابو موسیٰ کے تقرر پر اس سے بہتر تبصرہ نہیں ہو سکتا جو ابن اثیر کے محقق حاشیہ نگار نے کیا ہے کہ "علیؓ گویا اپنی مسند کی زندگی کو معاویہ کے ہاتھ میں دے دیتے (نہیں اتنا نقصان شاید نہ ہوتا جتنا ابو موسیٰ کے، تحکیم میں معاملہ جانے سے ہوا" (ج ۳ ص ۱۶۹) بہر حال حضرت علیؓ ان تمام مشکلوں کے باوجود جن کے آگے سر نیاز جھکے بغیر نہیں رہ سکتے تھے، دائرہ اختیار میں روز بروز بے اختیار اور بے بس ہوتے جا رہے تھے۔ جن کے ساتھی ان کی کوئی بات چلنے نہیں دیتے تھے حتیٰ کہ وہ تحکیم میں اپنی مرضی کا ثالث تک نہیں رکھ سکے تھے۔ اس کے برعکس معاویہ بن ابی سفیان نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ صرف اپنی ذات سے معاملات پر پورا قابو رکھتے ہیں بلکہ انہیں جو قوم اور اعوان و انصار ملے ہیں وہ سب بھی معاملہ میں ان کی دل و جان سے مدد کرتے ہیں۔ لیکن

حالت میں حضرت عمرو بن العاص ؓ کو یہ بات سوچنے کا پورا حق تھا کہ کم از کم امت مسلمہ جو خون میں نہائی ہوئی اور عافیت کے لیے سرگرداں ہے، وہ عافیت کیسے حاصل کی جا سکتی ہے؟ اب صرف اس صورت میں حاصل کی جا سکتی ہے کہ معاملات کی باگ ڈور پوری طرح معاویہ ؓ کے ہاتھ میں دے دی جائے۔ جو واحد آدمی ہے کہ حالات کو قابو میں کر سکے

جیسا کہ باب میں بھی عرض کر چکا ہوں حضرت عبداللہ بن عمر ؓ کا نام سامنے آیا تھا۔ بر ملا کہا جاتا ہے کہ اپنی تمام بزرگی کے باوجود وہ اس میدان کے سرے سے آدمی ہی نہ تھے۔ اس وقت تو تیز و چست، انتظامی اور قائدانہ صلاحیت رکھنے والے آدمی کی ضرورت تھی نہ کہ صرف نیک نفس کی۔ یعنی ٹھیک وہی بات جس کا فیصلہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے آخری دور میں کیا (اور جو باب سوم میں اس کا ذکر آ چکا ہے) کہ سیاسی قیادت اور نظم و نسق کے لیے ایک کم معیاری مگر مضبوط (اور بقول حضرت عمرو بن العاص ؓ زاہد اور دانا) مسلمان کو ترجیح دی جانی چاہیے، اعلیٰ درجے کے مگر کمزور یا کم صلاحیت مسلمان کو نہیں

طبری کی اس روایت میں جو تحکیم کے قصے کی شکل عام طور پر مشہور ہے اور اس روایت میں جو ہم نے اوپر (طبری جلد ۶ ص ۳۹) سے نقل کی ہے، سند کے اعتبار سے بھی بڑا فرق ہے۔ مشہور روایت کی سند ایک منقطع اور نامکمل سند ہے جس کے دو راوی "ابو مخنف" اور ابو جناب کلبی "امام ابن جریر طبری نے اپنے سے اوپر ذکر کیے ہیں۔ ان دونوں میں ناقدین رجال کو کلام ہے (ملاحظہ ہو لسان المیزان ج ۴ ص ۴۹۲ طبع بیروت اور تقریب التہذیب ج ۲ ص ۳۴۶) اس کے برعکس جو روایت ہم نے اوپر طبری ج ۶ ص ۳۹ کے حوالے سے بحوالہ مصنف عبدالرزاق کے واسطے سے درج کی ہے اس کی سند نہایت صاف اور مکمل ہے۔

حدثنی عبد اللہ بن احمد (ابن حنبل) قال حدثنی ابی قال حدثنی سلیمان بن یونس بن یزید عن الزہری

اس روایت کے مقابلے میں ایک مختلف قسم کی روایت مشہور ہو جانے کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ مشہور روایت "انتخاب حکمین" کے عنوان کے ماتحت آتی ہے اور غیر مشہور روایت "رفع مصاحف" کے زیر عنوان درج ہوئی ہے، یہی بے جا ہے۔

واللہ اعلم

☆☆☆

باب ہفتم

حضرت امیر معاویہؓ کی وفات۔ عہد یزید کا آغاز

حضرت حسینؓ کی ہجرت

سنہ ۵۶ھ میں یزید کی ولی عہدی کے مسئلے سے فارغ ہونے کے بعد حضرت معاویہؓ چار سال زندہ رہے۔ رجب ۶۰ھ میں آپ نے اسی سال میں وفات پائی۔ جن حضرات نے ۵۶ھ میں یزید کی ولی عہدی قبول کرنے سے انکار کیا تھا ان میں سے جو زندہ تھے وہ اپنے اسی انکار پر قائم تھے۔

یزید کو معاویہؓ کی وصیت

بیان کیا گیا ہے کہ آپ نے موت کے وقت اس سلسلے میں کچھ وصیت بھی یزید کو کی تھی۔ اس وصیت کی روایتیں مختلف ہیں۔ اس وصیت کے مضامین کے اختلاف سے پہلے اس معاملے میں یہی اختلاف پایا جاتا ہے کہ یہ وصیت بالمشافہ تھی۔ یعنی یزید اس وقت آپ کے پاس موجود تھے یا اس وقت وہ موجود نہ تھے بلکہ وصیت لکھ کر ان کے لیے چھوڑی گئی۔ ابن اثیر نے روایت کے ساتھ [illegible] کو ترجیح دی ہے[1] جو ابن جریر کی بھی [illegible]

---

[1] کامل ج ۳ ص ۲۶۰

ہوتا ہے۔ اگرچہ صحیح الفاظ میں یہ روایت منقول نہیں ہوئی ہے۔ مگر اس کی تفصیلات پر غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہی فیصلہ اور بیان صحیح ہے۔ وصیت کی روایتوں میں جو اختلاف پایا جاتا ہے اس میں کچھ اختلاف ایسا بھی ہے جو صورت اور معنی کی ماہیت کا حامل ہے۔ طبری سے پہلی روایت جو یزید کو موجود اور حاضر ہونے کی بتائی گئی ہے اس کے مطابق حضرت معاویہؓ نے کہا کہ:۔

"بیٹے! میں نے تمہاری طرف سے پوری دوڑ دھوپ کر لی ہے۔ ہر چیز ہموار کر دی ہے۔ دشمنوں کو زیر کر لیا ہے۔ تمام عرب کی گردنیں تیرے لیے جھکا دی ہیں۔ اور اب سوائے قریش کے چار آدمیوں کے مجھے کسی کی طرف سے اندیشہ نہیں ہے کہ امر خلافت میں تجھ سے جھگڑا کرے۔ یہ چار ہیں حسین بن علی، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر، عبدالرحمٰن بن ابی بکر ــــــ لیکن عبداللہ بن عمر کی بابت تو سمجھ لو کہ عبادت نے اب انہیں کسی کام کا نہیں رکھا ہے جب وہ دیکھیں گے کہ اور سب نے بیعت کر لی تو وہ بھی کر لیں گے۔ رہے حسین بن علی تو اہل عراق انہیں تیرے مقابلے پر نکالے بغیر نہیں چھوڑیں گے۔ اگر وہ ایسا کریں اور وہ خروج کریں اور تم ان پر قابو پا لو تو درگزر کرنا۔ اس لیے کہ ان سے قریبی رشتہ ہے اور بڑا حق ہے۔ رہے ابن ابی بکر تو وہ بس اپنے ساتھیوں کے نقش قدم پر چلیں گے۔ ان کی مسند بیویوں کا ہے اور بس عورتیں اور کھیل کود ہی میں مشغول ہیں۔ ہاں وہ شخص جو تجھ پر شیر کی طرح گھات لگائے گا اور لومڑی کی طرح چال چلے گا پھر اگر موقع پائے گا تو تجھ پر جست لگائے گا وہ عبداللہ بن زبیر ہے۔ اگر وہ ایسا کرے اور تجھے اس پر قابو مل جائے تو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالنا۔[1]"

اس وصیت میں جو سب سے اہم امر قابل غور ہے وہ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کا ذکر

---

[1] طبری ج ۵ ص ۱۴۴-۸۲۔

ہے، ان کے بارے میں بہت تفصیل سے بحث گزر چکی ہے جس کی رو سے ان کی زیادہ سے زیادہ زندگی ۵۸ھ تک مانی جا سکتی ہے۔ حضرت معاویہ ۶۰ھ میں ان کی بات کو کوئی حیثیت کریں یہ صرف ایک جھوٹ اور جعل ہو سکتا ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔ اور یہ بھی کہ زمانے کے کسی ایسے راوی کا بیان ہے جو اس تاریخی حقیقت سے بے خبر تھا نیز اس حقیقت سے بھی بے خبر تھا کہ حضرت معاویہ کی وفات کے وقت یزید کی موجودگی ثابت کرنا مشکل ہے اسکے مقابلے میں طبری ہی نے اگلی سطروں میں جو وصیت درج کی ہے وہ یزید کی غیر موجودگی میں دو اہم اشخاص کے سپرد کیا گیا تھا کہ یزید کو دے دیا جائے اور جو عبدالرحمن ابن ابی بکر کے بے محل اور بے حقیقت تذکرے سے بھی پاک ہے۔ اس کا مزاج مذکورہ بالا وصیت سے بہت مختلف اور حضرت معاویہ کے دور اندیشانہ، عاقلانہ، مدبرانہ مزاج سے پوری طرح جوڑ کھاتا ہے اس لیے اس کے بارے میں یقین کیا جا سکتا ہے کہ وہ فی الواقع حضرت معاویہ ہی کا ہوگا۔ اس وصیت نامہ کی روایت کے مطابق

> "جب معاویہ کا وقت ۶۰ھ میں پورا ہوا اور یزید اس وقت موجود نہ تھے تو انہوں نے ضحاک بن قیس فہری کو جو ان کے پولیس افسر تھے، اور مسلم بن عقبہ المری کو بلایا اور ان سے کہا کہ میری وصیت یزید کو پہنچا دینا کہ اہل حجاز کا خیال رکھو وہ تمہاری اصل ہیں۔ ان میں سے جو کوئی تمہارے پاس آئے اس کا اکرام کرو اور جو نہیں آتا ہو اس کی خبر گیری کرو اور عراق والوں کا بھی خیال رہے کہ وہ اگر تم سے ہر روز ایک عامل کو معزول کرنے کا مطالبہ کریں تو ان کا مطالبہ پورا کر دو، اس لیے کہ ایک عامل کی معزولی اس سے کہیں بہتر ہے کہ ایک لاکھ تلواریں تمہارے خلاف حرکت میں آ جائیں۔ اہل شام کا بھی خیال رہے کہ انہیں اپنے معاملات کا رازدار بنانا ہے۔ کبھی دشمن کی طرف سے کوئی خطرہ آئے تو ان کی مدد حاصل کرو اور جب یہ کام ہو جائے تو انہیں ان کے ملک کو واپس کر دو، اگر وہ غیر ملک میں زیادہ ٹھہرے تو وہاں کی

سے تمہیں جدا کر لیں گے اور یہ تو واضح ہے کہ ابھی قریش میں سے تین آدمیوں کی طرف سے تمہاری ریاست کا اندیشہ ہے حسین بن علی، عبد اللہ بن عمر اور عبد اللہ بن زبیر —— جہاں تک ابن عمر کا تعلق ہے سوال ہے تو دین کی خدمت نے انہیں بالکل توڑ ڈالا ہے اور ابن زبیر تمہارے مقابلے میں کسی شی کے اہل دعویدار ہوں گے رہے حسین تو ان کی آرزو [illegible] کوئی [illegible] میرا خیال ہے کہ جن لوگوں نے ان کے باپ کو قتل کیا ان لوگوں کے ساتھ یہ [illegible] چھوڑ دیں گے انہیں کے بعد اللہ تعالیٰ اس طرف سے بھی ان کو کافی ہو جائے گا [illegible] کہ ان کا بہت قریبی رشتہ ہے، بہت شاق ہے اور [illegible] قرابت ہے۔ یہ [illegible] انہیں یہاں [illegible] چھوڑ دیں گے۔ اگر یہ [illegible] ان پر [illegible] آؤ تو درگذر کرنا کیونکہ اگر میرے ساتھ [illegible] کے درمیان [illegible] دست [illegible] تو میں درگزر ہی کرتا اور یہاں وہ جواں مرد [illegible] ہے۔ وہ سامنے آ جائے اگر [illegible] دن [illegible] تو [illegible] لینا اور اپنی قوم (قریش) کا خون جہاں تک تم سے ہو سکے اس کو بہنے سے بچانا۔[1]

بہرحال ان اختلاف کرنے والے تین حضرات کے بارے میں جو حضرت معاویہ کا [illegible] کمزور تھے تاریخی روایات کے مطابق حضرت معاویہ نے یزید کو جو وصیت کی تھی اس میں یہ [illegible] بھی ہے۔[2]

---

[1] طبری ۶ ص ۱۸۵۱ [2] [illegible] صفحہ [illegible] باب [illegible] [illegible]

مخالفین سے بیعت کا مطالبہ

والد کے انتقال کی خبر پاکر یزید کے دمشق پہنچنے کا ذکر گزشتہ باب میں آچکا ہے۔ اس خطبے سے فراغت کے بعد جو بطور امیر المومنین انہوں نے دمشق پہنچ کر دیا[1]، مورخین کے بیان کے مطابق ان کا پہلا اہم اقدام یہ معلوم ہوتا ہے کہ مدینے کے گورنر ولید بن عتبہ بن ابی سفیان (یزید کے چچا زاد بھائی) کو حضرت معاویہؓ کی وفات کی اطلاع بھیجی اور ساتھ ہی یہ حکم بھی کہ عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر اور حسین بن علی سے بیعت لی جائے۔ لیکن مختلف قسم کی داستانیں اس بارے میں ہیں۔ ایک روایت کہتی ہے:

اما بعد فخذ حسینا و عبد الله	کہنا ہے کہ حسین، عبداللہ بن عمر اور
ابن عمر و عبد الله بن الزبیر	عبداللہ بن زبیر کو بیعت کے لیے پکڑو اس
بالبیعة اخذا شدیدا لیست فیه	سختی کے ساتھ کہ اس میں کوئی نرمی
رخصة حتی یبایعوا والسلام[2]	نہ ہو حتی کہ بیعت کریں۔

لیکن اس سخت ہدایت کے برخلاف طبری کی اس روایت میں ایک عجیب نقشہ کھینچا گیا ہے کہ ولید نے پیشتر کے امیر مدینہ مروان بن الحکم کو اس حکم کی تعمیل میں مشورے کے لیے بلایا ہے کیونکہ اس پر اس حکم کی تعمیل بھاری ہو رہی ہے اور یہ مشورہ پایا ہے کہ

[illegible]

[1] خلافت معاویہ و یزید طبع چہارم کراچی جون ۱۹۶۲ء۔

[2] طبری ج ۶/ صفحہ ۱۸۸۔

جب حسینؓ نے مروان کی بات سنی تو کہا یہی نہیں ہے کہ آپ جلد بلائیں۔ اسی وقت بلا لو اور بیعت لو ورنہ گردن اڑا دو
ورنہ جب ایک ایک مخالف ہو کر یہ بات پھیلا دے گا کہ معاویہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ مروان کا یہ مشورہ
بہت بُرا تھا[1]۔ غور طلب ہے کہ مروان کے اس سخت مشورے کے باوجود روایت میں کہیں یہ
ذکر تک نہیں کہ حضرت حسینؓ نے مروان کو کوئی کلمہ بھی کہا ہو البتہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت
حسینؓ کو بلانے کے لیے آدمی بھیجا۔ حضرت ابن زبیرؓ تو اس وقت آئے نہیں مگر حضرت حسینؓ چلے گئے
اور حضرت معاویہ کی وفات پر تعزیتی کلمات کہہ کر ولید سے بیعت کے سلسلے میں یہ عذر پیش کیا کہ

فان مثلی لا یعطی بیعته سرًّا ولا	میرا جیسا آدمی تو چھپ کر بیعت نہیں کیا
اراک تجتزئ بها منی سرًّا	کرتا اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ بھی یہ
دون ان تظهرها علی رؤس	ہرگز پسند نہ کریں گے کہ بیعت ایسی ہو
الناس علانیةً فاذا خرجت	کہ علانیہ سب لوگوں کے سامنے نہ ہو بس
الی الناس فدعوتهم الی	جب آپ سب لوگوں کے واسطے بیعت کو
البیعة دعوتنا مع الناس	باہر نکل کر بیٹھیں گے ہم کو بھی بلا لینا۔ اس طرح
فکان امرًا واحدًا[2]	سب کام ساتھ ہو جائے گا۔

یہ عذر ولید نے بلا تامل ہی قبول کر لیا۔

فقال له الولید وکان یحب	چونکہ ولید عافیت پسند تھا اس نے کہا
العافیة فانصرف علی اسم الله	ٹھیک ہے اللہ کے نام پر آپ جائیے
حتی تاتینا مع جماعة الناس[3]	اور پھر لوگوں کے ساتھ آپ آئیے گا۔

اسی واقعہ کی دوسری روایت

طبری کی اس روایت کے بعد ابو مخنف نے ابو سعید کے حوالے سے یہ روایت دی ہے

---

[1] طبری ج ۴ ص ۲۵۱ [2] ایضاً ص ۲۵۱ [3] ایضاً۔

کی ہے کہ :-

"۱۵ رجب سنہ ۶۰ھ کی شب میں معاویہ کا انتقال ہوا اور لوگوں نے یزید سے بیعت کی اس کے بعد یزید نے عبدالرحمن عامری مولی معاویہ کے ذریعہ ولید بن عتبہ بن ابی سفیان گورنر مدینہ کو پروانہ بھیجا کہ وہاں کے لوگوں سے بیعت لیں اور ان میں عامۃً قریش سے کہ ان دینوں میں بن عمر کو ... کہ مرحوم امیر المومنین نے مجھے ان کے بارے میں خصوصی طور پر تحریری اور صلح ہونے کی وصیت کی ہے۔ ولید نے اسی رات ہی ایک پیغامبر حسین اور عبداللہ بن زبیر کے پاس بھیجا اور دونوں آئے تو کہا کہ معاویہ کی وفات ہو گئی ہے اس لئے کہا کہ امیر المومنین یزید کے ہاتھ پر بیعت کر لیجئے ان حضرات نے کہا کہ اس کو صبح پر رکھئے تاکہ اور تمام اہل مدینہ کا ارادہ بھی سامنے آجائے اس کے بعد حسین ولید کے پاس سے اٹھ کر رہے اور ان کے سامنے تذکرہ کیا۔ "ابن کثیر یوں بیان کرتے ہیں کہ اس موقع پر حضرت"

وقد كان الوليد اغلظ للحسين	بیعت لینے میں ولید نے حسین کے
فشتمه الحسين واخذ بعمامته	ساتھ سخت کلامی کی تو حسین نے بھی اس کو
فنزعها من رأسه فقال الوليد	سخت سست کہا اور اس کے سر سے عمامہ
ان هجنا بابي عبد الله الا اسدًا	کھینچ لیا ...... مروان یا کسی
فقال له مروان او بعض جلسائه	مصاحب بولا کہ گردن مار ہی ڈالیے۔
اقتله فقال ان ذاك لدم	ولید نے کہا کہ یہ بنی عبد مناف کا
مصون في بني	خون بڑا قیمتی اور قطعی محفوظ
عبد مناف۔	ہے۔

ل؎ اس روایت کے مطابق دونوں حضرت ولید کے پاس گئے ہیں مگر طبری کی روایت کے مطابق حضرت حسین آگئے اور عبداللہ بن زبیر نہیں گئے معلوم ہوتا ہے۔ ۲؎ البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۴۷ ۔

اس روایت میں اس کے برعکس نظر آتا ہے کہ یزید کی طرف سے نرمی کی خصوصی ہدایت کی گئی ہے، مگر ولید ترش کلامی سے پیش آتا ہے۔ لیکن آخر میں یہ بھی ہے کہ اس کی پگڑی کھینچ لیے جانے کا واقعہ بھی حضرت حسین کے احتجاج ہی پر بگڑا اور جس پر مروان یا کسی اور شخص نے [illegible] کو کہا بھی تو اس نے بالکل وہ جواب دیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف یزید کی ہدایت کا لحاظ تھا بلکہ وہ خود بھی حضرت حسین کے لیے کافی احترام دل میں رکھتا تھا اور یہی بات بعد کے واقعات بھی اس کے لیے ثابت کرتے ہیں جو آگے آ رہے ہیں۔

لہ طبری کی یہ روایت [illegible] کہ مدینے کا اموی گورنر اور یزید کا عم زاد ولید بن عتبہ بن ابو سفیان حضرت حسین کے لیے بہت بڑا احترام دل میں رکھتے تھے اور یہ رو کھل کر آئی ہے۔ اس میں یہ کہا ہے کہ بعد حضرت حسین کے ضد پر ولید کی دعوت ہے "آپ تشریف لے جائیں کل ہی کو سب لوگوں کے ساتھ دعوت دی جائے گی۔ تب مروان نے فوراً ہی کہا کہ "کیا غضب کرتے ہو، مگر اس وقت نکل گئے تو پھر بہت کشت و خون کے بغیر بیعت کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔" اس کا جواب ولید نے ایسا دیا ہے۔ بھلا حضرت حسین کو مارنے کی بات؟ تب مروان نے پھر ولید سے اپنی بات دہرائی تو [illegible] جو نقل کی ہے اب یہ بات یقین کرنے والی نہیں۔ تب ہی ولید کے الفاظ طبری نے جواب میں یہ نقل کیے ہیں۔

ویح غیرک یا مروان انک	تیرا ستیاناس ہو مروان تو نے میرے لیے وہ تجویز کی
اخترت لی التی فیها هلاک دینی	جس میں میرے دین کی تباہی ہے۔ بخدا مجھ کو
واللّٰه ما احب ان لی ما طلعت علیه	دنیا جس پر سورج طلوع و غروب ہوتا ہے
الشمس وغربت عنه من مال	کا مال اور ملک ملتا ہو تو قتل حسین کا مجھے
الدنیا وملکها وانی قتلت حسیناً	محبوب ہے یا پسند ہوگا۔ سبحان اللہ کیا میں حسین کو
سبحان اللّٰه، اقتل حسیناً ان قال	بس اس بات پر قتل کروں کہ وہ بیعت نہیں
لا ابایع واللّٰه انی لاظن امرأً	کرتے ہیں۔ واللہ میرا خیال ہے کہ جس کو
یحاسب بدم حسین لخفیف المیزان	قتل حسین کا حساب دینا پڑے گا خفیف المیزان ہوگا

عند اللّٰه یوم القیامة ۔ ۱۰ طبری ص [illegible]، [illegible] ثابت ہوگا۔

نتیجۂ بحث

پس حضرت معاویہ کی وصیت کی روشنی میں ، ابن سعد کی روایت کی روشنی میں ــــ جو یزید کی طرف سے نرمی کی ہدایت کا پتہ دیتی ہے ــــ اور ولید کے اس رویہ کی روشنی میں جس کی گواہی طبری کی ایک روایت دیتی ہے اور ابن سعد کی روایت کا آخری حصہ دے رہا ہے ہمارے لیے انصاف پسندی کی رو سے مناسب صورت یہی ہو سکتی ہے کہ طبری کی روایت میں یزید کی طرف سے جو سختی کی ہدایت پائی جاتی ہے اور ابن سعد کی روایت میں ولید کی طرف جو سخت کلامی منسوب کی گئی ہے ، ان دونوں باتوں کو الحاقی کلام سمجھا جائے رجب ۶۰ھ سے لیکر محرم ۶۱ھ تک یعنی حضرت حسینؓ کے سال شہادت تک یا کم از کم طبری کی اس ایک روایت کے سوا کوئی دوسری روایت نہیں ملتی جو حضرت حسینؓ کے بارے میں یزید کے سخت رویہ کی شہادت دیتی ہو ، حالانکہ وہ اس دوران میں یزید کی بیعت سے انکار کرتے ہوئے مکہ چلے گئے ، پھر مکہ سے عراق آپ کے شیعوں کے بلاوے پر کوفہ جانے کی تیاری ہوتی رہی حتیٰ کہ کوفہ کا سفر بھی شروع ہوگیا۔ مگر ہمارے سامنے روکنے کی کوشش کا ذکر آتا ہے نہ یزید اور اس کے حکام کے بارے میں کسی سختی یا داروگیر کا تذکرہ ملتا ہے جبکہ اس کے برعکس حضرت عبداللہ بن زبیر کے ساتھ اگلے دن سے ہی جبکہ وہ حضرت حسینؓ کی طرح مدینے سے مکے کے لیے نکلے پھر سختی کی باتیں یزید کی طرف سے بھی رہیں۔ اور ان کے حکام کی طرف سے داروگیر کی کوششیں مسلسل ہوتی رہیں، جیسا کہ آگے آئیگا۔

امام باقرؒ کی روایت

اور کسی کی نہیں خود حضرت امام باقر کی روایت بھی اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ یزید کی بیعت کے سلسلے میں حضرت حسینؓ پر کوئی سختی روا نہیں رکھی گئی۔ ابن جریر طبری

اپنی سند بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔

قال حدثنا عمار الدهنی قال	ہم سے عمار دہنی نے بیان کیا کہ میں
قلت لابی جعفر حدثنی	نے ابو جعفر (امام باقر) سے عرض کی کہ
بمقتل الحسین کانی حضرتہ	مجھے قتل حسین کا قصہ اس طرح سنائیے
قال مات معاویۃ والولید بن	کہ جیسے میں وہاں موجود تھا انھوں نے
عتبۃ بن ابی سفیان علی المدینۃ	فرمایا معاویہ کا انتقال ہوا اور ولید بن
فارسل الی الحسین بن علی	عتبہ بن ابی سفیان جو اس وقت حاکم مدینہ
لیاخذ بیعتہ فقال لہ اخرنی	تھے پس انھوں نے یزید کی بیعت کے لئے
وارفق فاخرہ فخرج الی	حسین کو بلوا بھیجا۔ آپ نے کہا کہ
مکۃ[1]	مؤخر کر دو اور نرمی برتو! اس نے مؤخر
	کر دیا تب آپ مکے کے لئے نکل گئے

مکہ کو روانگی

بہرحال حضرت حسین کی خواہش پر بیعت کا معاملہ مؤخر کر دیا جاتا ہے کیونکہ ان کا جیسا آدمی تنہائی میں بیعت کرے یہ کوئی مناسب بات نہیں بلکہ جب تمام اہل مدینہ بیعت کے لیے بلائے جائیں اسی وقت وہ بھی آ جائیں گے اور سب کام ساتھ ہی ہو جائیگا ولید نے آپ کو رخصت کی اجازت دیدی اور آپ نے جیسا کہ ابھی حضرت امام باقر کی روایت سے گزرا مکہ کی راہ لی۔ مکہ کو آپ کی یہ روانگی ۲۷ یا ۲۸ رجب سنہ ۶۰ھ یکشنبہ کی رات میں ہوئی۔[2]

اوپر طبری کے حوالے سے گزر چکا ہے کہ ولید نے حضرت عبداللہ بن عمر کو بھیجدیا

---

[1] طبری ج ۶ صفحہ ۱۹۳ [2] ایضاً صفحہ ۱۹۰۔

تھا۔ مگر حضرت حسینؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے پاس بیک وقت آدمی بھیجا تھا جب حضرت حسینؓ نے تو اسی وقت ولید سے ملنے کا وعدہ کر لیا اور تشریف لے گئے مگر ابن زبیر نے اس کو مصلحت نہ جانا اور پھر بار بار تقاضا کو ٹالتے رہے اور رات ہی میں مکہ کے لیے نکل گئے اور پھر اگلی رات میں حضرت حسینؓ نے بھی مکہ کی راہ لی۔[1] طبری میں ہے کہ ابن زبیر کے نکل جانے کی وجہ سے حکومت کی تمام تر توجہ چونکہ ابن زبیر کی تلاش پر مرکوز رہی اس لیے اس صبح کو وہ حضرت حسینؓ کی طرف توجہ ہی نہ کر سکے اور شام کو جب طلبی ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ اب تو رات ہو رہی ہے صبح کو دیکھیں گے اور پھر اسی رات آپ مکہ کے لیے نکل گئے۔

پورے کنبے کے ساتھ

بتایا گیا ہے کہ حضرت حسینؓ نے اپنے پورے گھرانے کو ساتھ لیا۔

خرج ببنیه واخوته وبنی	آپ نکلے اپنے بیٹوں اور بھائیوں اور بھتیجوں
اخیه وجل اهل بیته	کے ساتھ اور گویا تمام گھر ہی ساتھ تھا
الا محمد بن الحنفیة۔[2]	سوائے بھائی محمد بن حنفیہ کے۔

جبکہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے رات اور وقت کی تنگی اور اندیشوں کی زیادتی کی وجہ سے صرف ایک بھائی جعفر بن زبیر کو ساتھ لے کر سفر کیا۔ ان کے بارے میں یہ بھی تصریح کی گئی ہے

---

[1] طبری ج ۶، ص ۱۹۰، البدایہ ج ۸ ص ۱۴۷، ابن اثیر۔ طبری کی مذکورہ روایت کے جن الفاظ میں مذکور ہے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بلانے کے وقت حسینؓ کو بلایا گیا تھا اور پھر اسی رات کے کنارے حضرت حسینؓ مکہ کے لیے نکل گئے۔ ابن کثیر کی روایت سے جو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بلانے پر اگلی رات کو ہوا تھا اور پھر اگلی رات کو ابن زبیر مکہ کے لیے نکلے۔ اور جو ذکر ہمارے سامنے ہے کہ حضرت حسینؓ ان سے ایک رات بعد نکلے یہ اس لیے کہ حضرت ابن زبیر کے بعد دو دن اور ایک رات مدینے میں گزاری۔ طبری کے الفاظ صاف نہیں ہیں اس لیے ہماری نظر میں ترجیح ابن اثیر کے بیان کو ہے۔

[2] ایضاً۔ [3] ایضاً۔

(طریق الاعظم (شاہراہ) سے ہٹ کر ایک ذیلی راستے (طریق الفرع) سے سفر کیا تھا ادھر جیسے ہی پتہ چلا کہ وہ مدینے سے نکل گئے ہیں اور اندازہ کیا گیا کہ سوائے مکے کے اور کہیں نہیں جا سکتے تو تقریباً اسی سواروں کے ایک دستے کے ذریعہ ان کی تلاش اور تعاقب کیا گیا مگر چونکہ وہ عام راستے سے نہیں بلکہ غیر معروف راستے سے گئے تھے اس لیے تعاقب ناکام رہا۔ ۱

شاہراہ سے سفر

حضرت عبداللہ بن زبیر کے بارے میں مستقل الاسناد سے کی گئی اس تصریح سے کہ انہوں نے مکہ اور مدینہ کی شاہراہ (طریق الاعظم) سے ہٹ کر کسی ذیلی اور غیر معروف راہ کو اپنایا خود بخود یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت حسینؓ نے ہٹ کر جانے کے بجائے عام راستے سے سفر کیا۔ مزید برآں ابو مخنف کے علاوہ طبری کی ایک روایت میں اس کی تصریح بھی آئی ہے کہ آپ کے اہل بیت نے مشورہ دیا تھا کہ شاہراہ سے ہٹ کر سفر کیا جائے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن زبیر نے کیا مگر آپ نے یہ عذر فرمایا اور کھلی شاہراہ سے ہی سفر کیا۔ ۲ آپ کے سفر کے سلسلے میں کسی تعاقب کا ذکر نہیں ہے۔ مورخین کا بیان ہے کہ ۳ شعبان شب جمعہ میں آپ بخیر و عافیت پورے قافلے کے ساتھ مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ ۳

خیرخواہوں اور عقیدتمندوں کے مشورے

۱۔ اس پر زور دیا گیا کہ حضرت حسینؓ کے قافلے میں آپ کے بھائی محمد بن حنفیہ ساتھ نہیں ہوئے۔ ۴ اس روایت میں وہیں ان کی زبان سے یہ بھی کہلوایا گیا ہے کہ

---

۱ طبری ج ۵ ص ۱۹۰ ۲ طبری ج ۵ ص ۱۹۲ ۳ البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۵۰ ۴ حضرت حسینؓ کے یہ بھائی حضرت فاطمہؓ سے نہیں بلکہ حضرت علیؓ کی ایک دوسری اہلیہ سے تھے۔

"اے بھائی جان بخدا! آپ مجھے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہیں آپ سے زیادہ اور
کوئی نہیں ہے جس کے لیے خیر خواہی میں کچھ کہوں۔ میری گزارش ہے کہ آپ
جہاں تک ہو سکے یزید سے بچ کر یکسو رہیے کسی شہر کا ارادہ مت کیجئے گا بلکہ شہروں سے
دور رہتے ہوئے اپنے آدمی مختلف علاقوں میں بھیجئے اور اپنی بیعت کی دعوت
دیجئے اگر لوگ قبول کر لیں تو اللہ کا شکر کریں۔ وہ قبول کریں اور آپ کے علاوہ
کسی اور سے پر اتفاق کر لیں تو اس سے نہ آپ کے دین کو کوئی بٹہ لگے گا نہ عقل
کو اور نہ آپ کی جان و عزت میں کوئی فرق آئے گا۔ مجھے ڈر ہے کہ مبادا آپ
ان شہروں میں سے کسی شہر میں چلے جائیں اور پھر وہاں کے لوگوں میں دو گروہ
ہو جائیں اور جنگ برپا ہو جس کا پہلا نشانہ خدانخواستہ آپ ہی بن جائیں ....
کسی شہر میں اگر جانا ہے تو مکہ جا کر قیام کریں۔ وہاں حالات اگر آپ کے لیے
بہتر رہیں تو ٹھیک ورنہ پھر صحرا اور کوہستان کی طرف نکل جائیے۔ شہروں سے
دور رہتے ہوئے علاقہ در علاقہ گھومیے۔ حتیٰ کہ پتہ چلے کہ حالات کیا ہیں لوگ
کیا سوچ رہے ہیں۔ اس کے بعد جو رائے قائم ہو گی وہی صحیح ہو گی۔ صحیح
اور دانشمندانہ رائے وہی ہوتی ہے جو حالات کی چھان بین کے بعد قائم کی
جائے اس کے برعکس جو رائے حالات کی طرف پشت کرتے ہوئے قائم کی
جائے اس سے زیادہ مشکل اور پریشانی کی کوئی دوسری بات نہیں ہو سکتی۔"[1]

اگر یہ روایت صحیح ہے تو ایک طرف بہترین تجربہ کاری اور دانشمندی کا اعلیٰ نمونہ ہے دوسری طرف ایک چھوٹے بھائی کی طرف سے مشفقانہ اظہار رائے میں حسن ادب اور لطافت بیان کا بھی بہترین نمونہ۔ حضرت محمد بن حنفیہ حضرت حسن و حسین کے تیسرے بھائی ہیں تمام تر روحانی طاقت میں اپنے والد ماجد کے خلف تھے۔ حضرت حسینؓ کے لیے

---

[1] طبری ج ۴ صفحہ ۱۹۰-۱۹۱ (قدرے اختصار کے ساتھ)

بے حد محبت اور خلوص رکھتے تھے۔ جنگ جمل اور جنگ صفین میں جہاں تینوں بھائی حضرت علی کے دوش بدوش ہوتے تھے وہاں حضرت علی خود جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں پھولوں ریحانۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت پر نظر رکھتے تھے وہاں محمد بن حنفیہ کو بھی ہدایت ہوتی تھی کہ ان کو اپنے سے جدا اور آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دینا حالانکہ وہ عمر میں چھوٹے تھے مگر جسمانی طاقت اور صفات میں غیر معمولی تھے جس کے بعض [illegible] ہیں۔ مذکورہ بالا عبارت میں حسن ادب اور لطافت بیان کے پردے میں صاف جھلک رہا ہے کہ حضرت حسینؓ کے اندر [illegible] کی کمی ہے اس طرح کے اندر محمد کی بہت [illegible] نظر آرہی ہے بیشک وہ دونوں باتوں کے حق میں [illegible] مگر اس انداز سے حق خلوص اور امانت تو ضرور ادا کرتے ہیں کہ ادب اور لطافت کا نام ہی نہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت محمد بن حنفیہ حضرت حسنؓ کے ہمعصر تھے اور عقل کے ساتھ رائے قائم کر چکے تھے کہ ان کے بھائی کی شہادت حالات کے جس دور میں ہو رہی ہے اسکو سامنے سے روکے اور [illegible] کی کوشش میں نقصانات ہی زیادہ کوئی نہیں ملے گا۔ چنانچہ ایک حقیقت یہ کہ حضرت حسینؓ کے ساتھ نہیں نکلے بلکہ اپنی اولاد میں سے بھی کسی کا نکلنا پسند نہیں کیا۔ اس سے بھی آگے کی بات یہ ہے کہ جب شہادت حسینؓ کے تین سال بعد تقریباً پورا

حضرت عائشہ صدیقہؓ کو محمد بن ابی بکر کے قتل کی خبر پہنچائی گئی [illegible] حضرت معاویہؓ کے جانے والے حضرت [illegible] سے ایک بات [illegible] ہم آپ کو اس خبر سے بہت صدمہ ہوا مگر [illegible] جو کہ [illegible] کی کوشش کی [illegible] میں اس سے بھی [illegible] بھائی [illegible] محمد کے قتل پر بھی [illegible] ہے۔ "الا انا المغيرة شيئا الاحسب [illegible] الامور [illegible] شئ منه لتعيرنا [illegible]" (البدایہ ج ۸ ص ۲۳۲) بظاہر [illegible] حضرت حسینؓ اور حضرت محمد بن حنفیہ کا تھا۔ محمد بن [illegible] کے قتل پر حضرت عائشہؓ [illegible] کے بعد [illegible] کہا جاتا ہے کہ اس قتل کے سلسلے میں [illegible] حضرت معاویہؓ کا عذر قبول کر لیا تھا [illegible] [illegible] ایک بات کے [illegible] (البدایہ والنہایہ [illegible])

مدینہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے ایما پر یزید کے خلاف بغاوت کا علم اٹھا کر کھڑا ہو گیا تب بھی حضرت محمد بن حنفیہ ان اہل مدینہ میں سے وہ دوسرے بزرگ تھے جن کا نام حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ آتا ہے کہ وہ صاف طور پر اس بغاوت کے خلاف رہے۔ تیسرا نام حضرت زین العابدین بن علی بن الحسینؓ کا بھی اسی فہرست میں ہے[۱]

ایک اور روایت

البدایہ والنہایہ میں مدائنی کی ایک روایت ہے کہ مکے پہنچنے کے بعد حضرت حسینؓ نے کسی کو مدینے بھیجا کہ بنی عبدالمطلب میں سے جو افراد ان کے ساتھ آنے سے رہ گئے ہیں وہ بھی آ جائیں۔ چنانچہ جن کو آنا تھا وہ آ گئے بعد ازاں حضرت محمد بن حنفیہ بھی ادائے حج کے موقع پر مکہ تشریف لے گئے۔

نادى حسيناً بمكة ذا علم ان	محمد نے الحسینؓ کو مکہ میں بااصرار کہا
الخروج ليس له برأي يومه	کہ ان کی رائے میں اس وقت خروج بے محل
فأبى الحسين أن يقبل	بالکل نامناسب تھی حج کر کے یزید کے خلاف
فحبس محمد بن حنفية ولده	اقدام کے خیال سے مکے کا ارادہ مت کیجیے
فلم يبعث أحداً منهم حتى	نصیحت قبول نہیں کی۔ البتہ محمد بن حنفیہ نے
وجد حسين في نفسه على محمد	اپنی اولاد میں سے کسی کو ان کے ساتھ
وقال ترغب بولدك عن	نہیں بھیجا جس پر حسینؓ کو ان سے رنج
موضع أصاب فيه فقال وما	ہوا۔ محمد سے کہا کہ تم اپنی اولاد کو میری جان سے
حاجتي أن تصاب ويصابون	زیادہ عزیز رکھتے ہو؟ آپ نے جواب
معك وإن كانت مصيبتك	دیا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کیوں آپ

---

[۱] دیکھئے ۶۳ھ کے واقعات کا بیان البدایہ والنہایہ ج ۸ صفحہ ۲۱۸ .

اعظم عندنا مصیبۃ

اور کیوں وہ آپ کے ساتھ مصیبت
میں پڑے ہیں۔ اگرچہ یہ بڑی مگر واقعہ ہے
کہ آپ کی مصیبت میرے لیے اپنی
مصیبت سے بڑھ کر ہے۔

دونوں روایتوں کے لہجے کا فرق

طبری کی روایت میں جو لطافت اظہار اور حسن ادب ہم نے محسوس کیا تھا البدایہ والنہایہ[1] کی اس روایت کا لہجہ اس سے بالکل مختلف ہے، ہو سکتا ہے اس میں کچھ دخل کسی راوی کی بے احتیاطی کا ہو لیکن فی نفسہ لہجے کے فرق کی وجہ سمجھنا کچھ ایسا مشکل بھی نہیں ہے۔ پہلی روایت کا لہجہ اس وقت کا ہے جب حضرت حسینؓ کا مدینہ چھوڑنا ان کی سلامتی کے لیے ضروری یا کم از کم مناسب سمجھا جا سکتا تھا اور مکہ سے بہتر کوئی جگہ اس کے لیے نہیں ہو سکتی تھی چنانچہ حضرت محمد بن حنفیہ نے مکے ہی کا مشورہ دیا تھا۔ کوفہ کے ارادے کی بات حضرت محمد بن حنفیہ کے لیے اس وقت بس ایک اندیشے اور امکان کے درجہ کی تھی چنانچہ آپ نے محض اشاروں کنایوں کے لطیف انداز میں اس کے متعلق رائے دی ہے۔ مگر اس دوسری روایت والی گفتگو کا وقت وہ ہے جب حضرت محمد بن حنفیہ دیکھتے ہیں کہ حضرت حسینؓ ان کے پیہم مخلصانہ، محبانہ اور مدبرانہ مشورے کو نظر انداز کر کے نہ صرف خود کوفے کا عزم کر چکے ہیں بلکہ خاندان کے چھوٹے بڑے اور عورت مرد ہر فرد کو ساتھ لیے جا رہے ہیں — جو ان کے نزدیک موت کے منہ میں جانے والی بات تھی — تو ان کی شدت خلوص کا تقاضا اب یہ ہوا کہ لہجے کی ادبی لطافتیں ہٹا کر بے لاگ صراحت سے کام لیا جائے جو شاید کارگر ہو۔ محبت کرنے والا چھوٹا اگر بڑے کو موت کے منہ میں جاتا ہوا دیکھے گا تو وہ لہجہ نہیں رکھ

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۶۵

اس اجمال کو ادا کرنے کے لیے بے ادب صاف گوئی کی جرأت بھی کی جائے۔ بعض مورخین بتاتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ بڑے ہونے کے باوجود حضرت حسینؓ کے نفسی احترام میں چھوٹے بن جایا کرتے تھے مگر سنتے آئے کہ جب دیکھا کہ حضرت حسینؓ اتنے سخت ہو گئے ہیں خاص کر بیوی، عورتوں، بچوں کو چھوڑنے کے مشورہ پر بھی توجہ نہیں کرتے تو حضرت ابن عباسؓ کے خلوص اور خیرخواہی کا لہجہ بھی ایسا ہی تیز اور تیکھا ہو گیا تھا —— بہرحال یہ قطعی واقعہ ہے کہ حضرت ابن حنفیہ کی اولاد میں سے کوئی فرد حضرت حسینؓ کے قافلے میں شامل نہیں تھا۔ اور یہ خود ایک سخت مخالفت کی دلیل ہے۔

۲ — طبری کے سلسلۂ روایات میں دوسرا نام حضرت عبداللہ بن مطیع کا آتا ہے۔ یہ ان کم عمر صحابہؓ میں ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں سن تمیز کو نہیں پہنچ پائے تھے۔ یہ حضرت حسینؓ سے کچھ چھوٹے تھے۔ واقعۂ کربلا (۶۱ھ) کے بعد ۶۳ھ میں جو واقعۂ حرہ پیش آیا ہے۔ جو یزید کے خلاف اہل مدینہ کی بغاوت اور معرکہ آرائی کا نام ہے اس کے دو شعلہ نوا مدعیوں میں سے ایک یہی عبداللہ بن مطیع تھے اس معرکہ کی ناکامی کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے پاس مکے چلے گئے اور وہاں آخر تک ان کے ساتھ حجاج سے مقابلہ میں شہید ہوئے[1]۔ ان عبداللہ بن مطیع کے بارے میں بتایا ہے کہ جب یہ قافلہ مدینہ سے مکے جا رہا تھا تو یہ بھی کہیں سے راستہ میں مل گئے تھے۔ آگے ہو کے ملے اور عراق کا قصد جاننے کے بعد بصد ادب والحاح گزارش کی کہ اس کا قصد ہرگز نہ فرمائیے گا۔ ان لوگوں کے کردار کو بھول جائیے گا[2]۔

۳ — ابن سعد کی روایت ہے کہ حضرت حسینؓ اور حضرت ابن زبیرؓ ایک ہی رات میں مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ کیلئے نکلے تھے۔ اس روایت کے حوالے سے ابن کثیر نقل کرتے ہیں کہ راستے میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی عمرہ سے واپس آتے ہوئے ملے اور ان دونوں صاحبان سے کہا کہ:

---

[1] الاصابہ فی تمییز الصحابہ ج ۵ ص ۳۶ – ۳۵ [2] طبری ج ۶ ص ۱۹۶

اذکرکما اللہ لما جمعتما ولا فرقتما — میں اللہ کا واسطہ دیکر تم دونوں سے
فی ما لا یعد حل فیہ — کہتا ہوں کہ سر کٹ جائے مگر جو مناسب ہے
الناس واذ تعطی فرقۃ اجتمع — اور لوگ اختیار کریں تم بھی اس کو اختیار
ان مرعیۃ نظر لشئ ادان — کر لو اور دیکھو پھر اگر لوگ ایک طرح
فعرفوا فیہ کان السلامۃ — ایک بات پر متفق ہو گئے تو میں اطاعت
تریب — کرونگا، ہاں جو نہیں ہو گئے اور اگر اختلاف
ہوا تو تمہاری مرضی پوری ہو جائیگی۔

نیز خاص طور سے حضرت حسینؓ سے کہا کہ:۔

"اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو اختیار دیا تھا کہ دنیا اور آخرت میں سے جس ایک کو چاہیں پسند کریں، انہوں نے آخرت پسند فرمائی اور تم آپ ہی کا ٹکڑا اور آپ کی ذات کا حصہ ہو، اسلئے تمہیں یہ نہ مل سکے گی، پس یہ ارادہ ختم چھوڑ دو" یہ کہکر آپ نے حضرت حسین کو گلے سے لگایا اور رو پڑے[1]

اس سلسلۂ بیان میں آگے بتایا گیا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ [illegible] فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"حسین بن علیؓ [illegible] کے قصد سے [illegible] ان کو [illegible] ان کا [illegible] باپ امیر المومنین [illegible] اٹھائے گئے تھے [illegible] ساتھ دینے سے انکار کر دیا گیا [illegible] کا [illegible] تھا اور لوگوں نے کوئی فیصلہ [illegible] جماعت [illegible]"

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص [illegible] [2] [illegible] طبری [illegible] حضرت حسینؓ [illegible] حضرت ابن عمرؓ [illegible] [3] حضرت حسینؓ [illegible] [4] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۶۲

باب ہشتم

مکے میں ورود — اہل کوفہ کے خطوط — اور وفود

مسلم بن عقیل کا مشن

بہرحال حضرت حسینؓ شعبان سنہ ۶۰ھ کی ۳ تاریخ کو مکے پہنچ گئے اور دارِ عباسؓ میں قیام کیا[1]۔ جیسا کہ ہونا ہی چاہیے تھا آپ کے پاس لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی۔ ان میں اہل مکہ بھی تھے اور عمرہ کے لیے آنے والے بیرونی لوگ بھی۔ خبر کوفے بھی پہنچ گئی۔ اور رمضان ہی میں وہاں سے شیعانِ علیؓ کے خطوط لے کر ان کے قاصد پہنچنا شروع ہو گئے۔ ایک کے بعد ایک چار پانچ ٹولیاں آئیں۔ کم سے کم کوئی ڈیڑھ سو خطوط پہنچے جو نمایاں لوگوں کے تھے۔ یہ خطوط دعوت تھے کہ آپ یہاں تشریف لے آئیے جاں نثاری کو ہم تیار ہیں۔ پہلے خط کا مضمون جو طبری نے دیا ہے اس طرح ہے:

> "سلیمان بن صرد، مسیب بن نجبہ، رفاعہ بن شداد، حبیب بن مظاہر اور دوسرے شیعانِ کوفہ کی طرف سے حسین بن علیؓ کے نام۔ بعد از سلام! خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے آپ کے دشمن جابر کا خاتمہ کیا جس نے ناحق حکومت پر قبضہ کر لیا تھا[2]۔ اب اس وقت ہمارا کوئی امام نہیں ہے۔ آپ تشریف لے آئیے کہ شاید اللہ

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۵۲۔ [2] یہاں حضرت معاویہؓ کے انتقال کی طرف اشارہ ہے۔

نبی کے وسیلہ ہم لوگوں کو حق پر جمع کر دے۔ یہ ہمارا جو گورنر نعمان بن بشیر ہیں
ہم ان کے پیچھے جمعہ اور عید تک نہیں پڑھتے اور اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ آپ
ادھر کے لیے روانہ ہو گئے ہیں تو ہم انشاء اللہ ان کا بستر تہ کر کے انہیں شام بھیج
دیں گے۔[1]

اس طرح کے خطوط کی بارش ہوئی اور طبری کے بیان کے مطابق سینکڑوں کے خطوط سے ایک کھیپ روانہ ہوئی۔ تو حضرت محمد بن حنفیہ کا ڈر لگا ہوا اور عبداللہ بن مطیع کا کہا ہوا نہایت اخلاص اور احتیاط کے ساتھ مشورہ دور کرنے کا ذکر ہو گیا۔ یہ کچھ گویا بے اثر ہو گیا اور ان حضرات نے جس قدر نصیحت کی بات کہی تھی اس سے لگتا ہے کہ ان کو خطرہ بہت تھا کہ کوفے والے بلائیں گے اور حسینؓ اپنے آپ کو دھوکہ میں دیں گے۔ بہرحال ان بلاووں کا اثر ہوا اور تاریخ کے بیان کے مطابق آپ نے طے کیا کہ اپنا ایک آدمی کوفہ بھیج کر اطمینان کریں کہ کیا واقعی یہ لوگ جو کچھ لکھ رہے ہیں وہ قابل اعتماد ہے؟

مسلم بن عقیلؓ کوفے کو

اس مقصد کے لیے آپ نے اپنے چچیرے بھائی مسلم بن عقیلؓ کا نام لے لیا اور کوفے کے جو لوگ خطوط لیکر آئے ہوئے تھے انکو اس مضمون کا جواب لکھ کر روانہ کر دیا کہ: میں اپنے چچیرے بھائی مسلم بن عقیل کو آپ لوگوں کے پاس بھیج رہا ہوں کہ یہ میرے معتمد ہیں کہ حالات کو دیکھیں اور مجھے اطلاع دیں۔ پس اگر انہوں نے اطمینان ظاہر کیا اور لکھا کہ آپ لوگ جو کچھ مجھے لکھتے ہیں وہی رائے آپ کے تمام معززین اور اہل رسوخ و اہل رائے کا اتفاق ہے تو میں بلا تاخیر چلا آؤں گا۔ اس لیے کہ قسم میری جان کی امام تو وہی ہے جو کتاب خدا پر عامل، انصاف کا خوگر، حق کا تابع اور اپنے آپ کو ذات حق سے وابستہ رکھنے والا ہو۔

---

[1] طبری ج ۶، صفحہ ۱۹

والسلام[1]۔" اور فوراً ہی امیر مسلم بن عقیل کو مع کرخول کے ساتھ اس کے مشن پر روانہ کر دیا۔

والی کوفہ حضرت نعمان بن بشیرؓ کا انتباہ

مسلم بن عقیل کوفہ پہنچے تو ان کی آمد زیادہ دن مخفی نہیں رہ سکی۔ ان کی سرگرمیاں مخفی رہیں جو وہ حضرت حسینؓ کے واسطے لوگوں سے بیعت امامت لینے کے سلسلے میں کر رہے تھے۔ حضرت نعمان بن بشیرؓ جو انصار مدینہ میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی تھے۔ حضرت معاویہؓ کے وقت سے کوفے کے گورنر چلے آرہے تھے۔ ان کو اطلاع ملی تو مسجد میں لوگوں کو جمع کر لیا اور تقریر کی کہ۔

- اے لوگو فتنہ اور فساد تفرقہ انگیزی میں جلدی مت کرو اس میں آدمی ہلاک ہو جاتے ہیں خون بہتا ہے اور مال چھنتے ہیں۔ میری پالیسی اس معاملہ میں یہ ہے کہ جب تک مجھ پر حملہ نہیں ہوگا میں کسی پر حملہ نہیں کروں گا۔ نہ تمہیں برا بھلا کہوں گا، نہ تمہیں چھیڑوں گا اور تہمت میں پکڑوں گا۔ لیکن تم نے اگر اپنا ارادہ کھول کر ظاہر کیا، بیعت توڑی اور امام (یزید) کے خلاف نکل کھڑے ہوئے تو قسم ہے خدائے پاک کی میں تم پر تلوار چلاؤں گا جب تک میرا ہاتھ اس کے قبضہ پر رہے گا چاہے تم میں سے کوئی بھی میرا ساتھ دینے والا نہ ہو۔ ویسے مجھے امید ہے کہ تم میں وہ لوگ زیادہ ہوں گے جو حق کو پہچانتے ہیں بہ نسبت ان لوگوں کے جو باطل کیلئے حق کا نام لیتے ہیں[2]۔

امیر یزید کو شکایت

عبداللہ بن مسلم حضرمی نامی ایک صاحب جو بنی امیہ کے حلیفوں میں سے تھے انہوں نے گورنر کی یہ تقریر سن کر کہا۔ یہ تو مناسب پالیسی نہیں جو بات کرو۔ پالیسی یہ ہے جو کمزوروں کو

---

[1] طبری ج ۷ ص ۱۱

[2] طبری ج ۷ ص ۹۹

شیر کر دے گی۔ حضرت نعمان بن بشیرؓ اس کے باوجود بھی اپنی پالیسی میں تبدیلی کرنے کو تیار نہ ہوئے۔ بنی امیہ کے بعض خیر خواہوں نے یہ صورت حال امیر یزید کو لکھ بھیجی اور لکھا کہ اگر تمہیں کوفہ پر حکومت رکھنے کی ضرورت ہے تو وہاں کسی مضبوط آدمی کو بھیجو۔ نعمان کمزور آدمی ہیں یا دانستہ کمزور بنے ہوئے ہیں۔ اور بھی چند لوگوں نے اسی مضمون کے خطوط یزید کو لکھے۔[۱]

عبید اللہ بن زیاد کا تقرر

یزید نے ان اطلاعات کے بعد اپنے آزاد سرجون کی رائے کے مطابق حضرت نعمان بن بشیرؓ کی جگہ عبید اللہ بن زیاد کا تقرر کیا۔ اس سے پہلے وہ بصرہ کا حاکم تھا۔ اب بصرے کے ساتھ کوفے کی حکومت بھی اس کے سپرد کی گئی اور ہدایت دی گئی کہ فوراً پہنچ کر مسلم بن عقیلؓ کی گرفتاری کا بندوبست کرے۔ وہ ایک جوان اور اپنے باپ کی طرح سخت گیر منتظم تھا۔ بصرے والوں کو دھمکا کر کہ کوئی شخص کسی مخالفانہ حرکت کا مرتکب نہ ہو، وہ عبید اللہ کوفے پہنچا اور وہاں کے لوگوں کو جمع کر کے تقریر کی کہ:

کوفے میں تقریر

> "امیر المومنین نے تمہارے شہر اور اس کے متعلقات کا انتظام میرے سپرد کیا ہے۔ مجھے حکم دیا ہے کہ مظلوم کے ساتھ انصاف کروں، محروم کو اس کا حق دوں، اطاعت گزاروں کے ساتھ بھلائی کروں اور نافرمانوں کے ساتھ سختی۔ اور میں ان امور میں ٹھیک ٹھیک ان کے حکم کے مطابق کروں گا۔ نیکو کاروں کیلئے میں مہربان باپ کی طرح رہوں گا اور فرمانبرداروں کیلئے بمنزلہ بھائی۔ میری تلوار اور میرا کوڑا صرف ان کے لیے ہے جو میرے حکم کی خلاف ورزی کرے گا۔ ہر آدمی اپنا برا بھلا دیکھ لے۔[۲]

---

[۱] طبری سابق۔ [۲] الکامل ابن الاثیر ج ۳ ص ۲۶۸ مطبوعہ دار صادر بیروت ۱۹۶۵ء۔

عملی کاروائی

اس تقریر کے بعد اس نے تمام لوگوں اور بالخصوص قبائل کے ذمہ دار افراد (چودھریوں) کو حکم دیا کہ کسی کے یہاں کوئی پردیسی ٹھہرا ہوا ہو، امیر المومنین کا اشتہاری مجرم ہو یا کوئی خارجی اور جماعت حکومت سے مخالفت پھیلانے والا ہو تو لازم ہے کہ ایسے لوگوں کے ناموں سے تحریری طور پر مطلع کیا جائے۔ جو کوئی ایسا کرے گا وہ ان لوگوں کے معاملہ کی ذمہ داری سے بری ہوگا۔ جو ایسا نہ کرے وہ اس بات کی تحریری ذمہ داری لے کہ اس کے حلقے اور اس کی جماعت سے حکومت کے خلاف کسی طرح کی کوئی شورش نہیں ہوگی جو کوئی ایسا نہیں کرے گا اس سے ہم بری الذمہ ہوں گے اس کا مال اور اس کی جان حلال ہوگی۔ جس عریف (چودھری) کے حلقے میں امیر المومنین کی حکومت کا کوئی بھاگا ہوا مجرم پایا گیا جس کی رپورٹ نہیں کی تھی تو اس عریف کے دروازے پر ہی اسے پھانسی دیدی جائے گی اس کے حلقے کا وظیفہ بند کر دیا جائے گا۔ اور عریف کو شہر بدری کی سزا دی جائے گی۔ ۱؎

مسلم کی تبدیلی مکان

مسلم کوفہ پہنچے تھے تو مختار بن ابی عبید کے گھر رہا کرتے تھے ۲؎ جب ابن زیاد کوفہ پہنچا اور اس کی یہ سخت آگاہی حضرت مسلم کے کان تک پہنچی تو آپ نے جائے قیام تبدیل کر دی اور ہانی بن عروہ نامی شخص کے مکان میں آگئے ۳؎

ایک معمہ

ہماری جو تاریخ کی کتابیں ہیں وہ صرف روایت اور بیانات کا مجموعہ ہیں۔ ان

۱؎ تاریخ طبری ج ۶ صفحہ ۲۰۱ ۲؎ ایضاً صفحہ ۱۹۹ ۳؎ ایضاً صفحہ ۲۰۲

روایات میں بہت سے پہلو ایسے آجاتے ہیں جن پر کچھ گفتگو یا توضیح یا تنقید کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ چیز ان کتابوں میں کہیں مشکل ہی سے اور وہ بھی بس نام کو ملتی ہے۔ مختار بن ابی عبید ہماری تاریخ کے اس دور کا جس میں یہ واقعہ کربلا پیش آیا بڑا معروف نام اور ایک بڑا مشہور کردار ہے۔ یہ شخص واقعہ کربلا کے پانچ سال بعد ایک ہنگامی گروہ کے سرغنہ کی طرح مسلم خانہ جنگی کے میدان میں آیا اور بس سال بھر میں ایک قیامت بپا کر کے گزر گیا۔ یہ حضرت حسینؓ کے انتقام کے نام پر اٹھا تھا اور واقعی کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔ ابن زیاد اور عمر بن سعد وغیرہ تمام قاتلان حسین اسی کے ہتھے چڑھ گئے۔ اور اس کا تعلق بھی کوفے ہی سے تھا۔ اس لیے قدرتی طور پر خیال ہوتا ہے کہ یہ مختار بن ابی عبید جن کے گھر پر مسلم بن عقیل ٹھہرے تھے یہ وہی مختار تو نہیں ہے؟ -

لیکن پھر خیال ہوتا ہے کہ یہ وہی مختار کیسے ہو سکتا ہے؟ اس نے تو حضرت حسینؓ کے ساتھ پہلے ہی خراب کردار کا ثبوت دیا تھا جبکہ حضرت علیؓ کے بعد حضرت حسنؓ جانشین ہوئے تھے حضرت علیؓ کی شہادت اس وقت پیش آئی جبکہ آپ نے حضرت امیر معاویہ سے ایک فیصلہ کن جنگ کی تیاری کی ہوئی تھی۔ آپ چالیس ہزار کی فوج لے کر جو حضرت علیؓ نے تیار کی تھی حضرت حسنؓ روانہ ہوئے تو مدائن کے قریب پڑاؤ میں لشکر کے کچھ مفسدوں نے ہنگامہ بپا کر حضرت حسنؓ کے خیمہ ہی کو لوٹ پٹ ڈالا اور آپ کو بھی زخمی کر دیا۔ مدائن میں حضرت علیؓ کی طرف سے حاکم اس مختار کے چچا سعد بن مسعود ثقفی تھے۔ یہ واقعہ پیش آنے کے بعد حضرت حسنؓ مدائن میں ان کی قیامگاہ پر گئے تو جیسا کہ تاریخ کا بیان ہے مختار نے بعض کی روایت کے مطابق چچا سے کہا کہ "چچا اگر دولت اور عزت کی ضرورت ہو تو انہیں باندھ کر معاویہ کے پاس بھیج دو" چچا شریف تھے۔ انہوں نے کہا کہ تجھ پر خدا کی لعنت۔ البتہ ابن سعد کے ساتھ میں یہ حرکت کر رہا تھا۔[1]

---

[1] طبری ج ۴ ص ۱۲۲ اس شخص کو [illegible] قتل و غارت ہوا ہے سب کا ذمہ دار ہے۔ چنانچہ [illegible] یہ حضرت حسنؓ کے ساتھ [illegible] بنانے کی کوشش کی جبکہ وہ [illegible]

ایک اور معمہ

اس قصے کے علاوہ، یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ جن لوگوں نے حضرت حسینؓ کو خطوط بھیجے تھے جن کے نتیجے میں مسلم بن عقیلؓ کو کوفہ بھیجا گیا تھا، ان کے سربراہوں میں کوئی نام مختار بن ابی عبید نہیں ہے۔ قاعدے سے آ کر مسلم کا قیام انہی لوگوں میں سے کسی کے گھر ہونا چاہیے تھا[1]، اور پھر اسی طرح ہانی بن عروہ کا نام بھی ان ناموں میں نہیں ہے۔ تو مختار کے گھر سے منتقل ہوئے تب بھی انہی میں سے ایک کے گھر جاتے! یہ عجیب قصہ کیا ہے؟ ان آٹھ دس آدمیوں میں سے کسی کے گھر میں کیوں جگہ نہیں تھی جنہوں نے عراقی خطوط لکھے تھے!

مزید برآں

اور پھر رات ہی رات یہ ہانی بن عروہ کے گھر بالکل تن تنہا اور ایک قطعی نامعلوم مہمان کی طرح پہنچتے ہیں۔ ابن جریر طبری ہوں یا ابن اثیر یا ابن خلدون سبھی لکھتے ہیں کہ:

> "مسلم کے کان تک جب ابن زیاد کی تقریر پہنچی تو وہ مختار کے مکان سے نکل کر ہانی ابن عروہ کے مکان تک پہنچے۔ ہانی نکل کر آئے اور مسلم کو دیکھا تو ان کا آنا بہت ناگوار جانا۔ مسلم نے کہا بھائی میں تمہارے پاس پناہ کے لیے آیا ہوں، مہمان رہنا چاہتا ہوں۔ ہانی نے جواب دیا تم نے تو مجھے بڑی مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ اگر میرے مکان کے اندر نہ آ گئے ہوتے تو میں کہتا کہ مجھے معاف کرو۔ لیکن اب تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ آ جائیے[2]"

(بقیہ صفحہ گذشتہ) وہاں داخل ہوئی تو حضرت حسینؓ کے نام پر وہ ایک محاذ کھولا یا ... سے الگ ہو رہے تو ہم بعد مشاہدہ کے اللہ کی پناہ۔ تفصیل کے لیے تاریخ دیکھیے۔

[1] ایک دوسری روایت یہ بھی نقل ہے کہ مسلم کا قیام مسلم بن عوسجہ کے ہاں ہوا تھا۔ طبری ج ۶ ص ۱۹۹ مگر روایت قرار پاچکی ہے کہ قیام مختار کے یہاں رہا۔ شیعہ اثنا عشریہ کے مصنف جناب علی نقی صاحب بھی اسی کو اختیار فرما رہے ہیں۔

[2] طبری ج ۶ ص ۲۰۵ ابن اثیر ج ۴ ص ۱۵ ابن خلدون ج ۳

کیا ہونا چاہیے تھا؟

مسلم بن عقیلؑ جیسا سرفروش پہلوان جو حضرت حسینؑ کا قاصد ہی نہیں ان کا بھائی بھی ہے شہر کے آتے ہی شیعان علی کی جنبش کی سرگرم آمد و رفت اس کے پاس شروع ہو گئی تھی اٹھارہ ہزار آدمی اس کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے وہ ابن زیاد کی دھمکی سن کر جب تنہا اپنی جائے قیام بدلنے کا فیصلہ کرتا ہے تو اس فیصلے میں کوئی مقامی آدمی شریک تک نظر نہیں آتا۔ ایک غریب الغربا بے یار و مددگار کی طرح خود ہی اٹھ کر کہیں کو چل دیتا ہے، اور بے ناروا سلوک سے دوچار ہوتا ہے۔

یہ چند وہ چند سوالات ہیں جن کا کوئی جواب ہمیں تاریخی کتابوں میں نہیں ملا۔ لیکن ان روایتوں کا تعلق کسی ایسی بات سے نہیں ہے جس کی وجہ سے کسی راوی کے متعلق جھوٹ کا گمان کیا جائے۔ البتہ یہ خیال ہوتا ہے کہ مختار کے گھر سے ان کا بے یار و مددگار حال میں ہانی کے گھر پہنچنا اسدی کے یہاں ایک آفت و مصیبت سمجھ کر ان کا استقبال کیا جانا۔ ان میں سے کوئی ایک بات بھی اس کے لیے کافی تھی کہ کوفیوں کے بارے میں یہ فیصلہ کیا جاتا کہ یہ ہرگز ہرگز قابل اعتبار نہیں ہیں۔ اور اسی وقت کوفے سے نکل جانے کی کوئی تدبیر سوچی جاتی۔ یا کم از کم حضرت حسینؑ کو یہ صورت حال بتا دینے کی کوشش کی جاتی جن کو اس سے پہلے بالکل اطمینان بخش صورت حال کی اطلاع کی جا چکی تھی۔

لیکن تقدیر کے فیصلے کون بدل سکتا ہے۔ جناب مسلم نے ان حالات میں بھی ہانی بن عروہ کے گھر میں پناہ گیری ہی قبول نہیں کر لی بلکہ برابر اپنے مشن کے بارے میں پرامید رہے ان کی رائے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ وہ حضرت حسینؑ کو خط بھیج چکے تھے کہ فوراً آجائیے۔ یہاں حالات بالکل سازگار ہیں۔ بس آپ کے آنے کی دیر ہے، اگر اس رائے میں تبدیلی ہوئی تو اس وقت کی جب کہ وہ دشمن کے پنجے میں گرفتار ہو گئے۔؎ اور یہ ٹھیک وہ وقت تھا جس دن حضرت

؎ طبری ج ۶ ص ۲۱۲

حسینؓ ان کے خون بہنے سے سوا ہو رہے تھے۔ محمد رضا مرزا ابجر سنہ ۶۰ھ جو تاریخی روایتوں میں سکہ ہے حضرت حسینؓ کی کوفہ کو روانگی کا دن بتایا گیا ہے[1]

جناب مسلم کا انجام

کوفے کے بے تاج بادشاہ کا خاتمہ ہوا تو عبید اللہ بن زیاد نے اپنی فراست سے ایک غلام معقل کو مسلم تک پہنچا دیا۔ معقل نے مسلم بن عقیل سے ایک سازش کر کے شیعہ ہمدردی بتا کر ان کا پتہ نکال لیا کہ ہانی بن عروہ کے گھر پر مقیم ہیں۔ ہانی کے والد عروہ پر عبید اللہ کے والد زیاد کا احسان تھا۔ زیاد نے ۵۱ھ میں حضرت معاویہؓ کے عہد کو کوفہ کی گورنری سنبھالی تھی تو حضرت علیؓ کے حامی سرداروں کو سختی سے دبایا تھا لیکن عروہ کو عوض کیوں اس نے اپنے احسان کا ممنون بنایا۔ عروہ کے بیٹے ہانی کے ساتھ بھی اس نے یہی سلوک رکھا اور اسی کے مطابق ہانی باپ کے بعد ابن زیاد سے ملاقات رکھے۔ اس لیے ہانی کو اس انکشاف سے بڑی چوٹ لگی کہ مسلم جو اس کے آقا یزید بن معاویہ کا تختہ الٹنے کی مہم پر آئے ہیں، ہانی کے گھر میں مقیم ہیں اور وہیں سے ان کی خفیہ سرگرمیاں جاری ہیں۔ اس نے ہانی کو بلوایا جو بڑی مشکل سے آنے کو تیار ہوئے۔ ان کو اصل میں ابن زیاد کے کوفہ پہنچنے پر بحیثیت گورنر پہلے ہی خود اس کے پاس آنا چاہیے تھا لیکن جناب مسلم کے قیام کی شہرت ہی غالباً اس کی وجہ تھی وہ ملنے نہیں آئے۔ اس چیز نے ابن زیاد کو اس اطلاع پر مزید یقین دلا دیا کہ مسلم بن عقیل ہانی کے گھر میں مقیم ہیں اور وہیں سے حضرت حسینؓ کی حمایت کے لیے بیعت کا سلسلہ چلایا جا رہا ہے اور اسی سے ان کو تقویت ملتی ہے۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جناب مسلم جب مختار کے گھر سے نکل کر ہانی کے گھر پہنچے تو ہانی ان کو دیکھ کر بے حد پریشان ہوئے کہ ابھی پریشانی بے جا بات ظاہر کر ڈالی اور

---

[1] طبری ج ۷ صفحہ

[2] اس سلوک کے بعد ایک دوسرا نام مختار بن ابی عبید کا بھی ہے جو مسلم کے ساتھ ایک ہے جن کا قصہ بعد میں بیان ہو گا۔

والوں کی روایت مہماں نوازی کی بجا لائیے۔

بہرحال ہانی کسی طرح آئے تو ابن زیاد نے بہت ہی آڑے ہاتھوں لیا اور اپنے اور اپنے باپ کے احسانات یاد دلا کر کہا کہ تمہارے گھر میں امیر المومنین کی حکومت اور عامۃ المسلمین کے امن و امان کے خلاف فتنہ و فساد کی یہ کھچڑی پک رہی ہے! ہانی نے انکار کیا مگر یہ چال نہ چلی۔ پھر انہوں نے وہی کمزوری دکھائی جو جناب مسلم کو اپنے دروازے پر پکڑ کر دکھائی تھی۔ کہا کہ واللہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ میں نے انہیں اپنے گھر نہیں بلایا تھا وہ میرے دروازے پر آ کر کھڑے ہوئے تو میں انہیں دھتکار نہ سکا۔ تم مجھے موقع دو میں ابھی جا کر انہیں رخصت کرتا ہوں کہ وہ جہاں چاہیں چلے جائیں۔ ابن زیاد نے کہا یہ نہیں ہو سکتا۔ ہاں تم اس کام کے لیے جا سکتے ہو کہ انہیں میرے پاس لے کر آؤ۔

شک ہے کہ ہانی کو اس مرحلے پر اپنے مہمان اور پناہ گیر کا حق یاد آگیا اور وہ ابن زیاد کی یہ فرمائش پوری کرنے کو تیار نہیں ہوئے۔ نتیجۃً ان کے ساتھ بے حرمتی کا معاملہ ہوا اور یہ خبر پھیلنے کے ساتھ مشہور ہوا کہ یہ قتل ہو گئے ہیں۔ ان کے گھر کی عورتوں کی آہ و فغاں نے مسلم بن عقیل کو مجبور کیا کہ وہ اپنے محسن کو ابن زیاد کے پنجے سے نکالنے کی تدبیر کریں۔ انکی طرف سے جو منادی ہوئی وہ یہ تھی کہ جن لوگوں سے انہوں نے حضرت حسینؓ کے لیے جانثاری کی بیعت لی تھی۔ جن کی تعداد عام طور سے اٹھارہ ہزار بتائی گئی ہے۔ انکی طلبی کیلئے مقررہ نعرہ بلند کریں۔ اور انہیں لے کر دار الامارۃ ۔۔۔ گورنر ہاؤس ۔۔۔ پر حملہ کر دیں۔ اس نعرہ پر عام روایت کے مطابق چار ہزار آدمی ایکدم جمع ہو گئے۔ اور جناب مسلم کی سرکردگی میں دار الامارۃ پر جا پہنچے۔

حملے کی پسپائی اور مسلم بن عقیل کی بے کسی

گو یہ چار ہزار بہرحال کوفی ہی تھے۔ ابن زیاد نے صرف تیس آدمیوں سے ساری

جمعیت آناً فاناً منتشر کردی۔ سرداران قبائل جو خواستہ یا ناخواستہ گورنر کے پاس ہی رہتے تھے پھر ابن مرجانہ کے سامنے آ گئے کہ خود یہاں ہیں یا پھر اپنے قبیلوں میں چلے گئے کہ وہاں لوگوں کی ماؤں بہنوں کو باہر بھیج دیں جو انہیں بھگا کر لے جائیں۔ بہرحال تھوڑی دیر میں بھیڑ چھٹ گئی اور جو کچھ رہ گئے تھے وہ بھی رات کے اندھیرے میں اسلحے کے ساتھ کھسکتے ہوئے جناب مسلم کو بالکل اکیلا چھوڑ گئے کہ وہ خود ہی اپنے لیے جو کچھ کر سکتے ہوں کریں۔

رات کو تو روایت کے مطابق کہیں پناہ مل گئی مگر دن نکلا اُجالا ہونے پر ان کا پتہ نشان ابن زیاد تک پہنچ گیا اور اس نے انہیں ایک نقشہ جو اور منصوبے سے لا دیکر سر قلم کرا دیا اور پھر یہی انجام ہانی بن عروہ کا بھی کرایا۔ یہ واقعہ ۹ ذی الحجہ کا بتایا گیا ہے[1]

---

[1] جناب مسلم اور ہانی کا یہ واقعہ کچھ مستند تفصیلات کے ساتھ طبری ج ۶ میں ص ۲۰۰ سے ۲۱۲ تک بیان ہوا ہے

باب نہم

قافلۂ حسینؑ اپنی آخری منزل کی طرف

مسلم بن عقیل جب ۹ ذی الحجہ سنہ ۶۰ھ کو صبح گرفتار کیے گئے تو جو صاحب اُن کی گرفتاری کے لیے فوج (FORK(لے کر آئے تھے[۱] محمد بن اشعث کہلاتے تھے اور جناب مسلم کے گھرانے کے لیے اجنبی نہ تھے۔ ان کے والد اشعث بن قیس حضرت علیؑ کے بہت نمایاں ساتھیوں میں تھے۔ لیکن جنگِ صفین کی خونریزی دیکھ کر حضرت علیؑ کے بہت سے ساتھیوں میں جو ایک جنگی تھکن آ گئی تھی اس میں یہ بہت نمایاں ہوئے اور تحکیم کے لیے حضرت علیؑ کی طرف سے عدول بنانا اور حضرت ابوموسیٰ اشعری کی نامزدگی زیادہ تر انہی کے دباؤ کا نتیجہ تھی۔ کیونکہ حضرت ابوموسیٰ کا جو رویہ اس خانہ جنگی کے بارے میں شروع ہی سے رہا تھا اس کی بنا پر ان کے بارے میں یہ یقینی تھا کہ وہ ہر قیمت پر آئندہ جنگ کا سدِباب ہی کریں گے۔ یہ محمد بن اشعث اُس مجلس جو اس کے شرکا میں بتائے گئے ہیں جو مسلم بن عقیلؑ کے کوفے میں آمد پر دارالامارہ میں پہلے روز ہوئی۔ لیکن ان کے بارے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جبکہ اور شرکا تو حسن و من سے جناب مسلم کے حق میں اس دور کی پرجوش تقریریں دہرایا کرتے رہے تھے یہ بالکل خاموش رہے تھے اور جیسے جیسے یہ پتہ چلتا گیا کہ کس والے سے آپ لوگوں کی تمنا دل میں شریک ہوں مگر قتل

---

[۱] مشہور روایات کے مطابق ان کی گرفتاری کے لیے بڑی فوج بھیجی گئی تھی اور بڑا معرکہ برپا ہوا۔ مگر طبری کی ص ۲۱ کی ایک روایت کے مطابق ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔

قتال کا معاملہ ہو تو اس میں شرکت کا روادار نہیں ہے[۱]

بہر حال جب ابن زیاد کے صریح اور محکم عزم کے آگے وہ لوگ بھی اپنا قبلہ بدلنے پر تیار ہو گئے جنہوں نے حضرت حسینؓ کو کوفے کی دعوت بھیجی تھی[۲]۔ تو محمد بن اشعث جو پہلے ہی کنارے پر کھڑے تھے انہیں حکم ہوا تو مسلم بن عقیلؓ کی گرفتاری کا ذریعہ بنا دیا گیا۔ انہیں ایسا کرنا کیوں کچھ زیادہ مشکل رہتا؟

روایت میں ہے کہ گرفتاری کے بعد جب جناب مسلم رونے لگے تو محمد بن اشعث کو تعجب ہوا کہ اتنے بڑے مشن کا آدمی رو رہا ہے۔ جواب دیا کہ رونا اپنے لیے نہیں ہے، حسینؓ اور ان کے قافلے کے لیے ہے جو آج کل میری غلطی کی بنا پر کوفے چل پڑے ہوں گے۔ تم اگر احسان کر سکو تو اتنا کر دو کہ انہیں میرے واقعے کی اطلاع کرا دو تاکہ وہ اب ادھر کا ارادہ ختم کر دیں۔ روایت کے مطابق محمد بن اشعث نے اس کا وعدہ کر لیا تھا لیکن ظاہر ہے کہ اس پیغام کے پہنچنے میں تو ابھی کافی وقت لگ گیا تھا[۳]۔

حج سے ایک دن پہلے روانگی

سیدنا حسینؓ جو تمام تر قرائن کی روشنی میں ظاہر کرنے ہی کا خیال لے کر مدینے سے نکلے تھے وسط رمضان میں مسلم بن عقیلؓ جیسے چچیرے بھائی کو کوفہ بھیجنے کے بعد منتظر تھے کہ وہاں سے مناسب حالات کی خبر آئے تو اپنی منزل کی طرف روانہ ہوں۔ غالباً ذوالقعدہ میں یہ خبر مل گئی[۴]۔ آپ نے

---

[۱] طبری ج ۶ ص ۱۹۱

[۲] شیعہ [illegible] مطبوعہ مصر ج ۶ ص ۱۹۵ [illegible]

[۳] یہ خود حضرت حسینؓ کو راستہ میں آ کر ملی [illegible] ایسی کوئی خبر [illegible] آگے [illegible] اس سوال پر آپ کے بیٹے کا [illegible] جواب ہے کہ [illegible]

[۴] اس خط کے پہنچنے کی تاریخ [illegible] سوائے البدایہ والنہایہ کے کہیں نہیں ملتی [illegible] ج ۸ ص ۱۶۰ [illegible] قتل [illegible] لیکن اس میں احتمال یہ ہے کہ خط کے قتل سے پہلے [illegible]

جیسی بتا دی گئی اور ٹھیک حج سے ایک دن پہلے یعنی ۸ ذی الحجہ کو جو کہ "یوم الترویہ" کہلاتا ہے اور حجاج کے قافلے اس دن مکے سے منیٰ کو روانہ ہوتے ہیں۔ آپ اپنے قافلے کے ساتھ کوفے کی سمت روانہ ہو گئے اور جیسا کہ ابھی گزر چکا ہے یہی وہ دن تھا جب کوفے میں مسلم بن عقیلؓ اہل کوفہ کی روایتی غداری کا شکار ہو کر زیاد کے ہاتھوں گرفتار ہو رہے تھے

خیر خواہ ایک بار پھر روکتے ہیں

حضرت محمد بن حنفیہ، عبداللہ بن مطیع اور عبداللہ بن عمرؓ کی کوشش کا ذکر پہلے آ چکا ہے کہ ہر ایک نے کوفے کے ارادے سے باز رکھنے کی ہر ممکن فہمائش اور درخواست کی مگر جیسے کہ تقدیر الٰہی میں ایک بات طے ہو چکی ہو، کسی کی بات مؤثر نہ ہوئی۔ آپ نے اہل کوفہ کی دعوت کو مشروط طور سے قبول کر کے مسلم بن عقیلؓ کو حالات کی تصدیق کے لیے وہاں بھیجا۔ اور ان کی تصدیق آتے ہی روانگی کا عزم کر لیا۔ اس عزم کی اطلاع دوسرے لوگوں کو کس طرح ہوئی اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ شاید سفر کی تیاریاں اور کچھ دوسری علامات قرینہ بن گئیں۔ بہرحال اس آخری وقت پر کچھ لوگ پھر روکنے کے لیے سامنے آئے۔

۱۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ

حضرت عبداللہ بن عباس بزرگ خاندان تھے۔ انھیں کے آبائی مکان میں آپ ٹھیرے ہوئے بھی تھے۔ انھیں اولاً سفر کی اطلاع نہ ہونے کا سوال ہی نہیں۔ علامہ ذہبی کی روایت یہ بھی ہے کہ زینب نے حضرت حسینؓ کے گھر آ جانے پر حضرت ابن عباسؓ کو بزرگ خاندان کی

۱۔ [illegible]

٭ [illegible]

[illegible]

[illegible]

حیثیت سے یہ بھی تھا کہ آپ انھیں سمجھائیں کہ وہ جو کچھ سوچ رہے ہیں وہ مناسب نہیں ہے۔ البدایہ والنہایہ ج ۸ میں ص ۱۶۳ پر اس خط کا اور اس کے جواب کا تذکرہ مختصر مضمون کے ساتھ ہے۔ جواب کا خلاصہ دیا گیا ہے کہ :

انی لأرجو ان لا یکون خروج	مجھے امید ہے کہ حسین کا ایسے ہم
بلعین لامر تکرهه دولت	نکلنا کسی ایسی بات کے لیے نہیں ہوگا
أدع النصیحة لہ فی کل ما جمع	جو تمہارے لیے باعث تکلیف ہو اور
بہ الالفة وتطفی بہ النائرة	اور میں بھی کوئی دقیقہ نصیحت میں ان
	کے سمجھانے میں کوئی کسر نہ چھوڑوں گا جس سے
	ہم لوگوں کی الفت باہمی برقرار رہے اور
	فتنہ دب جائے

اس خلاصہ جواب سے معلوم ہو گیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضرت حسینؓ کے پاس آئے اور بڑی دیر تک گفتگو کی جس میں آپ نے کہا کہ "خدا کے لیے عراق کا ارادہ نہ کرو اور اپنی جان کھپانے کو وہاں نہ جاؤ یہیں ٹھہرو کم از کم اتنی مہلت لو کہ یہ حج گزر جائے، حج میں آئے ہوئے لوگوں سے مل کر وہاں کے حالات کا اندازہ کرو اور پھر جو کچھ طے کرنا ہو گا۔"

اس گفتگو کا جو حصہ کہ مآخذ میں ملتا ہے وہ بتاتا ہے کہ یہ بالکل اس وقت کا ہے جبکہ روانگی ہونے والی تھی۔

حضرت ابن عباسؓ کی مذکورہ گفتگو اگر یزید کی تحریک اور آپ کی خط و کتابت کا نتیجہ ہیں جیسا کہ البدایہ کی طرز تحریر سے ظاہر ہوتا ہے تو اس کا مطلب ہوگا کہ یزید نے حضرت ابن عباسؓ کو بالکل آخری مرحلہ میں لکھا جبکہ ذی الحجہ کا مہینہ شروع ہو چکا تھا اور حضرت حسینؓ روانگی کی تیاری کر رہے تھے۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ یہ گفتگو اگرچہ البدایہ والنہایہ میں اس

[illegible] سامنے ہے۔

[illegible] البدایہ ج ۸ ص ۱۶۳

طرح صحت کی گئی ہے جیسے کہ اوپر کی خط و کتابت کا تجزیہ ہو بلکہ ہو سکتا ہے یہ گفتگو اس سے الگ بالکل آخری مرحلے کی ہو جبکہ یزید کا خط ظاہر اسی مرحلے میں آیا ہوگا جب حضرت حسینؓ کے مکہ آنے کے بعد وہاں کوفیوں کی آمد شروع ہوئی اور مسلم بن عقیل کوفے پہنچ گئے۔ ہمارے نزدیک قرین قیاس یہی بات ہے۔ یعنی مذکورہ بالا گفتگو دوسری بار کی ہے ورنہ اصل گفتگو آپ نے نکلنے کے قریب ہی کی ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ اس وقت جو گفتگو حضرت ابن عباس اور حضرت حسینؓ کے درمیان ہوئی وہ ریکارڈ میں نہ آئی ہو۔ البتہ جب حضرت حسینؓ کوفے کے قصد پر مصر ہو کر پابہ رکابی کے مرحلے میں داخل ہو گئے ہوں تب حضرت ابن عباسؓ نے ایک بار پھر انہیں سمجھانے کی کوشش کی ہو اور وہ روایت ہو کہ ابن کثیر تک پہنچی ہو۔ بہر حال آگے روایت کا بیان یہ ہے کہ حضرت حسینؓ نے حضرت ابن عباس کا مشورہ قبول نہیں فرمایا فابی علیہ الا ان یمضی الی العراق (حسینؓ عراق جانے کے ارادے پر مصر رہے) فقال لہ ابن عباس [illegible]

حضرت ابن عباسؓ نے ان سے فرمایا۔

واللہ انی لاظنک ستقتل	واللہ مجھے لگتا ہے کہ تم کل اپنی بیویوں
غداً بین نسائک و بناتک	اور بیٹیوں کے درمیان اسی طرح قتل
کما قتل عثمان بین نسائہ	کیے جاؤ گے جیسے عثمانؓ اپنی بیویوں اور
و بناتہ واللہ انی لاخاف	بیٹیوں کے درمیان قتل ہوئے تھے
ان تکون الذی یقاد بہ	واللہ مجھے تو یہ بھی خوف ہے کہ تم وہ نہ ہو
عثمان فانا للہ وانا الیہ	عثمانؓ کے قتل کے بدلے مارے جاؤ
راجعون	(تم پر افسوس ہے تو) انا للہ وانا الیہ راجعون[1]

لیکن حضرت حسینؓ کے فیصلے پر کوئی تفہیم بھی کچھ مؤثر نہ ہو سکی بلکہ جیسا کہ آگے روایت میں ہے

---

[1] طبری کی روایت میں یہ اشعار نہیں ہیں اور حضرت ابن عباسؓ کی زبان سے [illegible] قابل تحسین [illegible] یزید کے [illegible] ثبوت ہیں [illegible] البدایہ والنہایہ [illegible]

آپ نے اس اقدام پر تنبیہاً ایک گونہ ناگواری کا اظہار فرمایا۔

۲۔ **ابوبکر بن عبدالرحمٰن**: یہ مدینے کے مشہور فقہائے سبعہ میں سے تھے۔ ان کے والد عبدالرحمٰن بن الحارث بن ہشام بن المغیرہ المخزومی القرشی خود بڑے صاحب جمال تھے۔ غالباً حج کو آئے ہوئے تھے کہ حضرت حسینؓ کے قصدِ کوفہ کا چرچا سنا تو از راہِ خلوص و محبت حاضرِ خدمت ہوئے۔ اور حسبِ روایت طبری[2] یہ عرض کیا کہ۔

"آپ ایک ایسے ملک کا ارادہ فرما رہے ہیں جہاں عمال پہنچے ہوئے ہیں بلکہ وہاں اس کے امراء و حکام موجود ہیں جن کے ہاتھ میں خزانے ہیں اور لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ روپے پیسے کے بندے ہیں۔ پھر وہی لوگ جنھوں نے آپ کی مدد کا وعدہ کیا ہے وہ آپ کے خلاف لڑنے کو تیار ہو جائیں گے۔"[2]

مسعودی کی روایت میں ان کا پیرایۂ بیان کچھ اور زیادہ مؤثر ہے۔ فرمایا کہ۔

"دیکھیے آپ کے والد ماجد آپ سے زیادہ حوصلہ اور طاقت رکھتے تھے۔ لوگ ان کی بات سنتے بھی زیادہ تھے۔ اہل شام کو چھوڑ کر باقی سب ان کی حمایت پر جمع ہو گئے تھے۔ وہ ان کو لیکر معاویہ کے مقابلے پر چلے۔ معاویہ کی ان کے مقابلے میں کچھ حیثیت نہ تھی۔ مگر پھر بھی لوگ دنیا اور دنیوی زندگی کی محبت میں ان کا ساتھ چھوڑ گئے۔ انھیں بار بار غصہ دلایا حتی کہ اسی حالت میں وہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ پھر جو کچھ ان لوگوں نے آپ کے بھائی کے ساتھ کیا وہ سب بھی آپ جانتے ہیں اور پھر ایسی غداریوں کا تجربہ کر کے آپ ان لوگوں سے لڑنے جا رہے ہیں جو آپ کے مقابلے میں زیادہ قوی اور تعداد میں زیادہ ہیں۔ لوگ ان سے امیدیں بھی رکھ سکتے ہیں اور ڈرتے بھی زیادہ ہیں۔"[3]

---

[1] مروج الذہب مسعودی کے مصری نسخہ میں ان کے بجائے عمر بن عبدالرحمٰن لکھا ہے مگر صحیح نام ابوبکر ہی معلوم ہوتا ہے۔ طبری سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو الاصابہ لابن حجر ج ۵ ص ۲۱۔ [2] جزء ۶ ص ۲۱۶۔

[3] مروج الذہب دارالاندلس بیروت ج ۳ ص ۵۵

۳۔ **مکی اور مخلصین**۔ اسی طرح اصحابؓ کے نام آتے ہیں جن کا تعلق مخلصین کے گروہ سے تھا جنہوں نے یا اس عنوان سے کہ تحریک کے مقصد کی مخالفت کی کہ کوفی بالکل ناقابل اعتماد ہیں اور حالات ناسازگار یا اس عنوان سے کی کہ اس اقدام خروج کا کوئی جواز نہیں ہے۔ ابن کثیر نے ایک ہی جگہ پر تمام لوگوں کے اقوال جمع کر دیئے ہیں[1]۔ حضرت ابو سعید خدری، جابر بن عبداللہ، واقد بن واقد اللیثی اور مسور بن مخرمہ سب اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور یہ سب مخلصین حضرت علیؓ میں سے تھے۔ حضرت ابو سعید خدری کے متعلق بتایا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا:-

"اپنی جان کے بارے میں اللہ سے ڈریئے اپنے گھر ہی میں بیٹھے رہیے اور امام پر خروج مت کیجئے۔"

حضرت جابر بن عبداللہؓ نے فرمایا:-

"لڑائی سے ڈریئے اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے مت ٹکرایئے۔"

واقد بن واقد اللیثیؓ نے فرمایا کہ:-

"آپ کا خروج صحیح نہیں ہے آپ صرف اپنی جان دے بیٹھیں گے پس اس سے باز رہیئے"

مسور بن مخرمہ نے لکھا کہ

"اہل عراق کے خطوط سے دھوکہ میں نہ آیئے اور ابن زبیر کے اس قول سے کہ وہ لوگ آپ کی مدد کریں گے۔"

لیکن سب ہی کی خواہشیں، نصیحتیں اور دلیلیں ناکام ہو گئیں اور حضرت حسینؓ ۸ ذی الحجہ کو دوپہر کے وقت جبکہ حجاج منیٰ کے لیے روانہ ہو رہے تھے عمرے کے ارکان ادا کر کے کوفے کی سمت روانہ ہو گئے[2]۔ گویا آپ نے احرام باندھا ہوا تھا مگر وہ احرام حج کا نہیں عمرے کا تھا۔

---

[1] البدایہ والنہایہ جلد ۸ ص ۱۶۳۔

[2] طبری ج ۶ ص ۲۱۶۔ [illegible] حضرت حسینؓ کی اس منزل کی [illegible] سوال ہے [illegible] لیکن یاد رہے کہ ابھی یہ روایت نظر سے گزری ہے کہ آپ نے [illegible]

عبداللہ بن جعفر کی سعی

حضرت کے عم زاد عبداللہ بن جعفرؓ حجاز کی بڑی نامور شخصیت تھے۔ عم زاد ہونے کے علاوہ حضرت کی ہمشیرہ حضرت زینب کبریٰ کے شوہر بھی تھے تاہم مدینے میں رہ جاتا [illegible] جانے سے آپ ہول گئے۔ یہیں کہا جا سکتا کہ حضرت حسین کی روانگی سے پہلے ان کی کسی ملاقات کا ذکر کہیں نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے حضرت حسین کے اس عزم سے جو وہ یزید کے سلسلے میں اختیار کر رہے تھے متفق نہ ہوں کیونکہ وہ حضرت معاویہ کے زمانے سے اس خاندان کے ساتھ بہتر تعلقات رکھتے آ رہے تھے۔ جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ کا بھی یہی سلسلہ تھا۔ اور عمر میں حضرت حسین سے بڑے بھی تھے بہرحال وجہ کچھ بھی ہو۔ روایت ہے کہ ان کو اطلاع ملی کہ حسین روانہ ہو گئے تو اپنے دو بیٹوں کو حضرت حسین کے تعاقب میں روانہ کر کے کہا کہ آگے بڑھ کر ان سے کہو کہ اللہ [illegible] کیونکہ وہ شہر میں [illegible] کہ وہ سیدھے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ہوا [illegible] تھا جس میں ان کا ارادے کے لیے ایک اشارہ پایا جاتا ہے لیکن گیا [illegible] کہ آپ اس ارادے پر نظر ثانی کے لیے تیار نہ تھے۔ مگر جب ہم آگے چل کر دیکھتے ہیں کہ آپ اس ارادے کو ملتوی کر کے واپس لوٹ جانے پر بھی تیار ہو گئے تھے مگر تقدیر کی مصلحتوں نے [illegible] ممکن نہ ہونے دیا تو [illegible] کچھ [illegible] اور اس کے بعد یہ بات بھی عیاں ہو جاتی ہے کہ تاریخی بیانات کی روشنی میں [illegible] کہاں تک [illegible] آپ کے حالات کے مطابق حضرت معاویہ کی [illegible] حالات کی مجبوری سے قبول کیا [illegible] کر رکھا ہے۔ اور جب خود یزید کی ولی عہدی کا مسئلہ سامنے آیا تو [illegible] کے بعد سے [illegible] سامنے آنے لگا تھا [illegible] معاویہ کے خلاف جہاد کرنے کے فکر [illegible] مشکل [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کو نظر انداز کر دیا [illegible] کی اہمیت بھی آ گئی [illegible] خلافت [illegible] [illegible] گزشت [illegible] [illegible] تھے [illegible] اس [illegible] [illegible] [illegible] سے [illegible] [illegible] عہد [illegible] سمجھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

والیٔ حرمین عمرو بن سعید سے کہا اس لیے کہ دیکھو حسین چلے گئے ہیں اگر آپ ایک خط امان کیلئے لکھ دیں کہ واپس آ جائیں اور یہ کہ ان کے ساتھ حسن سلوک اور صلہ رحمی سے پیش آؤ گے کسی طرح کا کام والیٔ ان کے خلاف نہیں ہوگی۔ روایت کہتی ہے کہ عمرو نے عبداللہ بن جعفر سے کہا کہ تم خود خط لکھو اور مجھ سے دستخط کرا لو۔ چنانچہ یہی ہوا۔ پھر ابن جعفر نے کہا کہ مزید اطمینان کے لیے اپنے بھائی یحییٰ کو میرے ساتھ کر دو تاکہ یہ خط انہی کی طرف سے روانہ ہو اور حسین کو یقین ہو۔ چنانچہ یہ بھی ہوا یہ دونوں صاحبان حضرت حسین کے پاس پہنچے۔ مگر دوسرے تمام لوگوں کی طرح ناکام ہی رہے۔ ۱؎

والیٔ حرمین کی طرف سے جبر روکے جانے کی روایت

تبصرہ: عبداللہ بن جعفر اور والیٔ حرمین عمرو بن سعید کے بارے میں جو روایت ابھی مذکور ہوئی اس کی روشنی میں طبری ہی کی یہ دوسری روایت کسی طرح قابل اعتبار نظر نہیں آتی کہ جیسے ہی قافلہ مکے سے نکلا معلوم کہ عمرو بن سعید کے فرستادے ان کے بھائی یحییٰ بن سعید کی قیادت ۲؎ میں ان کا راستہ روکنے اور جبر کر کے واپس لانے کے لیے پہنچے۔ مگر لوگ کامیاب نہیں ہو سکے تھوڑی سی زد و کوب اور مار پیٹ کے بعد یہ فرستادے ناکام لوٹنے پر مجبور ہو گئے۔ دونوں روایتوں میں اتنا تضاد ہے کہ ان میں کوئی ایک ہی ٹھیک ہو سکتی ہے۔ دونوں بیک وقت نہیں ہو سکتیں۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ دوسری والی روایت پہلی والی روایت میں مذکورہ واقعہ ہی کی بگڑی ہوئی شکل ہے اور کچھ نہیں۔ ویسے بھی یہ کیا تک تھا کہ مکے کے حاکم نے جیسے حضرت حسین ہی سے پلٹ کر نہیں پوچھا کہ آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ جبکہ اسے معلوم تھا کہ آپ نے مدینہ کیوں چھوڑا ہے۔ رمضان تک تو مکے کا حاکم ہی تھا رمضان میں مدینے کی حکومت بھی اس کے سپرد کر دی گئی تھی اور اس سپردگی کے ساتھ ہی اس نے عبداللہ بن زبیر کے

۱؎ طبری ج ۶ ص ۲۱۹-۲۰

۲؎ ایضاً صفحہ ۲۱۸

مخالفت — جو حضرت حسین ہی کے ساتھ مکے میں آئے تھے۔ گرفتاری کے بعد والی بھی شروع کر دی تھی[1] اس کے برخلاف کوئی ایک بھی روایت نہیں ملتی کہ اس نے حضرت حسین کو چھیڑا ہو، ان کے معاملات میں کسی طرح کا دخل دیا ہو۔ حالانکہ اہل کوفہ کے وفود مکہ کے پاس آ رہے تھے، ان کے خطوط آ رہے تھے اور وہ سفر کی تیاریاں کر رہے تھے تقریباً اسی نفوس آدمیوں کا قافلہ جانے کو تھا اس کی تیاریاں یا ساز و سامان جو پہلے سے ہی کل سامان نظر آنے ہی لگی ہوں گی اب بھی مقام ہمت میں تو حاکم مکہ نے ان سے تعرض نہیں کیا مگر جب وہ مکہ سے نکل جاتے ہیں تو ان کی پکڑ کو کوئی دوڑتا ہے۔ کوئی سمجھ کی بات تو نہیں نیز خود اس روایت کا ایک دوسرا جزو بجائے خود اس بات کی دلیل بن سکتا ہے کہ حاکم مکہ کی طرف سے تعاقب کی کہانی درست نہیں ہے۔ وہ دوسرا جزو یہ ہے کہ قافلہ حاکم مکہ کے فرستادوں کو پسپا کر کے آگے بڑھا تو ایک قافلہ جو یمن سے رسالہ یمن کے متعلق ورس دمشق کے لیے بہت سے قیمتی سامان لیے جا رہا تھا حضرت حسین نے اس پر قبضہ کر لیا اور شتر والوں سے کہا کہ تم میں سے جو چاہے یہاں سے لوٹ جائے اور جو چاہے ہمارے ساتھ کوفے تک چلے ہم دونوں کو معاوضہ دیں گے — ہمارا خیال ہے کہ روایت کے دونوں اجزا میں سے کوئی ایک ہی ٹھیک ہو سکتا ہے دونوں کیسے۔ یہ بات قابل تعجب ہے کہ ابھی حاکم مکہ کے آدمیوں سے ٹکراؤ ہوا تھا جس کے بعد پہلا اندیشہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ شاید مزید کمک لے کے آتے ہوں اور ابھی ٹھیک ایسا کام کیا جائے کہ ایک اور سرکاری قافلے کے اموال پر قبضہ کیا اگر پسپا شدہ لوگ کسی کمک کے ساتھ دوبارہ نہ بھی آتے ہوں تو اس نئے واقعہ کے بعد حاکم یمن بالکل مجبور ہو جاتے کہ وہ سرکاری مال کی بازیابی اور شتربانوں کی امداد کے لیے کوئی مؤثر کارروائی کرے۔ اور جب روایت میں یہ بھی ہے کہ جن شتربانوں نے آگے جانا قبول نہیں کیا ان کا چکتا حساب کر دیا گیا[2] تب تو حاکم مکہ کو واقعہ کی پوری اطلاع ہونے کا بھی سامان ہو گیا تھا اور

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۹۲

[2] طبری ج ۶ ص ۲۱۸

کسی کاروائی کا اندیشہ نہ ہونے کا سوال ہی کیا تھا۔ بہرحال روایت کے دونوں اجزاء میں سے ایک صریح غلط ہے اور اس صورت حال کے نتیجہ میں یہ بھی سوچا جا سکتا ہے کہ دونوں ہی غلط ہوں۔[1]

نوٹ کرنے کی بات

بہرحال نہ صرف یہ کہ جبر و اکراہ والی یہ روایت کسی طرح قابل قبول نظر نہیں آتی۔ بلکہ یہ بات بھی نوٹ کی جانی چاہیے کہ جس طرح حاکم مدینہ ولید بن عتبہ بن ابی سفیان نے حضرت حسین کے ساتھ تا صدور [illegible] کے بجائے معاندانہ احترام کا معاملہ کیا۔ اور حضرت عبداللہ بن زبیر کے برخلاف آپ کو بالکل آپ کے حال پر چھوڑ دیا۔ اسی طرح حاکم مکہ ـــ اور بعد میں حاکم حرمین ـــ عمرو بن سعید بن العاص ـــ المعروف اشدق ـــ نے آپ کے ساتھ یہی معاملہ رکھا کوئی تعرض آپ سے نہیں کیا اور کیا تو وہ بھلائی کا معاملہ کیا جو عبداللہ بن جعفر نے ان سے چاہا تھا۔ ہمارے خیال میں یزید کے بارے میں حضرت حسین کے سخت تاثرات و رویہ کی روشنی میں یہ بات نہیں سوچی جا سکتی کہ مقامی حکام احترام اور نرمی اور خیر خواہی کا یہ معاملہ مرکزی حکومت اور بالخصوص دمشق کی مرضی کے بغیر کر رہے ہوں۔ اہل مدینہ و قریش کے پہلو پر ہو چکا ہے اور حضرت عبداللہ بن عباس کے نام کے خط سے بھی جس کا اوپر تذکرہ ہوا یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یزید کی طرف سے حضرت حسین اور حضرت عبداللہ بن زبیر کے معاملہ میں وہی فرق تھا جس فرق کی حضرت معاویہ نے اسے وصیت کی تھی۔[2]

---

[1] شہید انسانیت کے مصنف جناب علی نقی صاحب نے اسی احتمال یا کسی دوسرے احتمال سے بچنے کی راہ یہ اختیار فرمائی ہے کہ ان الفاظ کو محض ایک تاثر بتایا ہے جس کا سرکاری [illegible] نہیں ہوگا۔

[2] مشہور شیعہ مورخ [illegible] نے حضرت حسین کے خیر خواہ [illegible] کے لیے [illegible] کے قتل کرنے کے جب جب الزامات [illegible] مدینہ و مکہ سے دمشق بھیجے گئے ہیں مگر سب بے بنیاد اور محض افترا ہیں۔ چنانچہ ان کے لیے کوئی حوالہ نہیں دیا گیا ہے (تاریخ [illegible])

ذی الحجہ کی ۸ ریا ۱۰ ر

محمود احمد عباسی مرحوم نے اپنی کتاب "خلافت معاویہ و یزید" میں ایک مناسب بحث یہ کی ہے کہ حضرت حسینؓ کے قافلے کا سفر ۸ ذی الحجہ کو حج سے پہلے شروع ہوا تھا یا ۱۰ ر کو؟ وہ کہتے ہیں کہ ۸ ر کی جو روایت عام طور پر مؤرخین کے یہاں پائی جاتی ہے وہ صحیح نہیں ہے صحیح ۱۰ ر ذی الحجہ ہے۔ یعنی آپ حج کر کے روانہ ہوئے تھے۔ اس کے انہوں نے بہت سے دلائل دیئے ہیں۔ منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ دمشق کو جانے والے راستے میں تنعیم تک قافلے کے پہنچنے کی جو روایت آئی ہے اس میں اس مقام کا نام تنعیم کو بتایا گیا ہے۔ جو مکہ سے شمال مغرب کی جانب ۳ میل کے فاصلے پر مشہور جگہ ہے۔ اس کو چھوٹا عمرہ بھی کہتے ہیں کیونکہ عمرہ کا احرام اہل مکہ کے لیے حدود حرم سے باہر جا کر باندھنا پڑتا ہے تو اس کام کے لیے یہ قریب ترین جگہ ہے۔ عباسی صاحب کہتے ہیں کہ تنعیم کا محل وقوع اس سمت جنوب مشرق سے جس سمت میں آدمی مکے سے کوفے کو جاتا ہے بالکل مخالف سمت شمال مغرب میں جو دمشق کو ہے۔ تو مکے سے کوفے کو جاتے ہوئے تنعیم کا یہ واقعہ کیسے پیش آ گیا؟ اور کیسے یہ قافلہ حج کے ایام میں مکے سے گزرا تھا ختم حج کے بعد ہو سکتا ہے آگے بڑھ کر تنعیم پہنچ گیا ہوگا؟ عباسی صاحب کا یہ سوال تو بالکل صحیح ہے مگر اس کے بعد یہ جو وہ کہتے ہیں کہ اسی لئے حج کے بعد ۱۰ ر ذی الحجہ کو ہی حضرت حسینؓ کا سفر ملتا ہے تو یہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) شفاء شہید وفات ۱۱۳۰ھ جس کے لیے ملک برنے نے یہ دعویٰ کیا کہ حضرت حسینؓ کے سر سے انکار کیا مروان نے ان سے کہا کہ بیعت کرنے والوں کی فہرست میں جن کے ساتھ حسینؓ کا سر بھی ہونا چاہیے۔

یہ گویا وہ بات ہوئی تو کہ جس تقریر کو اس سلسلے میں شامل تھا کہ جو مدینے کے حاکم کو زبان سے ہو کر حسین مدینے سے قتل کر کے پہنچ گئے ہیں جن کو گرفتار کر لو۔ ما لکے یہاں پہ کا تن تنہا سے اور غیب کا مجرم تھا۔؟

واقعہ ممکن ہو سکتا ہے" یہ بالکل بھی قابل قبول بات نظر نہیں آتی۔ کیونکہ حج کرنے کی صورت میں حضرت حسینؓ اور ان کا قافلہ تنعیم سے "اسی مخالف سمت میں جس سمت میں عراق کو جاتے اس وقت کے مقابلے میں اور زیادہ دور ہو جاتا تھا جس وقت آپ روانہ ہوئے کیونکہ مکہ مکرمہ میں رہتے حج کے ارکان منیٰ، مزدلفہ اور عرفات میں ادا ہوتے ہیں اور یہ مقامات مکہ سے بجانب مشرق (یا جنوب مشرق) ۲ ½ میل سے لیکر ۱۲ میل تک کے فاصلے پر ہیں۔ جبکہ تنعیم مکہ سے خود عباسی صاحب کے قول کے مطابق بھی ـــ بجانب شمال غرب ۳۔۴ میل کے فاصلے پر ہے۔ پس مکہ سے ۳۔۴ میل مخالف سمت میں اگر اس واقعہ کا تصور مشکل ہے تو اسی مخالف سمت میں ۱۵۔۱۶ میل کا فاصلہ ہو جانے پر اور بھی زیادہ مشکل ہو جانا چاہیے۔

دوسری دلیل عباسی صاحب نے البدایہ والنہایہ کے الفاظ "و ذلک فی عشر ذی الحجۃ" کو بنایا ہے جس کا مطلب ان کے خیال میں یہ ہوتا ہے کہ حضرت حسینؓ ۱۰ ذالحجہ کو روانہ ہوئے۔ مگر اسی البدایہ والنہایہ میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ:

فاتفق خروجہ من مکۃ ایام	یعنی آپ کا مکہ سے خروج ایام ترویہ
الترویۃ قبل مقتل مسلم بیوم	میں قتل مسلم سے ایک دن پہلے ہوا
واحد۔ فان مسلماً قتل یوم عرفۃ[1]	مسلم کا قتل یوم عرفہ میں ہوا تھا۔

پس اس کی روشنی میں "عشر ذی الحجۃ" کا معنی ۱۰ ذی الحجہ نہیں بلکہ عشرہ ذی الحجہ لیا جائے گا۔

علاوہ ازیں معاملہ کا یہ پہلو بھی عباسی صاحب سے نظر انداز ہو گیا کہ اگر حضرت حسینؓ نے سفر کا آغاز حج کے بعد کیا ہوتا تب ۱۳ تاریخ سے پہلے سفر نہیں کر سکتے تھے۔ حاجی کو کم از کم ۲ روز تک تو منیٰ میں رک کر رمی جمرات کرنا ہوتی ہے۔ اور اس صورت میں عباسی

---

[1] ج ۸ ص ۱۵۹۔

صاحب کے دیئے ہوئے پیمانۂ رفتارِ سفر کے مطابق ۲ محرم کو کربلا میں نہیں پہنچ سکتے تھے جیسا وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

ہمیں بذاتِ خود دریا اور اس کی بحث سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ لیکن عباسی صاحب کے ناقدین میں سے کسی کی نظر سے ہمارے یہ صفحات گزرے تو اسے خیال ہو سکتا ہے کہ ایک سوال جو حضرت حسین کی تاریخِ روانگی کے سلسلے میں اتنی اہمیت رکھتا ہے ایک مصنف نے اٹھایا تھا اسے والے دوسرے مصنف نے اس سے بالکل اعتنا ہی نہیں کیا۔ اس لیے ہم نے ضمناً اس بارے میں عرض کرنا مناسب سمجھا گیا۔

کربلا تک کی روداد سفر اور یوم شہادت کی روایتیں

آغاز سفر کے ساتھ جس طرح کی روایتیں ابھی آپ کے سامنے آئیں کہ ایک کا مضمون دوسرے کی نفی کر رہا ہے۔ بلکہ خود ایک ہی کے اندر کے دو حصے ایک دوسرے سے تضاد رکھتے ہیں۔ ان کے بعد جو روایتیں کربلا تک کے سفر اور یوم شہادت کی روداد بیان کرتی ہیں، وہ بعینہٖ اسی کیفیت کی حامل اگرچہ نہ ہوں مگر دوسرے متعدد اسباب سے ان کا بیشتر حصہ مشکوک اور ناقابلِ اعتبار ہے اور کوئی خاص اہمیت بھی اس طرح کی روداد کے بیان کی ہے نہیں۔ مثلاً آپ راستے میں کہاں کہاں ٹھہرے؟ کیونکہ اکثر جگہیں جب وہ ہیں جو قدرتی طور سے ایک بڑے جلوس کا وجود رکھتی ہیں۔ ان کا علم آئے ہو یا نہ ہو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یا کتنی دیر تک وہ منزلوں کے بیچ میں چلے اور کتنی دیر اور کون سے وقت آپ کس منزل پر ٹھہرے، اور کتنا پانی کہاں سے ساتھ لیا۔ اور کس منزل کی کیفیت کیا تھی؟ یہ سب باتیں وہ ہیں جو اس واقعہ کے بارے میں اس خاص نقطۂ نظر کے ساتھ جو شیعہ حضرات کا ہے اور جو اعتقادات حضرت حسین اور ان کے اہل بیت کے بارے میں شیعہ حضرات رکھتے ہیں ان اعتقادات کے ساتھ تو ان تفصیلات میں جانے کے

کوئی معنی ہو سکتے ہیں۔ لیکن ان اعتقادات اور اس نقطۂ نظر کے تحت ان تفصیلات میں جانا کوئی بامعنی کام نہیں ہوگا اس لیے ہم تفصیل برائے تفصیل کے بجائے اس روداد کی صرف وہی باتیں یہاں بیان کریں گے جن میں ہر اعتقاد اور ہر نقطۂ نظر کے لیے کوئی افادیت کا پہلو ہے۔

فرزدق سے ملاقات

فرزدق عربی شاعری کا مشہور نام ہے۔ حضرت علی اور آپ کے اہل بیت کے حامیوں میں سے تھا۔ عراق ہی اس کا وطن تھا۔ طبری نے دوران سفر حضرت حسین سے اس کی ملاقات بتانے والی دو روایتیں دی ہیں۔ ایک بتاتی ہے[1] کہ مقام صفاح پر اس کی ملاقات ہوئی جو کہ حدود حرم سے باہر تقریباً دس میل کی مسافت پر ہے اور اس ملاقات کے راوی ایسے دو کوفی ہیں جو ایام ترویہ میں مکہ میں پہنچے جو کہ حضرت حسین کی روانگی کا دن تھا۔ اور آپ کو رخصت کر کے حج کے قافلوں میں شامل ہو گئے۔ اس سفر کی بہت سی روایتیں انہی دو کے حوالے سے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ ہم حج سے فارغ ہو کر شتابی سے حضرت حسین کے تعاقب میں نکلے ـــــ شریک سفر ہونے کے لیے نہیں بلکہ تماشہ دیکھنے کے لیے کہ کیا ہوتا ہے۔ ہم صفاح پہنچے تو دیکھا کہ فرزدق ہے جو حضرت حسین سے مل رہا ہے اور ان دونوں کی بات چیت ختم ہوئی تو حضرت حسین نے اپنی سواری کو حرکت دی اور السلام علیکم کہہ کر دونوں الگ ہو گئے۔ ان الفاظ سے صاف طور پر یہی مفہوم ہوتا ہے کہ فرزدق عراق کی طرف سے آ رہا تھا جدھر کو حضرت حسین تشریف لے جا رہے تھے۔

عراق کی سمت سے آنے کا یہ کون سا وقت تھا۔ جبکہ حج ہو چکا ہے ؟ اور حضرت کو صفاح پہنچتے پہنچتے جو کہ بمشکل دو تین میل ہی ہے اب سے کتنے دن لگ گئے کہ وہ دو کوفی

---

[1] طبری ج ۷ ص ۲۱۸

وعبد الکریم نمیرؓ اور الندری پر مشتمل ہو واقعہ کے راوی ہیں، حج کرنے کے بعد حضرت حسینؓ کے پیچھے نکلے تو اس وقت تک حضرت حسینؓ کا قافلہ صفاح تک ہی پہنچا تھا جبکہ یہ لوگ یا حج کے ارکان ادا کرنے کے بعد ۱۲ ذی سے پہلے نہیں روانہ ہو سکے ہوں گے۔ یعنی حضرت حسینؓ کی روانگی کے چار روز بعد ان کی روانگی ہوئی ہوگی!

دوسری روایت[۱] جس کا راوی خود فرزدق کو بتایا گیا ہے وہ بتاتی ہے کہ فرزدق ۶۰ھ کے ایام حج میں اپنی والدہ کو حج کرانے کے واسطے لیے ہوئے حرم میں حدود حرم میں داخل ہوا تو سے ایک قافلہ کے نکلتا ہوا ملا جو تلواروں اور ڈھالوں کے ساتھ تھا معلوم کرنے پر کہ یہ کس کا قافلہ ہے پتہ چلا کہ حضرت حسین بن علیؓ کا۔ فرزدق نے لپک کر سلام اور کچھ بات چیت کی جس میں یہ سوال بھی تھا کہ اے ابن رسول اللہ آپ حج چھوڑ کے کہاں جا رہے ہیں؟

پس پہلی روایت کی رو سے ۸ یا یوم عرفہ (۹) سے بھی قریب چار پانچ دن ضرور ہو چکے تھے جب فرزدق عراق سے آتے ہوئے صفاح کے مقام پر حضرت حسینؓ سے ملا۔ دوسری روایت کی رو سے فرزدق ۸ ذی الحجہ کو حرم شریف پہنچ گیا تھا اور حضرت حسینؓ سے ملاقات کے آپ کے نکلتے وقت ہوئی۔

اور ایک تیسری روایت بھی ہے جو بعض شیعہ مصنفین نے بے مآخذ سے لکھی ہے وہ اس ملاقات کے واقعہ کی ایک تیسری شکل بتاتی ہے کہ فرزدق حج کر کے لوٹ رہا تھا تب یک پڑاؤ پر ملاقات ہوئی۔ غرض "شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا" کا مضمون ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ یا کہہ لیجئے وہ ان کا فیل تھا جس کو جس اندھے نے ہاتھی کے جس حصے کو چھوا اسی کی شکل و صورت اور ساخت کو لے کے ہاتھی کی شکل اور ساخت بنا دیا۔

رہ دو دوسری روایتوں کا بھی وہ حال ہے جس کی بنا پر عرض کیا گیا کہ بالکل بعید

---

[۱] ایضاً۔ [۲] عبدالرزاق الموسوی المقرم نے مقتل الحسین میں لکھا ہے۔

نہیں ہیں۔ فرزدق کی ملاقات کے سلسلے میں طبری کی دونوں روایتیں یہ بتاتی ہیں کہ حضرت حسین نے فرزدق سے پوچھا کہ اپنے پیچھے (یعنی عراق میں) کیا حال چھوڑ کر آئے ہو؟" فرزدق نے جواب دیا کہ،

> "دل آپ کے ساتھ ہیں اور تلواریں بنی امیہ کے ساتھ اور قضا و قدر اللہ کے ہاتھ میں۔ جس پر آپ نے فرمایا "سچ کہتے ہو" اور رخصت ہو گئے۔[1]

یہاں قدرتی طور پر حیرت ہوتی ہے کہ حضرت حسین نے تو یہ سفر ہی اس طرح اس اطمینان پر شروع کیا تھا کہ کوفے کے لوگ آپ کی حمایت پر مستعد اور آپ کی آمد کے لیے چشم براہ ہیں پھر فرزدق کی اس سے بالکل مختلف بات پر اظہارِ تعجب کرنے کے بجائے آپ نے تصدیق و تصویب فرمائی! بعد میں آنے والی کچھ اور روایات بھی ایسی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ فرزدق والی گفتگو کی شاید کوئی اصلیت نہیں ہے۔ یہ روایتیں آگے آ رہی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ فرزدق سے ملاقات سے کافی دور بعد تک حضرت حسین کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ اب کوفہ ان کے ساتھ نہیں ہے

انجامِ حضرت مسلم کی خبر

حضرت حسین کا قافلہ کوفے کی طرف سرگرمِ سفر تھا۔ مسلم بن عقیل کا خط ملنے کے بعد سے وہاں کے حالات میں جو تبدیلی ہوئی تھی مثلاً خود جناب مسلم اور ہانی بن عروہ کو دی جانے والی سزائے موت اس کا کوئی علم کسی ذریعے سے نہ ہوا تھا۔ راہ میں ایک منزل زبالہ آتی ہے یہاں سے کوفہ بہت دور نہیں رہتا۔ اس منزل پر آپ کو وہ قاصد[2] ملا جسے محمد بن اشعث نے مسلم بن عقیل کی وصیت کے مطابق ان کا یہ پیغام دے کر بھیجا تھا:

---

[1] طبری ج ۶ صفحہ ۲۱۸ [2] طبری ج ۶ صفحہ ۲۱۹۔

"میں یہاں گرفتار کیا جا چکا ہوں۔ آپ شاید یہ بھی نہ جانیں کہ میرا قتل ہو جائے۔ بس آپ جہاں بھی یہ پیغام پائیں واپس جائیں۔ کوفہ والوں کا بھروسہ نہ کریں۔ ان لوگوں نے آپ سے بھی جھوٹ بولا تھا اور مجھ سے بھی جھوٹ ہی بولا۔ اور یہ تو آپ کے والد کے وہ ساتھی ہیں کہ جن کی وجہ سے وہ موت یا قتل کی تمنا کرنے لگے تھے۔"[1]

ایک روایت کے مطابق آپ نے دوران سفر میں مقام حاجر سے اپنے رضاعی بھائی عبداللہ بن یقطرؓ کے ہاتھ اور بسبب مختلف روایت ایک دوسرے شخص کے ہاتھ اہل کوفہ کے نام اپنی آمد کی اطلاع بھی روانہ کی تھی۔ اسی منزل زبالہ پر ان کے بارے میں بھی خبر ملی کہ وہ کوفے سے پہلے قادسیہ کے مقام پر گرفتار کر لیے گئے اور پھر مقتول ہوئے۔[2]

ساتھیوں کو آگاہی

کہا گیا ہے اور یہ اغلب ترین قیاس ہے کہ زبالہ کی منزل پہ پہنچ کر صورت حال کو بدلنے والی یہ اطلاعات حضرت حسینؓ کو موصول ہوئیں تو آپ نے ضروری سمجھا کہ ساتھیوں کو آگاہ کریں اور اجازت دیں کہ اس نئی صورت حال میں جو شخص قافلے سے علاحدہ ہونا چاہے وہ علاحدہ ہو جائے۔ یہ بات روایات کے مطابق آپ نے خاص طور پر ان ساتھیوں کے پیش نظر کہی تھی جو راستے کی منزلوں پر آپ کے بارے میں یہ سمجھ کر ساتھ ہو گئے تھے کہ کوفہ آپ کے تابع ہے اور آپ وہاں حکومت کرنے جا رہے ہیں۔ اور یہ زیادہ تر بدوی لوگ تھے جو غنیمت کی امید میں ساتھ لگ گئے تھے۔ چنانچہ یہ سب ہی لوگ یہ خبر سن کر منتشر ہو گئے اور آپ کے ساتھ شریک سفر صرف وہی لوگ رہے جو مکے سے ساتھ تھے۔[3]

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۱۱ [2] ایضاً ص ۲۲۶ [3] ایضاً

واپسی کا مشورہ

طبری نے اسی صفحہ (۲۲۹) پر اگلی روایت دی ہے کہ زبالہ کے بعد دوسری منزل بطن عقبہ پر قیام ہوا تو وہاں ایک شخص نے آپ سے ملاقات ہونے کے بعد باصرار مشورہ دیا کہ برائے خدا آگے نہ جائیے۔ ان حالات میں آگے جانا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ آپ نے اس رائے سے اتفاق کیا مگر فرمایا کہ "اللہ کے ارادوں پر کوئی غالب نہیں ہو سکتا" اور سفر جاری رکھا۔

ایک صفحہ قبل یعنی (۲۲۵ پر) طبری نے ایک اور روایت بھی ایسے ہی مشورے کی نقل کی ہے۔ یہ مشورہ ان دو اسدیوں نے دیا تھا جن کا ذکر ہم فرزدق کی ملاقات والی روایت کے ضمن میں کر چکے ہیں کہ حج کے بعد سے حضرت حسین کے تعاقب میں پیچھے لگ گئے تھے۔ ان کی روایت ہے کہ زرود کے مقام پر کوفہ سے آنے والے ایک شخص سے ہم کو مسلم اور ہانی کے مارے جانے کی خبر ملی جو ہم نے ثعلبیہ[1] کی منزل پر حضرت حسین کی خدمت میں راز داری کے ساتھ پہنچائی اور پھر خدا کا واسطہ دے کر عرض کیا کہ "خدارا آپ آگے نہ جائیے۔ اب کوئی گنجائش نہیں ہے"۔ کہتے ہیں کہ سنتے ہی بنو عقیل چلا اٹھے کہ "ہرگز نہیں واللہ ہم اس کے بغیر نہیں رہ سکتے کہ یا تو اپنے بھائی مسلم کا انتقام لیں یا ایسا ہم بھی انہی والے انجام سے دوچار ہو جائیں"۔ کوفی راوی کہتے ہیں کہ اس پر آپ نے ہماری طرف دیکھا اور فرمایا کہ "ان (لوگوں) کے بعد بھلا زندگی میں کیا مزہ؟" یعنی آپ نے سفر جاری رکھنے کا فیصلہ فرما دیا۔ صفحہ ۲۲۹ والی روایت میں جو الفاظ بطن عقبہ کی منزل کے کہے گئے ہیں کہ "تم ٹھیک کہتے ہو مگر اللہ کے ارادوں پر کون غالب آ سکتا ہے"! ان الفاظ کو دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ غالباً دوسری روایت صحیح ہے جو [illegible] کے مطابق آپ دو منزل پہلے ثعلبیہ کے مقام پر یہ فیصلہ کر لینا چاہتے تھے کہ آگے بڑھا جائے [illegible]

---

[1] ثعلبیہ: اس دور کی مشہور منزل [illegible] ہے کہ کوفہ کی طرف سے [illegible] زبالہ سے ایک منزل پہلے پڑتی ہے۔

کا نشانہ بنیں کیونکہ اس کو مناسب سمجھا۔ اور ان کے احوال کو آپ نے سمجھا کہ یہ تقدیر الٰہی ہے۔

حضرت محمد الباقر کی روایت

طبری نے روزِ سوار اور واقعۂ شہادت کے سلسلے میں دوسری بہت سی روایتوں کے ساتھ ایک مسلسل روایت ٹکڑوں میں بانٹ کر حضرت حسین کے پوتے حضرت محمد الباقر کی بھی درج کی ہے۔ اس روایت کے پہلے ٹکڑے کا ایک اقتباس ہم پیچھے دے چکے ہیں (باب ۸) اس کے دوسرے ٹکڑے میں آتا ہے۔

فاقبل حسين بن علي بكتاب	حسین بن علی مسلم بن عقیل کا خط پانے
مسلم بن عقيل كان اليه حتى	کے بعد کوفے کی طرف متوجہ ہو گئے حتیٰ کہ
اذا كان بينه وبين القادسية	جب آپ وہاں پہنچے کہ قادسیہ[1] کے اور
ثلاثة اميال لقيه الحر بن يزيد	آپ کے درمیان صرف تین میل کا فاصلہ
التميمي فقال له اين تريد	تھا تو وہاں حُر بن یزید تمیمی سے ملاقات
قال اريد هذا المصر فقال	ہوئی۔ حُر نے دریافت کیا آپ کہاں
له ارجع فاني لم ادع لك	کا ارادہ ہے؟ فرمایا اسی شہر کا۔ حُر
خلفي خيرا ارجوه فهم ان	نے عرض کی آپ واپس چلیے
يرجع وكان معه اخوة مسلم	کہ میں وہیں سے آ رہا ہوں جہاں
بن عقيل فقالوا والله لا نرجع	کے لیے کوئی اچھی صورت حال چھوڑ کر
حتى نصيب بثارنا	نہیں آ رہا ہوں۔ اس پر آپ نے واپسی
او نقتل فقال لا خير في	کا ارادہ فرمایا۔ لیکن مسلم بن عقیل کے

---

[1] قادسیہ اسلامی تاریخ کی فتوحات کا نہایت مشہور نام ہے۔ کوفے سے تقریباً ۴۵ – ۵۰ میل بجانب جنوب مغرب اس کا محل وقوع رہا ہے۔ اس میں سے گزر کر حجاز کو جانے کا سیدھا راستہ نکلتا تھا۔

حیاتنا بعدکم فسار۔ [1]

بھائی آپ کے قاصد مسلم کے بیٹے بولے
کہ خدا کی قسم ہم تو بدلہ لیں یا اپنی
جان دے دیں نہیں واپس لوٹیں گے تب
آپ نے فرمایا کہ تمہارے بعد میرے
لئے زندگی میں کیا مزہ ہے؟ اور یہ کہہ کر
آپ آگے کو چل دیئے۔

حضرت محمد باقر کی اس روایت کے بعد جو اگر سنداً صحیح روایت ہے اور یقیناً یوں ہی ہے آپ نے والد ماجد حضرت علی بن الحسین (زین العابدین) سے سنی ہوگی جو اس سفر میں اپنے والد ماجد حضرت حسین کے ساتھ تھے [2]۔ یہ بات بالکل یقینی ہو جاتی ہے کہ حضرت حسین نے حالات کے مکمل انقلاب کا علم و یقین حاصل ہو جانے کے بعد واپسی کا ارادہ فرمایا تھا۔ اگرچہ وہ برادران مسلم کی وجہ سے عمل میں نہ آسکا۔

سمت سفر کی تبدیلی اور نزول کربلا

جیسا کہ اوپر کی روایت میں آیا آپ نے برادران مسلم کی بات سن کر واپسی کا ارادہ ترک کیا اور آگے کو چل دیئے مگر یہی روایت بتاتی ہے کہ آگے کو بڑھتے ہی ابن زیاد کا لشکر سوار دستہ سامنے آگیا جو قادسیہ میں متعین تھا۔ اسے دیکھ کر آپ نے اپنا رخ قادسیہ اور کوفے سے ہٹا کر کربلا کی طرف کر دیا۔ [3]

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۲۰ [2] خود امام باقر بھی اس وقت دو ڈھائی سال کی عمر کے تھے یعنی کمسنی کربلا میں ساتھ ہی تھے۔ [3] کربلا قادسیہ سے بجانب شمال اور کوفے سے بجانب شمال مغرب ۴ - ۱۰ کلومیٹر آگے ہے اور حضرت حسین جنوب مغرب سے کوفہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

فسار تلقاءه وتلقته خيل عبيد الله
فلما رأى ذلك عدل
إلى كربلاء فاسند ظهره
إلى قصباء وخلا كيلا يقاتل
إلا من وجه واحد فنزل
وضرب أبنيته وكان
أصحابه خمسة وأربعين
فارسا ومائة راجل؎

وہیں سے آپ آگے کو چل دیئے، مگر پیچھے
ہی آپ کو عبید اللہ بن زیاد کا مقدمۃ
الجیش نظر آیا۔ اسے دیکھ کر آپ
کربلا کی طرف رخ موڑ دیا اور ایک
بانس اور نرکل کے جنگل کو اپنی پشت
پر لیا اور مضبوطی سے جم گئے تاکہ دشمن
سوائے ایک طرف کے کہیں سے
حملہ نہ کر سکے۔ یہاں نزول فرما کر آپ
نے اپنے خیمے گڑوا لیے اور آپ کے
ساتھی پینتالیس سوار اور سو
پیادے تھے۔

* * *

؎ طبری ج ۲ صـ ۲۲

باب دہم[1]

کربلا کی سرگذشت

عمرو بن سعد کی آمد

حضرت محمد باقرؑ کی جس روایت کے الفاظ پر گزشتہ باب ختم ہوا ہے اسی روایت میں آگے بیان ہوا ہے کہ عمر بن سعد بن ابی وقاص رضی کو ابن زیاد نے رے کا حاکم بنا کر بھیج رہا تھا۔ حضرت حسینؓ کا معاملہ سامنے آ جانے پر ابن سعد کو یہ حکم ہوا کہ پہلے تم اس معاملے سے نپٹتے جاؤ۔ عربی کے الفاظ ہیں اکفنی ھذا الرجل، عمر نے اس خدمت سے معافی چاہی، مگر مجبور ہونا پڑا اور حضرت حسینؓ کے نزول کربلا کی اطلاع پا کر کربلا کا رخ کیا۔

صلح کی بات اور ناکامی

فلما اتاہ قال لہ الحسین	پھر جب ابن سعد وہاں پہنچ گئے تو
اختر واحدۃ اما ان تدعونی	حضرت حسینؓ نے ان سے کہا کہ تین باتوں
فانصرف من حیث جئت	میں سے ایک قبول کر لو، یا تو مجھے جہاں
و اما ان تدعونی فاذھب	سے آیا ہوں ادھر واپس ہو جانے دو
الی یزید و اما ان تدعونی	یا یزید کے پاس چلا جانے دو یا

---

[1] [illegible] کا ایک اہم [illegible] سے [illegible] کے نسخے پر ایک [illegible] ہے۔

فالحق بالثغور[1]	پھر تو مسلمانوں کی سرحد (ثغور) میں سے کسی جانب کو ہی نکل جاؤں۔

عمرو نے آپ کی اس پیش کش کو قبول کر کے ابن زیاد کو اطلاع بھیجی۔ مگر وہاں سے جواب آیا کہ ایسا نہیں بلکہ "انہیں پہلے میرے ہاتھ میں ہاتھ رکھنا ہوگا" لا ولا کرامة حتی یضع یدہ فی یدی۔

فقال له الحسین لا واللہ لا یکون هذا ابداً[2]	اس پر حسین نے کہا کہ نہیں بخدا کبھی نہیں ہوگا۔

ایک دوسری روایت سے تائید

حضرت محمد الباقر کی روایت کے بعد طبری نے انہی کی روایت کی طرح کی ایک جامع روایت جس میں اول سے آخر تک کا قصہ اختصار سے بیان کیا گیا ہے، اور مکمل بھی ہے اس کے راوی حصین بن عبد الرحمن ہیں[3] اس سے بھی واقعہ کی صورت تقریباً یہی معلوم ہوتی ہے جو مندرجہ بالا روایت سے سامنے آئی۔ اس میں ہے کہ "حضرت حسین اپنی منزل کی طرف وہاں کے حالات سے بالکل بے خبر گامزن تھے۔

حتی لقیه الاعراب فسألهم فقالوا واللہ ما ندری غیر انا لا نستطیع ان نلج ولا نخرج	یہاں تک کہ بعض عرب ملے اور آپ نے ان سے حالات کی بابت سوال کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ صرف یہی

---

[1] طبری ج ۶ صفحہ ۲۲۰۔ [2] ایضاً۔ [3] حضرت مولانا عبد الشکور فاروقی صاحب لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ جو شیعی لٹریچر پر وسعت اور ماہرانہ حیثیت رکھتے ہیں، ان کی تحقیق کے مطابق واقعہ کربلا کی تمام روایتوں میں حضرت حضرت محمد الباقر کی اور حصین بن عبد الرحمن کی یہ دو روایتیں ہی سند کے اعتبار سے صحیح اور بے عیب ہیں۔

فعدل يسير نحو طريق الشام
الى يزيد فلقيته الخيول بكربلاء
فنزل يناشدهم الله
والاسلام قال وكان بعث
اليه عمر بن سعد وشمر[۱]
ذي الجوشن وحصين بن
نمير فناشدهم الحسين
الله والاسلام ان يسيّروه
الى امير المؤمنين فيضع
يده في يده فقالوا لا الا
على حكم ابن زياد[۲]

ادھر کی تو خبر نہیں البتہ اتنا جانتے
ہیں کہ ہم اِدھر سے اُدھر جا سکتے ہیں
اور نہ اُدھر سے اِدھر آ سکتے ہیں۔ غرض
پھر آپ نے شام کے راستے کی طرف یعنی
یزید کی طرف کو چلنا شروع کیا اور ابھی
راستہ میں مقام کربلا میں آپ کو گھوڑ سوار
دشمنوں کا سامنا ہوا پس آپ اتر پڑے
اور انہیں اللہ اور اسلام کا واسطہ دے کر
سمجھانے لگے۔ راوی کا بیان ہے
ابن زیاد نے عمر بن سعد شمر بن ذی
الجوشن اور حصین بن نمیر کو بھیجا
تھا۔ سو آپ نے انکو اللہ اور اسلام کا واسطہ
دیکر کہا کہ مجھکو امیر المومنین یزید کے پاس
چلنے دو تاکہ آپ اپنا ہاتھ انکے ہاتھ
میں دیدیں گے۔ مگر ان لوگوں نے کہا کہ
نہیں پہلے آپ کو ابن زیاد کا حکم ماننا ہوگا
(یعنی ان کے پاس جانا ہوگا)

---

[۱] یہ الفاظ واضح ہیں کہ یہ بات چیت مقام عذیب کے قریب ہی کہیں ہو رہی ہے جو کوفے کا ناکہ تھا اور جہاں روک تھام کے انتظامات تھے۔

[۲] طبری ج ۶ ص ۲۲۳ اس روایت میں تین صورتوں کے بجائے صرف یزید کے پاس جانے والی صورت کا ذکر ہے جس کی وضاحت یہ ہو کہ تینوں صورتوں میں سب سے زیادہ اہم اور قابل ذکر یہی تھی۔ واللہ اعلم۔

اس روایت میں اس بات کا ذکر نہیں ہے جو اوپر والی روایت میں تھا کہ عمر بن سعد نے جو حضرت حسینؓ کی پیش کش پر یعنی مصالحتی فارمولا قبول کر لیا تھا مگر ابن زیاد نے اُسے رد کر کے واحد صورت یہ تجویز کی کہ وہ کوفے آکر پہلے اس کے ہاتھ میں ہاتھ دیں پھر ان کے مستقبل کا فیصلہ ہو گا۔ گو یہاں اس بات کا ذکر نہ ہوا کہ عمر بن سعد نے تو قبول کیا تھا مگر ابن زیاد نے رد کر دیا صرف بر بنائے اختصار ہی سمجھا جانا چاہیے ورنہ ایسی کوئی ایک روایت بھی نہیں ہے جس کی بنا پر یہ خیال کرنے کی گنجائش ہو کہ عمر بن سعد کو لڑائی ٹالنے سے نہیں بلکہ بھڑکانے سے دلچسپی تھی۔ ابن سعد سے متعلق تمام روایتیں اس کی شہادت دیتی ہیں کہ وہ ہر ممکن طریقے پر خواہش مند تھا کہ اس کے نامۂ اعمال میں قتل حسینؓ نہ لکھا جائے۔ اگرچہ اس معاملے میں حکومت کو ناراض کرنے کی حد تک جانے کو تیار نہ تھا۔

جنگ اور شہادت

حضرت محمد الباقر کی روایت میں اوپر گزر چکا ہے کہ ابن زیاد کی طرف سے یہ شرط آئی کہ پہلے حسینؓ اُس کے قیدی بن کر کوفے آئیں بعد میں ان کی مرضی پیش کش پر غور کیا جائے گا۔ حضرت حسینؓ کو یہ منظور نہیں ہوئی اور فرمایا "لا واللہ لا یکون ھذا ابدا" اس کے بعد بیان ہوا ہے

وان الذی قتل اصحاب الحسین	جن لوگوں نے آپ سے جنگ کی اور آپ
کلھم وبعضھم مسمون ثابتۃ	کے ساتھی جنگ میں ان سب کے نام
من اھل بیتہ وجلہ سھم	محفوظ ہیں شہید ہونے والوں میں
واصاب ابنا لہ معہ فی حجرہ	۱۸ - ۲۰ کے درمیان جوان آپ کے
فجعل یمسح الدم عنہ	اہل بیت میں سے تھے۔ ایک تیر کے

ويقول اللهم احكم بيننا وبين
قوم دعونا لينصرونا فقتلونا
ثم امر بحبرة فشققها
ثم لبسها وخرج بسيفه
فقاتل حتى قُتل. صلوات
الله عليه[1]

آگے اس صاحبزادے کو لگا جو آپ کی گود
میں تھے آپ صاحبزادے کا خون پونچھتے
جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے کہ اے
اللہ تو ہی انصاف کیجئو ہمارے اور ان
لوگوں کے درمیان جنہوں نے ہماری
مدد کے واسطے ہمیں بلایا اور پھر
قتل کیا پھر آپ نے ایک چادر طلب کر کے
اسے پھاڑا اور اپنے اوپر لپیٹ پھر تلوار
لیکر نکلے اور قتال کیا حتی کہ شہید ہوئے
صلوات اللہ علیہ۔

حصین بن عبدالرحمٰن کی روایت میں اس موقع پر ذرا سی اور تفصیل ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ ابن زیاد نے جو لشکر حسینی قافلہ کی گرفتاری کے لیے بھیجا تھا اس میں ایک صاحب حُر بن یزید حنظلی بھی تھے جو ایک سوار دستے کے سالار تھے۔ انھوں نے جب یہ صورت حال دیکھی کہ حضرت حسینؓ کی بات سنی نہیں جا رہی ہے تو معاملہ میں مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ یہ کیا غضب ہے!

والله لو سألكم هذا الترك
والديلم ما حلّ لكم ان
تردّوه[2]

یہ بات تو اگر تم سے ترک اور دیلم کے
کافر بھی مانگتے تو ان کا سوال بھی رد
کرنا تمہیں روا نہ تھا۔

مگر ابن زیاد کے ان متعصب افراد (عمر، شمر، حصین) نے اپنی بات پر اصرار جاری رکھا جس پر

---

[1] طبری ج ۵ ص [illegible] [2] ایضاً ص [illegible]۔ [3] بعض دوسری روایات میں یہ بات اس طرح بیان ہوئی ہے کہ حُر نے یہ بات عاشورہ کی صبح لڑائی کے وقت ابن سعد لعین سے کہی تھی [illegible])

حُر نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور حضرت حسین کی صفوں میں پہنچ گیا اور وہاں سے پلٹ کر ابن زیاد کے لشکر پر حملہ آور ہوا۔

فصرف الحرّ راس فرسه	پھر حُر نے اپنے گھوڑے کا رخ پھیرا
وانطلق الى الحسين واصحابه	اور حسین اور ان کے ساتھیوں کی طرف چلا
فظنّوا انه انّما جاء ليقاتلهم	ان لوگوں نے گمان کیا کہ یہ شخص ان سے
فلمّا دنا منهم قلب ترسه	لڑنے آیا ہے مگر قریب پہنچ کر حُر
وسلّم عليهم ثم كرّ على اصحاب	نے اپنی ڈھال کو الٹ دیا (جو دوستی
ابن زياد فقاتلهم فقتل منهم	کہ دشمنی نہ ہونے کی علامت تھی) اور
رجلين ثم قُتل رحمة الله	سلام کیا اس کے بعد وہ اصحاب ابن
عليه	زیاد پر پلٹا اور حملہ کر کے دو آدمی مارے
	اور پھر خود بھی جان دے دی۔

حُصین بن عبدالرحمٰن کی روایت کے اس زائد حصے سے یہ سمجھنا ممکن ہوتا ہے کہ کربلا کی جنگ کا آغاز شاید حُر بن یزید کی طرف سے ہوا مگر کسی دوسری روایت سے اس کی تائید نہیں ہوتی بلکہ اس سے مختلف شکل سامنے آتی ہے جبکہ اس روایت کا بیان اتنا تشنہ ہے کہ محض اس کی بنیاد پر اس واقعہ کو جنگ کا آغاز قرار دینا مشکل ہے۔

حُر بن یزید دوسری روایات میں

حُر بن یزید کا تذکرہ واقعہ کربلا کی دوسری روایات میں بہت زیادہ تفصیل کے ساتھ پایا جاتا ہے اور ماتم حسین کی مجلسوں میں انصار حسینؑ کے جب نام آتے ہیں تو وہاں یہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) امیر عسکر کو طلب کر کے یہ بات کہی گئی تھی" اور ابن سعد ہی سے حضرت جواب چاہتا تھا جو حق تھا کہ میں تو وہی چاہتا تھا مگر میرا اختیار نہیں ہے۔ ملاحظہ طبری ج ۶ صفحہ ۲۲۳۔

ایک بہت معمولی سا نام ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں پہلی تفصیلی روایت یہ ہے کہ عمر بن سعد کے فوجی دستوں سے پہلے ایک گھڑ سوار دستے نے حضرت حسینؓ کا راستہ روکا تھا یہ دستہ حُر بن یزید کی قیادت میں تھا۔ اس روایت کے مطابق اس دستے سے قافلۂ حسینؓ کا سامنا کربلا سے کچھ دور پہلے ذو حُسُم پہاڑ کے دامن میں ہوا۔ یہ دستہ اس اطلاع پر کہ حضرت حسینؓ نے اپنا رُخ کوفے سے موڑ کر اس راہ پر کر دیا ہے جو شام اور دمشق کو جاتی ہے اس مقصد سے تعاقب میں دوڑایا گیا تھا کہ ان لوگوں کو حراست میں کر لے۔ حضرت حسینؓ نے اس بات سے انکار کر کے کوفہ کی واپسی کا ارادہ کیا تو حرؓ اس میں حائل ہوا لیکن دل سے وہ کسی سختی بلکہ کسی بڑی سختی پر آمادہ نہ ہو پایا اور بیچ کی راہ یہ نکالی کہ آپ نہ کوفہ جائیں نہ ہی مکے کو بلکہ ایک تیسرا راستہ ہے جس پر ہم دونوں ملے چلتے ہیں حتی کہ میں ابن زیاد کو خط بھیج کر موجودہ صورت حال میں اس کا نیا حکم حاصل کر لوں۔ روایت کہتی ہے کہ یہ حکم آیا کہ جہاں ہو وہیں قافلہ کو روک لو اور انتظار کرو۔ چنانچہ حرؓ نے جو ابن زیاد کا حکم آپ کو پہنچایا اور مزید کسی روایت سے معلوم ہوتا ہے تو اگرچہ آپ کے کچھ ساتھیوں کی رائے تھی کہ اس حکم کے مطابق اسی جگہ پر جنگ کا چیلنج قبول کیا جائے۔ بلکہ چاہتے تھے کہ کسی مناسب اور اپنی پسند کی جگہ تک پہنچنے کی کوشش کی جائے اگرچہ اس میں حرؓ کے دستے سے جنگ ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ مگر حضرت حسینؓ نے کسی طرح کی جنگ آزمائی کا سبب نہ بنایا اور حرؓ نے جہاں کہا وہاں آپ ٹھہر گئے ـــ اور یہ کربلا کا میدان تھا۔[لہ]

[لہ] طبری ج ۶ ص ۲۳۲۔ کربلا کے متعلق روایتیں بھی بہت مختلف ہیں جس کی جو تحریر کی ہے اب جگہ نینوا تھا مگر صحیح یہ ہے کہ اس کو معمولی بستی کے طور پر بالکل ترک نہ کیا جائے۔ یہ محل تھا اس کی توجیہ کرتے ہیں۔ بعض روایتوں میں اس کا تمام نزدیک کا نام بھی آتا ہے۔ معجم البلدان کے مطابق نینویٰ ایک دیہاتی علاقہ ہے جس میں کربلا نام قریہ واقع تھا یہ وہ نینوا نہیں ہے جو شہر موصل کے پاس مشہور شہر اور ایک پرانی تہذیب کا مرکز ہے ـــ ج ۷ صفحہ ۲۱۵

آپ کے اس خطاب سے نزولِ کربلا کی تاریخ ۲ محرم یوم پنجشنبہ سنہ ۶۱ھ واضح ہوتی ہے۔ مورخ طبری نے چونکہ حرؓ سے متعلق یہ روایت "سنہ ۶۱ھ کے واقعات" کا عنوان قائم کر کے دی ہے، اس لیے سمجھنا چاہیے کہ حرؓ کے دستے سے آپ کے قافلے کا سامنا یکم محرم ۶۱ھ کو ہوا، یعنی اس سے پہلے نہیں۔ اس کے بعد روایت کا سلسلۂ بیان کہتا ہے کہ اگلے دن یعنی ۳ محرم یوم جمعہ کو عمر بن سعد کی سرکردگی میں چار ہزار نفوس پر مشتمل مزید فوجی دستے پہنچ گئے۔

دونوں روایتوں میں تطبیق

حصین بن عبدالرحمن کی روایت اور دوسری روایتوں میں جو فرق پیدا ہوتا ہے اُسے ہم اجمال اور تفصیل کا فرق کہہ سکتے ہیں۔ بایں معنی کہ حرؓ بن یزید کا یہ اقدام اسی تفصیل کے مطابق ہوا جو دوسری روایتوں میں بیان ہوئی لیکن حصین بن عبدالرحمن کی روایت میں اس کا اختصار کر کے بس حرؓ کی موجودگی میدانِ کربلا میں دکھائی گئی ہے۔

حرؓ کے کردار کی کچھ اور تفصیلات

لیکن اس موجودگی کے بعد حرؓ کے جس خاص کردار کا بیان حصین کی روایت میں ہوا ہے کہ وہ اپنے دستے کی قیادت چھوڑ کر حضرت حسینؓ کی صفوں میں جا ملے اور پھر اُدھر سے پلٹ کے عمر بن سعد کے لشکر پر حملہ آور ہوئے، اس کردار کی جو تفصیل بشکلِ طبری کی دوسری روایتوں میں بیان ہوئی ہے وہ ایسی نہیں ہے کہ جسے تفصیل اور اجمال کا فرق کہہ کر قبول کر لیا جائے بلکہ یہ دراصل میدانِ کربلا کے واقعات کی ایسی تفصیل کا حصہ ہے جس کا وجود بظاہر عالمِ واقعہ میں نہیں ہے بلکہ وہ مصنفینِ مقاتل یا ان کے راویوں کی قوتِ تخیل کا کرشمہ ہیں۔

اس نوعیت کی تفصیل ان روایتوں کے مطابق جن کا سلسلہ طبری میں صفحہ ۳۲۲ سے

تقریباً ۲۹۸ تک یہی تمثیل بیتیس صفحات میں پھیلا ہوا ہے۔ حُر کے ابوالمہاجر مشورہ میں حسین اس وقت جبکہ دونوں طرف سے جنگ شروع ہو چکی تھی، بے سروسامان لشکر کی آنکھوں کے سامنے بڑی بہادری سے ایک حکمت عملی سے کام لیکر اپنی سمت کو بدل کر لشکرِ حسینی میں جا پہنچے[1] تو نقصان کی تلافی کی کہ میرا ہی قصور ہے جو آپ کو یہ صورت حال درپیش ہے۔ ورنہ میں اگر آپ کا راستہ نہ روکتا تو آپ سلامتی کے ساتھ واپس ہو چکے ہوتے۔ اس کے بعد انہوں نے معافی اور توبہ کی قبولیت کا اطمینان حضرت حسینؑ کی زبان سے حاصل کیا۔ پھر پلٹ کر لشکر ابن زیاد کی طرف گئے اور ایک تقریر ان کو مخاطب کر کے کی۔

> اے کوفہ والو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ حسینؑ کی تجویز کردہ باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی تم قبول نہیں کرتے۔" لوگوں نے کہا کہ "ہمارے امیر عمر بن سعد سے بات کرو۔" پس انہوں نے عمر کو مخاطب کر کے یہی بات کہی۔ عمر نے جواب دیا کہ "مجھے تو خود بڑی خواہش تھی اگر میرے بس کی بات ہوتی۔" اس پر حُر پھر عام لوگوں سے مخاطب ہو گئے کہ "اے کوفہ والو! خدا تمہیں غارت کرے۔ تم نے ان کو بلایا اور پھر ان کو دشمن کے حوالے کر دیا۔ تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم اپنی جانیں ان پر قربان کر دو گے۔ اور اب تم اٹھ کر ان کو قتل کرنے کے درپے ہو۔ تم نے انہیں گھیر لیا ہے اور گلا گھونٹ کے دبانا چاہتے ہو۔ اللہ کی لمبی چوڑی زمین میں سے کسی طرف کو چلے جانے کا موقع نہیں دیتے ہو کہ وہ اور ان کے اہلبیت امن پا جائیں۔ تم نے ان کو ایسا بے بس قیدی بنا لیا ہے کہ اب نفع نقصان کا کچھ بھی اختیار ان کو نہیں رہ گیا۔ تم نے ان کو اور ان کی عورتوں اور ساتھیوں کو فرات کے اس بہتے پانی سے محروم کر رکھا ہے جسے یہودی اور نصرانی بھی پیتے ہیں اور علاقے کے خنزیر اور کتے اس میں لوٹتے ہیں اور یہ ہیں کہ پیاس کے مارے مرے جاتے ہیں۔ کیا ہی برا سلوک ہے جو تم نے ذریت

---

[1] اس حکمت عملی کی تفصیل خاصی طویل ہے۔ طبری جلد ۶ صفحہ ۲۴۳

لشکر کے سپہ سالار کی ہے اور تمھیں بھی اطاعت کی ہے یہاں کے دن پاں کے

حوالے کر دو۔ اگر تم اس وقت کو یہ چھوڑ کر اس سے الگ نہیں کر سکتے تو ہٹ جاؤ[1]

اور سب سے عجیب بات یہ ہے کہ اس بات کا یقین تو درکنار کیا امکان بھی مانا جا سکتا ہے کہ لشکر کا ایک افسر عین میدان جنگ میں کھلی غداری کر کے دشمن کی صفوں کا حصہ بن جائے اور لشکر کا افسر بالا صرف یہ کہ دشمن کی صفوں سے اس کی تقریر سنے اور اپنے فوجیوں کو سننے دینے کے لیے تیار ہو جائے بلکہ اس کے جواب میں ایسے الفاظ بھی کہے کہ:

"تم جانتے ہو کہ میرے بس میں کچھ نہیں۔ ورنہ میں تو خوش ہوتا اس بات کا حامی ہو کر جس سے حسین کی تین باتوں میں سے کوئی ایک بات مان لی جائے"[2]

ظاہر ہے کہ یہ تو عام حالات میں بھی ایک ناقابل تصور بات ہے۔ مگر یہاں تو حالات بھی عام قسم کے نہ تھے۔ اس تاریخ طبری کی روایات کے مطابق صورت حال یہ تھی کہ ابن سعد کو حکم کی کوشش کے باوجود کہ آپ اس مہم پر بھیجا جائے ابن زیاد نے مجبور کر کے بھیجا تھا۔ پھر جب انہیں روایت کے مطابق اس نے حضرت حسین کی طرف سے مصالحت کی تجویز کی اور اس کا کہا سردار اپنی سعد کے ساتھ ابن زیاد کو بھیجا اور اس سے جواب آیا تھا کہ:

"میں نے تم کو اس لیے نہیں بھیجا تھا کہ تم وہاں جا کر اپنی بحث کی راہیں نکالو حسین کو ڈھیل دو اور بچاؤ اور سلامتی کی توقع دلاؤ، اس لیے کہ دوا س جا کر ان کے سفارشی بن بیٹھو۔ دیکھو اگر حسین اور ان کے ساتھی میرا حکم مانتے اور اپنے آپ کو سپرد کر دیتے ہیں تو انہیں یہاں بھیج دو۔ ورنہ ان پر حملہ کرو اور ان کو قتل کرو اور ان کا مثلہ کرو ناک کان کاٹ لو کیونکہ یہ اسی کے قابل ہیں اور حسین کو

---

[1] طبری جلد ۶ صفحہ [illegible] [2] [illegible] کا ترجمہ ان کے ضمیر پر لگا گیا ہے۔ [3] [illegible] کے مطابق [illegible] [illegible] سکتا ہے کہ کوئی ایسی بات ہو۔

حسین قتل ہو جائیں تو ان کا سینہ و پشت گھوڑوں سے روندوا دینا کیونکہ یہ جماعت کے ناقوں، باغی، مرتد اور نہایت خطاکار ہیں۔[1]"

نیز یہ بھی اسی سلسلے کی روایات میں موجود ہے کہ ابن زیاد نے یہ جوابی خط شمر ذی الجوشن کو اس ہدایت کے ساتھ دے کر بھیجا تھا کہ اگر عمر بن سعد میری بھی ہدایت پر عمل نہ کرے تو لشکر کی کمان تم ہاتھ میں لو اور عمر کا سر کاٹ کر ہمارے پاس بھیج دو۔[2]

چنانچہ جیسا کہ حسین بن عبدالرحمٰن کی روایت میں اوپر گزرا اور اس کے سوا بھی طبری کی متعدد روایتوں میں یہ بات بتحقیق ہے کہ عمر بن سعد حضرت حسین کی پیش کش قبول کرنے سے عذر کر کے ان کے سامنے صرف یہی ایک فیصلہ کن بات رکھ کے بیٹھے رہے کہ آپ اپنے کو ابن زیاد کے حکم کے مطابق (جو مرکز یزید کی طرف سے حضرت حسین کے سلسلے میں کلی مختار بنا دیے گئے ہیں) ہمارے حوالے کر دیں۔

کیا کوئی امکان ان حالات میں اس بات کے سوچے جانے کا ہے کہ یہی عمر بن سعد نے اپنے لشکر کے ایک باغی کی صورت تقریر خود سنی اور اپنے لشکر کو اسے سکون و اطمینان سے سننے دی بلکہ نہایت ملامت کے ساتھ علی الاعلان یہ جواب بھی دیا کہ "میں بیکار و مجبور ہوں؟" ہاں یہ بات ہو سکتی تھی کہ یہ مان لیا جائے کہ عمر بن سعد کو گرفتاری یا جنگ کے لیے نہیں بلکہ صلح کی گفت و شنید کے لیے بھیجا گیا تھا مگر ایسی صورت میں یہ فوج کی کمان شمر تک نہ پہنچے گی۔

ایک اور روایت اس حصے کو اور بھی زیادہ ناقابل تصور بنانے والی اس لیے ہے[3] طبری کی اسی جلد صفحہ ۲۳۲ پر ہے کہ عمر بن سعد اپنے ساتھیوں کے ساتھ گرمی دور کرنے کے لیے نہر میں گھسے ہوئے تھے کہ ایک شخص نے آ کر کان میں کہا: امیر ابن زیاد نے جویریہ بن بدر[4]

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۳۶
[2] ایضاً۔

جس کو اس ہدایت کے ساتھ آپ کے پاس بھیجا ہے کہ آپ عمر سے کہیں اگر حسین اور ان کے ساتھیوں سے جنگ نہیں کرتے ہیں تو وہ آپ کی گردن مار دے۔ عمر نے یہ سنا تو کود کر گھوڑے کی طرف آئے سوار ہوئے اور گھوڑے ہی پر بیٹھے بیٹھے ہتھیار منگا کر سجائے اور لشکر لے کر حسینی [illegible] پہنچے اور جنگ کی ٹھانی۔ ذرا غور کیجیے کہ ایک طرف یہ روایتیں اور ایک طرف وہ روایتیں، کیا کوئی بھی صورت دونوں کے بیک وقت درست ہونے کی ہے؟[1]

اور یوم عاشورہ کی باقی کہانی

حیرت مصنفین مقتل حسینؓ یا ان کے راویوں پر نہیں، جنھوں نے واقعہ کربلا کو ایک بھرپور درد ناک داستان کا روپ دینے کی کوشش میں اس کے جزئی واقعات کے سلسلے میں امکان اور عدم امکان سے بحث نہیں کی۔ حیرت اپنے مؤرخین پر ہے کہ باہم متضاد اور ناممکن الوقوع قسم کی حکایتیں قطار در قطار جنھوں نے اپنی کتابوں میں جمع کر لی ہیں۔ جیسے عمر کی تقریر کی یہ روایت ہے ایسے ہی انھیں حالات میں جن کی طرف اوپر بھی اشارے کیے گئے، کتنی ہی روایتیں اور حکایتیں ہیں حضرت حسینؓ اور ان کے ساتھیوں کی کتنی ہی چھوٹی بڑی تقریریں سناتی ہیں۔ تو وہ دو آدمی عمر بن سعد کی گردن مارنے کا حکم لیے ہوئے موجود ہیں۔ اور ایک سوال تک نہیں، جیسے منہ پر مہر لگی ہے۔ مگر ابن سعد ہیں کہ حضرت حسینؓ کے خلاف تلوار اٹھانے میں بدستور دیر لگا رہے ہیں بلکہ اس طرح دیر لگا رہے ہیں کہ اپنے سپاہیوں کو وہ تقریریں سنواتے ہیں جو انھیں بغاوت پر آمادہ

---

[1] اور یہ گفتگو [illegible] کے دوران ہی [illegible] جیسا کہ مشہور ہوا ہے۔ مگر دیکھیے حضرت عبداللہ بن زبیر کی روایات [illegible] کی خبر کتنا [illegible] ایک عام آدمی تھا جو کوفے کی طرف سے آ رہا تھا حضرت حسینؓ کو ملا تھا۔

کرنے کے لیے دشمنوں کی محفل سے کی جا رہی ہیں۔ بلا تشیع اپنے مذہب کے لیے معجزات کا وہی عقیدہ رکھتے ہیں جیسے معصوم انبیاء علیہم السلام کے لیے یعنی وہ اگر ان ناممکنات کے قائل ہیں اور ایک ہی وقت میں متضاد باتوں کے وقوع کو بیان بھی کرتے ہیں تو ٹھیک ہے وہ بطور معجزہ امام الائمہ کے اس بات کا قائل اپنے آپ کو کر سکتے ہوں گے۔ مگر ہم لوگ جو ان حضرات کے لیے تمام تر احترام کے باوجود کوئی معجزہ نہیں مانتے وہ کیسے [illegible] ان متضاد روایتوں کو اپنے طبعزادات یا ہی کتابوں میں جگہ دیتے ہیں؟ ان متضاد روایات کا مجموعہ، پتھروں کے جنگل میں تبدیل ہو گیا، جب پہلے داخل ہو کر راقم الحروف جس حیرت میں مبتلا ہوا تھا آج تک اسی حیرت کا وہی عالم ہے بلکہ اس سے بھی کچھ سوا ہے۔ اب تک یہ بات سمجھ میں نہیں آیا کہ ہمارے مورخین نے کیسے اس جنگل کو اپنی کتابوں میں سمایا ہے؟

حضرت حسینؓ اور رفقاء کی تقریریں

طبری نے روایت بیان کی ہے کہ شمر بن ذی الجوشن، عبید اللہ بن زیاد کا وہ خط عمر بن سعد کے پاس لے کر آیا جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے جس میں کہا گیا تھا کہ حسینؓ سے نمٹنے کے معاملے میں بلا ضرورت وقت مت گنواؤ، تمہیں اس لیے بھیجا گیا ہے کہ انہیں عزت سے یہاں لاؤ، درخواست قبول نہیں کرتے تو قتل کر کے قصہ ختم کر دو ورنہ ہم نے شمر کو ہدایت کی ہے کہ وہ لشکر کا چارج تم سے لے لے۔ ابن سعد نے خط دیکھ کر کہا کہ تجھے [illegible] تم ہی نے خراب کیا ہے۔ ابن زیاد حسینؓ کی [illegible] میں سے کسی ایک کو مان لیتا اور پھر [illegible] نہیں [illegible] انجام دو گا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اُس نے اُسی وقت فوج کو حملے کے لیے بڑھنے کا حکم دے دیا۔ یہ ۹ محرم سنہ ۶۱ھ کی پنجشنبہ کا دن اور عصر کا وقت تھا۔[1] اس کے بعد بیان ہوا ہے کہ ان لوگوں سے یہ کہہ کر مہلت (حضرت حسینؓ کی طرف سے) مانگی گئی کہ ابھی یہ تم یکدم سے چڑھ آئے ہو، پہلے بتایا ہوتا کہ آگے سے ہماری پیش کش نامنظور ہو گئی ہے۔ بات معقول تھی۔ شمر کو بھی اتفاق کرنا پڑا۔ اس قرارداد پر فوج واپس ہو گئی کہ صبح تک آپ لوگ فیصلہ کر لیں، صلح کر لیا تو بہتر ہوگی ورنہ جانے سے وہ مہلت استعمال کر لی گئی[2]

حالات کی جو صورت اوپر بیان کی گئی تھی اس میں ۹ محرم کی شام کو داخل ہونے والے اس نے عصر کا بھی اضافہ کر لیے جس کا کہیں ذکر ہوا کہ حسینؓ ۹ کی شام ہی کو حملہ کرنے کو چلے آیا اور مشکل صبح تک کا وقت دیا جو کہ رات میں فیصلہ کر لیں کہ پھر ان پر جو گی مغلوب ہے یا جراحت۔ اور پھر اس پر فوج کی نماز مغرب کر گیا۔ یہ بات قابل غور طلب ہے کہ ۹ تاریخ کی شام عمر بن سعد شمر بن ذی الجوشن کے ساتھ رسالہ عمر بن کا کے ساتھ ہے ہم روایتوں کے مطابق بھی ہم بعد رفقائے حسینؓ پر حملے کا وقت ہو گئے ہونے جاتے ہیں۔ ایک طرف لیے ہو سکتا ہے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ آپ نے کیا فیصلہ کیا اور نہ کسی حالت سے یہ خبر ملتی ہے کہ گزرات کا فیصلہ تجھے علاوہ ہو گیا ہے۔ بلکہ ایک جو آر تاریخ ۳ ہزار فوج کے — اور شمر بن ذی الجوشن کے علاوہ کہ عمر گرم جیش بعد نو دن تک کے ساتھ آ کر جو بھی خواہ الوداع حسینؓ ساتھیوں کے ساتھ اس طرح کا ڈرا ہو جاتا ہے جیسے کچھ برابر سوار کی بات ہو اور باقاعدہ جنگ ہونی ہی نہیں۔ اور پھر اس صورت حال میں حضرت حسینؓ

---

[1] طبری جلد ۶ ص ۲۳۷ [2] دیکھئے ۲۳۸ ۔ مورخین نے یہ نہیں لکھا کہ صبح کیا ہوگا ہے فریقین میں خیبر پر سچا فقرہ مقابلہ کیا کہ مگر آل سے کہنی ہم بہت بجا بات کی اتنا کرم اور طبری سچا اور یہ صاف ہی انتہا ہے۔

[3] شہید انسانیت از علی نقی صاحب لکھنوی ص ۲۹۷ [4] کربلا کی حکومت اپنے باغیوں کے ساتھ حتی الامکان برابر کے حریفوں والا اسلوب نہیں کر سکی جو جالکہ آتا کرہ و عرب۔

مخاطب کر کے کچھ فرمانے کے لیے اونٹنی پر سوار ہو کر تشریف لائے ہیں۔ اور آپ کو پورا موقع دیا جاتا ہے کہ جو کچھ فرمانا ہو فرمائیں۔ چنانچہ حسب روایت وہ فرماتے ہیں۔

"اے لوگو! میری بات سنو جلدی سے کام نہ لو یہاں تک کہ مجھ پر جو تمہارا حق ہے اس کے مطابق تم کو نصیحت و ہدایت کا فرض ادا کر دوں اور تمہارے سامنے یہ حقیقت حال بیان کر دوں کہ میں تمہاری جانب کیوں آیا۔ اگر تم نے میرے بیان کو صحیح سمجھتے ہوئے تسلیم کر لیا اور میرے ساتھ انصاف سے کام لیا تو یہ تمہاری خوش قسمتی ہوگی۔ اور تمہیں معلوم ہو گا کہ تمہارے لیے میری مخالفت کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی اور اگر تم نے میرے بیان کو قبول نہ کیا اور انصاف سے کام نہ لیا تو اتفاق سے مجتمع کرو اپنی طاقتوں کو اور اکٹھا کر لو جس جس کو چاہو اپنے ہم خیالوں میں سے اور کسی کوشش کو اٹھا نہ رکھو۔ پھر پوری طاقت سے بغیر ایک دم کی بھی مہلت دیے ہوئے میرے ساتھ کر گزرو۔ میرے لیے وہ پروردگار کافی ہے جس نے قرآن کو نازل کیا اور وہی اپنے نیک عمل بندوں کا مددگار ہے۔"

راوی کہتا ہے کہ حضرت حسین کے یہ ارشادات جب خیموں میں ان کی بہنوں اور بیٹیوں نے سنے تو وہ چیخیں چلائیں اور روئیں اور ان کی آواز بلند ہو کر باہر پہنچی تو آپ نے اپنے بھائی عباس اور اپنے بیٹے علی کو بھیجا کہ جاؤ انہیں چپ کراؤ کس قدر یہ لوگ رو رہی ہیں۔ پھر جب وہ چپ ہو گئیں تب آپ نے از سر نو حمد و ثنا سے تقریر شروع کی اور فرمایا۔

"ذرا تم میرے نام و نسب پر غور کرو اور دیکھو تو میں کون ہوں۔ پھر اپنے گریبانوں میں منہ ڈالو اور غور کرو کیا تمہارے لیے میرے خون کا بہانا اور میری ہتک حرمت کرنا جائز ہے؟ کیا میں تمہارے نبی کا نواسہ نہیں ہوں؟ اور ان کے

لہ طبری ج ۶ ص ۲۳۲

وصی اور ان کے چچا زاد بھائی اور ان پر سب سے پہلے ایمان لانے والے اور ان کی
تصدیق کرنے والے کا فرزند نہیں ہوں؟ کیا حمزہ سید الشہداء میرے باپ کے
چچا اور جعفر طیار خود میرے چچا نہیں تھے؟ ایک حدیث جو زبان زد خلائق ہے تمہارے
کانوں تک نہیں پہنچی کہ حضرت رسولِ خدا نے میرے اور میرے بھائی کے بارے
میں فرمایا تھا کہ "یہ دونوں بھائی اہلِ جنت کے سردار ہیں!" اگر تم میری بات
کو سچ سمجھتے ہو اور حقیقۃً وہ یہی ہے (اس لئے کہ میں نے جب سے یہ جانا کہ
خدا جھوٹ بولنے والے سے ناراض ہوتا ہے اور خود اس کا جھوٹ بھی اسے نقصان
دیتا ہے تب سے میں نے کبھی جھوٹ کا ارادہ نہیں کیا) پھر تو کوئی بات نہیں
اور اگر تم میری بات غلط سمجھو تو اس دنیا میں ابھی ایسے اشخاص موجود
ہیں کہ اگر تم پوچھو تو بتلا دیں گے۔ پوچھو جابر بن عبداللہ سے، ابوسعید خدری سے،
سہل بن سعد ساعدی سے، زید بن ارقم سے، انس بن مالک سے، وہ تمہیں
بتلائیں گے کہ انہوں نے رسالت مآب سے اپنے کانوں سے اس حدیث کو
سنا ہے۔ پھر کیا تمہیں میری خونریزی سے روکنے کیلئے یہ کافی نہیں ہے؟[1]

راوی کہتا ہے کہ "اس موقع پر شمر آپ کا قطع کلام کرتے ہوئے بولا کہ "میں خدا کی عبادت
کنارے پر کھڑے ہو کر کرنے والا ہوں (یعنی منافقوں میں سے ہوں) اگر ذرا بھی سمجھتا
ہوں کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔" حبیب بن مظاہر بڑھے اور بجائے حسینؑ کے جواب دیا کہ خدا کی قسم
میں تو دیکھتا ہوں کہ تو اللہ کی عبادت ایک کنارے پر نہیں ستر کناروں پر کھڑے ہو کر کرتا
ہے (یعنی) پورے طور سے منافق ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ تو سچ کہتا ہے کہ تیری
سمجھ میں حضرت کی بات ذرا بھی نہیں آ رہی ہے کیونکہ اللہ نے تیرے دل پر مہر لگا دی ہے۔

اس کے بعد حضرت حسینؑ نے سلسلۂ تقریر دوبارہ جاری کرتے ہوئے فرمایا۔
"اگر تمہیں اس حدیث کی صحت میں بھی کوئی شک ہے تو کیا اس میں بھی شک ہے

---

[1] [illegible] روایت [illegible] ذکر کی ہے [illegible] اختلاف [illegible] روایت ہے۔

کریں تمھارے رسول کا نواسہ ہوں۔ خدا کی قسم مشرق سے مغرب تک کوئی نبی زادہ رسول خدا کا نواسہ میرے سوا موجود نہیں ہے، نہ تم میں اور نہ تمھارے سوا کسی دوسری قوم میں۔ میں صرف ایک تمھارے نبی کا نواسہ ہوں۔ ذرا بتلاؤ تو سہی کہ تم کیوں میرے درپے ہو؟ کیا کسی مقتول کا بدلہ لینا ہے جس کو میں نے قتل کیا ہے؟ یا کسی مال کے سلسلے میں جس کو میں نے تلف کر دیا ہے! یا کسی کو زخم لگایا ہے جس کا قصاص مطلوب ہے؟

راوی کہتا ہے "کوئی جواب کسی طرف سے نہیں ملا" تو آپ نے نام لے لے کر ان میں سے بعض کو مخاطب کیا۔

"اے شبث بن ربعی! اے حجار بن ابجر! اے قیس بن اشعث! اے یزید بن حارث کیا تم نے مجھے نہیں لکھا تھا کہ "باغات میں بہار ہے، کھیتیاں سرسبز ہیں، چشمے ابل رہے ہیں اور مسلح لشکر آپ کی پذیرائی کو چشم براہ ہیں۔ بس قدم رنجہ فرمایئے؟ ان لوگوں نے جواب دیا کہ نہیں، ہم نے تمہیں کوئی خط نہیں لکھا یہ سن کر ارشاد ہوا "اللہ اکبر! اتنا بڑا جھوٹ! قسم ہے خدا کی تم نے لکھا تھا۔"

اس کے بعد آپ نے فرمایا۔

"اے لوگو! اگر تمہیں میرا آنا ناپسند ہے تو مجھے چھوڑ دو کہ روئے زمین پر جہاں کہیں اپنے لیے امن و امان کی جگہ سمجھوں چلا جاؤں۔ اس پر قیس بن اشعث نے کہا آپ اپنے ابن عم کا حکم کیوں نہیں مان لیتے؟ آپ کو کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوگی۔ جو آپ چاہیں گے وہی آپ کے ساتھ ہوگا۔ حضرت نے فرمایا۔ تم اپنے بھائی محمد بن اشعث کے بھائی ہی تو ہو۔ کیا تمہاری خواہش ہے کہ بنو ہاشم تم پر مسلم بن عقیل کے علاوہ کسی دوسرے خون کا بھی دعویٰ[1]

---

[1] مسلم بن عقیل کے واقعہ میں گذر چکا ہے کہ ان کی گرفتاری محمد بن اشعث کے ذریعہ ہوئی تھی۔

کریں۔ نہیں خدا کی قسم میں ذلت کے ساتھ اپنا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں نہیں
دوں گا۔ اور نہ غلاموں جیسے اقرار تمہارے آگے کروں گا۔ اے خدا کے بندو میں تمہارے
سب کے اور اپنے رب کی پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ تم مجھ کو سنگسار
کرو، اور میں پناہ مانگتا ہوں ہر متکبر سے جو یوم حساب پر ایمان نہیں۔"

راوی کہتا ہے کہ "اس کے بعد آپ نے اونٹنی کو بٹھایا اترے اور عقبہ بن سمعان غلام کو حکم دیا کہ اسے باندھ دے اور اب دشمن آپ کی طرف بڑھنے لگا۔"[1]

حضرت حسینؓ کی یہ مبینہ تقریر اس سوال پر غور کرنے کے سبب میں نقل کی گئی ہے کہ جب امیر لشکر عمر بن سعد کو اتنے سخت احکام بھیجے گئے اور طبری کی روایتوں سے قبل بھیجے گئے۔ اور دوسری روایتوں کے مطابق ان تاکیدی احکامات کے ساتھ بھیجے گئے ہوں کہ اگر عمر بن سعد حسینؓ کو ڈھیل دینے والا حوصلہ دکھے کی روش سے عذر کرے تو اس کی گردن کاٹ کر ہمارے پاس بھیج دی جائے اور سالاری اپنے ہاتھ میں لے لیا جائے، کیا اس سب کے باوجود مزید اس کے باوجود کہ ایک شب کی جو آخری مہلت حضرت حسینؓ کو فوری شام کو دی گئی تھی وہ بھی ختم ہو گئی اور ان کی طرف سے سپر تسلیم خم کرنے کے علامات سامنے نہیں آئیں، یہ سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ ۱۰ کی صبح کو عمر بن سعد اپنا لشکر لے کر خیام حسینی پر آ گئے تو بجائے اس کے کہ فوراً گورنر کے احکام کی تعمیل شروع کرے، وہ حضرت حسینؓ کو موقع دیتا ہے کہ اس کے ساتھیوں میں اپنے ایک طویل خطاب کے ذریعہ کوفے اور دمشق کی حکومت کے خلاف جذبات بیدار کرنے کی بھرپور کوشش کریں! حقیقتاً یہ قابل تصور بات بھی نہیں ہے، چہ جائیکہ بطور واقعہ تسلیم کی گئی ہو، ہاں اگر کوئی حضرت حسینؓ کے لیے معجزوں کی قدرت کا قائل ہو تو اس کے لیے شاید یہ بات قابل تصور ہو سکتی ہو۔

---

[1] طبری ج ۶، ص ۲۳۳ حضرت کی تقریر کے آغاز سے یہاں تک اقتباس کے ترجمے میں بیشتر کی مانند ہم نے مولانا علی نقی صاحب کے ترجمے سے فائدہ اٹھایا ہے لیکن کہیں کہیں اختصار بھی کیا گیا ہے۔

معاملہ کا ایک اور پہلو

اس سوال سے قطع نظر جس کی بنیاد تقریر کے ماحول اور موقع پر رکھی گئی ہے اور اسی موقع و محل کے پیش نظر ہم مجبور ہو رہے ہیں کہ اس تقریر کی واقعیت پر کلام کریں، وہاں سے قطع نظر اس تقریر میں دو ایسی شہادتیں بھی اس بات کی صاف نظر آ رہی ہیں کہ یہ واقعہ نہیں بلکہ لوگوں کی تخیلی قوت کا کرشمہ ہے۔ چونکہ عہد جدید کی انجیل مرقس جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تختہ دار پر چڑھا ہوا دکھاتی ہے وہ آپ کی زبان مبارک سے یہ کلمۂ شکایت و جزع و فزع کہلواتی ہے کہ:

الوہی الوہی لما سبقتنی ۔ اے میرے اللہ اے میرے اللہ تو نے
مجھے کیوں چھوڑ دیا ہے ؟

اسلامی ذہن کی رو سے یہ کیسا بڑا داغ ہے جو اللہ کے ایک جلیل القدر پیغمبر کے دامن عصمت پر لگا دیا گیا ہے۔ مگر حضرت حسینؓ کی طرف مذکورہ بالا تقریر منسوب کرنے والوں نے اس سے کہیں زیادہ بڑا داغ نواسۂ رسولؐ کے دامان عز و شرف کو لگایا ہے۔ بلکہ انجیل نے پیغمبر کو بہرحال صرف خدا ہی کے سامنے رلایا اور اسی سے شکوہ کرایا ہے۔ مگر ان لوگوں نے پتہ نہیں یہ کس سطح کے لوگ تھے جو حضرت حسینؓ کو ان غداروں، فریب کاروں اور ابن زیاد کے کاسہ لیسوں کے سامنے بھی رلایا ہے اور ہر رنگ میں جان کی امان مانگتے دکھایا ہے جن کی طرف نظر کرنے کی اجازت بھی غیرت کے تقاضوں سے متصور نہیں ہو سکتی۔ اور یہ تو عام انسانی غیرت کی بات ہے یہاں تو معاملہ جگر گوشۂ رسولؐ کی غیرت کا اور ہاشمی خون کی غیرت کا ہے

وہ مرتبہ شناس اور زمانہ ساز جنہوں نے کل آپ کے نائب حضرت مسلمؓ کو تیغ دیئے اور رسوا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور جو آج چند کوس پر چھوٹے بڑے عہدوں کی خاطر آپ کا خون بہانے کو ... لشکر اعداء میں شامل ہو گئے تھے جس میں شمر جیسے زباں دراز بھی تھے جس نے ابھی ابھی آپ کے خیموں کے گرد آگ کے الاؤ دیکھ کر

پکار اٹھی ۔۔

یہ جسم ہیں سلط النار — وہ جسم جن پہ آگ کی بھی حد کی گئی ہے
فی الدنیا قتل یوم القیامۃ۔ — جسے دنیا ہی میں اس کا بندوبست کر دیا؟

ان بے ادبوں اور مسخ فطرتوں کے سامنے آپ واسطہ دیتے ہیں اپنی نسبی عظمتوں کا! نواسۂ رسول ہونے کا، ابن فاطمہ بنت الرسول ہونے کا! ابن علی مرتضیٰ وصی رسول ہونے کا! حمزہ سید الشہداء سے اپنی قرابت کا اور جعفر طیارؓ سے رشتے کا! کیا واقعی یہ باتیں کسی ایسے آدمی کے لیے قابل تصور ہیں جو سچ مچ حضرت حسینؑ کا کچھ مرتبہ سمجھنے کے قابل ہو؟ اور یوں بھی یہ واسطے دینا تو کسی بھی حالت میں حضرت حسینؑ جیسے مرتبے کے انسان کے لیے موزوں بات نہیں ہو سکتی۔ بہت کم شعور و کم سطح کے لوگ ایسے واسطوں کا استعمال کرتے ہیں۔

آگے آئیے۔ تقریر کے اس حصے پر وہی شعر ایک بار پھر زبان وزن کا مظاہرہ کرتا ہے جو دیر گذر چکا اور جو اس پوری لہجے میں کہتا ہے کہ۔

سمجھ میں کچھ نہیں آیا یہ تم نے کیا سنایا تھا

مگر افسوس کہ یہ خطاب حسینؑ کے مصنف اس کے بعد حضرت والا کی زبان سے کہلواتے ہیں کہ کیا تمہیں میرے اور میرے بھائی کے بارے میں یہ "دونوں جنت کی سردار ہیں" والی حدیث کی صحت کا یقین نہیں؟ تو کیا یہ بھی تمہارے لیے ممکن ہے کہ میرے نواسۂ رسول ہونے میں شک کا اظہار کرو؟ کیا مشرق و مغرب میں ایک میرے سوا کوئی ایسا ہے جسے نواسۂ رسول ہونے کا دعویٰ ہو؟ بلکہ سارے زمین پر میں تنہا ہوں جو اس شرف کے ساتھ مشرف ہوں۔ تو اس کے باوجود تم کیسے میرے خون کے پیاسے ہو؟

اور ابھی بس کہاں؟ وہ شبث بن ربعی، وہ حجار بن ابجر، وہ قیس بن اشعث اور یزید بن حارث جن کے دستخطی خطوط حضرت والا کی تحویل میں موجود تھے جن میں بڑے اشتیاق سے کوفے میں قدم رنجہ فرمانے کی دعوت دی گئی تھی ـــــ یہ

چلتا بنا اپنی بے غیرتی و بزدلی کے ساتھ سب اصحاب تھا؟ انہیں اپنے قبیلوں کی کمانیں سنبھالے کھڑے تھے۔ حضرت حسینؓ کو ان بے غیرتوں سے یہی تو کہنا تھا کہ طلب ہو کر ان کے خطوط یاد دلانے رکھا گیا ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْن ۔ پتہ نہیں یہ کون لوگ تھے جنھوں نے اس طرح عداوتِ آلِ رسول کو ذریعۂ دوستی کا سامان کیا ہے؟

اور یہاں دو نظائر تمیز ہو جو حضرت حسینؓ کے ذکر کے ساتھ ساتھ صبر و ضبط اور عزیمت و بہادری کی صفات تصور میں آتی ہیں۔ وہ حضرت عباسؓ کی ذات ہے میں تم بڑا ہے جو میدان حشر میں تا قیامت رہا تھا کہ سینہ تان کر کسی تلوار کے بغیر کے بجائے علم بنے والا علمدار جب وہاں سے آگے اور بھی سر و قد کا حوصلہ کرنے میں ہو سوں کا حوصلہ بڑھا رہی ہیں۔ اور پھر حضرت علی اکبر کا وہ حسن کردار جس کو دیکھ نہ صاحب و معلمہ کو پانی لانے کے لئے شکستہ قلب عدوزوری ہیں۔ ان صفات کی جگہ پیدا یہ کربلا میں خطاب حسینی کا نقشہ سامنے لانا ہو سکتا تھا کہ کیا بھی تلوار میں نہیں کسی سر کو جھکا نہیں کر کوئی خون میں نہیں کر ان کی عزت نہیں منوانا یک جو حضرت حسینؓ کی زبان سے ابھرتے تھے وہیں نکلا کہ "اگر تم نہیں مانتے تو پھر ایک حملہ کی اجازت دیجئے بغیر پیاس طاقت سے اٹھو اور میرا ساتھ کرو" بس اتنا سنتے ہی سو ساتھ وہ جبرت کے مجسمہ اور ساتھ ہو گئے اور آمادہ یکا یک شدید پیاس اور شکست کو تو نہیں دیکھ یا پڑی۔

حقیقت کا ذکر ہو تا کے نزدیک یہ ہے کہ پوری قوم اور اس کے درمیان تھے گیا یہی یہی تعداد گھرے گئے ہیں کہ حضرت کربلا کے عام پر لیکن اتنی فضا پیدا کرنے میں مطلب کے مطابق یہ ہے کہ روایت سے یہی کا مقصد ہی کوئی نسبت ہی نہیں دے سکتا ہے۔ دیکھئے کہ وہ تاریخ دو بیان ہیں جو نظر آتی ہے جو طبری کی روایت سے متصل پہلے کی روایت طبری[۱] نے نقل کی ہے۔ روایت یہ ہے کہ جب (دس کی) صبح کو دشمن کا لشکر آ پہنچا تو

---

[۱] طبری ج ۶ ص ۲۳۹ جہاں [illegible] کہ [illegible] مقام پر [illegible] ابن ابی [illegible] شمت کا نام [illegible] ہے۔ [۲] طبری ج ۶ ص ۲۴۱-۲۴۲

حسینؓ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور اللہ کی بارگاہ عالی میں یوں عرض کناں ہوئے۔

"اے اللہ تو ہی میرا سہارا ہے ہر تکلیف میں، میرا آسرا امید ہے ہر کلفت میں اور تو ہی پناہ ہے ہر اہم بات میں جو مجھے پیش آتی ہے تو ہی بھروسہ ہے۔ کتنے ہی حالات ایسے ہیں جن کے مقابلے میں دل کمزور پڑ جاتا ہے اور تدبیر کی راہیں بند نظر آتی ہیں، دوست ان میں ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور دشمن طعنہ زنی کرنے لگتے ہیں، میں ان حالات کو تیرے حضور پیش کرتا ہوں تیری بارگاہ میں فریاد کیا کرتا ہوں، اسلیے کہ تجھے چھوڑ کر کسی اور سے لو لگانا میں جانتا نہیں۔ پس تو حالات کی تکلیف اور ان کی ناسازگاری کو دور کرتا اور راہ نکالتا ہے۔ یقیناً تو ہی ہر نعمت کا مالک ہر بھلائی کا سرچشمہ اور ہر امید کا محور ہے۔"

یہ دعا اگر معیار روایت کے اعتبار سے کوئی کمزوری نہیں رکھتی تو اس کی صحت تسلیم کرنے میں ذرا بھی اشکال نہیں کیونکہ پچھلی تقریر کے برعکس اس دعا کا مضمون متوازن ہے اور حضرت حسینؓ سے پوری طرح متوقع اور ان کے شایانِ شان ہے۔

زہیر بن قین کی تقریر

دو تقریریں جو اوپر درج ہوگئیں، ایک حر بن یزید کی اور ایک خود حضرت حسینؓ کی، ان میں سے کسی ایک کے لیے بھی اس ماحول اور صورتِ حال میں جو کربلا کے سلسلے کی تمہید بتائی جا رہی تھیں کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ مگر جیسا کہ عرض کیا گیا یہاں تو ایسی تقریروں کا ایک لمبا سلسلہ ہے۔ گویا ایک جلسہ مقررین کا لگا ہوا ہے۔ بیان کا تقاضا تو طوالت سے بچنے کا ہے مگر ایک تقریر کا اور ذکر کیجیے۔ یہ زہیر بن قین نام کے ایک ساتھی ہیں۔ ان کی بھی کچھ ایسی ہی اہمیت ہے جیسی حر بن یزید کی۔ ایک ایسا شخص اس تقریر کا راوی بتایا گیا ہے جو ابن زیاد کی فوج میں شامل تھا نہ کہ حضرت حسینؓ کے ساتھیوں میں۔ یہ کہتا ہے کہ

حضرت حسینؓ تقریر کے بعد ذرا پیچھے ہٹے تھے کہ آگے بڑھے تو زہیر بن قین نکل کر آئے ۔ گھوڑے پر سوار اور اسلحہ سے لیس تھے۔ انہوں نے انہیں مخاطب کر کے کہا۔

"کوفے والو! خبردار، خدا کے عذاب سے خبردار، ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان بھائی کا حق ہے کہ اس کی خیر خواہی کرے۔ ہم لوگ اس وقت بھائی بھائی ہیں، ایک دین اور ایک ملت پر ہیں جب تک ہمارے درمیان تلوار نہیں چلتی لیکن اگر تلوار چل گئی تو پھر یہ رشتہ منقطع ہو جائے گا اور تم الگ اور ہم الگ امت ہو جائیں گے۔ دیکھو ہمیں تمہیں اللہ نے ذریت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ آزمایا ہے تاکہ دیکھے کہ ہم کیا کرتے ہیں۔ سو ہم تمہیں دعوت دیتے ہیں کہ ان کی مدد کرو اور سرکش عبید اللہ بن زیاد کا ساتھ چھوڑ دو۔ اس لیے کہ تمہیں ان کی حکومت سے سوائے دکھ اور رنج کے اور کچھ نہ ملے گا۔ جو تمہاری آنکھوں میں سلائیاں پھروا دیتے، تمہارے ہاتھ پاؤں قطع کرا دیتے تم کو سولیاں دلوا دیتے اور تمہارے نیک اعمال قراء اور عابد مثلاً حجر بن عدی اور ان کے اصحاب، ہانی بن عروہ وغیرہ کو قتل کراتے رہے۔"

راوی کہتا ہے کہ پھر دوسری طرف والوں نے زہیر کو برا بھلا کہا اور عبید اللہ بن زیاد کی تعریفیں کیں اور کہا کہ ہم تمہیں اور تمہارے صاحب حضرت حسینؓ اور ان کے سب ساتھ والوں کو اس کے بغیر نہیں چھوڑیں گے کہ یا قتل کریں اور یا گرفتار کر کے عبید اللہ بن زیاد کے پاس روانہ کریں۔ اس پر زہیر بن قین پھر وعظ پرداز ہوئے کہ:

"اے اللہ کے بندو! حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد محبت کی اور امداد کے معاملے میں تمہاری محبت اور مدد کی زیادہ مستحق ہے۔ اور اگر تم مدد نہیں کر سکتے تو میں تمہارے لیے اس بات سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ تم ان کو قتل کرو۔ تم اس شخص (حسینؓ) کے اور ان کے چچا زاد یزید بن معاویہ کے درمیان سے

ہمت بندھاؤ۔ قسم میری جان کی۔ یزید کے لیے تمہاری اطاعت کا قتل حسین کی صورت نہیں ہے۔ وہ اس کے بغیر بھی تمہاری اطاعت پر راضی رہے گا۔[1]

ایک خاص نکتہ

اصل صورت حال اور وقوعہ قتل کے اس نکتے کے علاوہ جس کی بنا پر ہمارے لیے بیان مشکل ہو رہا ہے کہ ان واقعات کو تحریر میں بیان کر لانا ہوتی تھیں۔ [illegible] قتل کی تحریک کے بارے میں خاص طور سے یہ نکتہ بھی توجہ طلب ہے کہ اس میں جو کچھ صورت حالات کو نقل کیا ہے اور جو آپ سے بعد فہمائش کے جملے ہیں ان سب کی بنیاد بس یہ ہے کہ حضرت حسین بن علی کے اہل خانہ [illegible] فاطمہ رضی اللہ عنہا اور ذریت محمد صلی اللہ علیہ وسلم یعنی ہم کو ان صاحب کے تعاقب میں کہا گیا ہے کہ یہ اس میں اتفاقی گروہ کے تھے اور اسی لیے اتفاق سے جو کچھ سے واپسی میں حضرت حسین کے [illegible] تو سازل پر واسطے سے پتا چلتا ہے کہ وہ حضرت حسین کے سامنے سے بھی بچنا چاہتے تھے مگر حضرت حسین کے اس سفر کے حالات میں آتا ہے کہ وہ راستے کے تقریباً ہر اہم آدمی ہی کو افسوس ہی کا کرنے سے [illegible] ساتھ لانا چاہتے تھے۔ چنانچہ آپ نے ایک شخص ان کو بلوایا تو ان کی بیوی نے شرم دلا کر کہ بہر حال ابن بنت رسول اللہ ہیں آپ کو ان کی دعوت پر جانا چاہیے ان کو زہیر حسین میں جانے پر مجبور کر دیا اور پھر وہ آپ کی طرف سے آپ کی ہم میں رفاقت کی دعوت بھی [illegible] کر کے وہاں دم سے قتل ہو گئے بہر حال ایک شامی الاصل آدمی۔ کی حضرت [illegible] ابن بنت رسول اللہ کے حوالے

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۲۴۔ [2] [illegible] کی صورت کیا تھی جو ساتھ ہو کر بھی [illegible] کا اہتمام کرنا پڑتا تھا یہ اس [illegible] ایک دو حزل کا فاصلہ بھی قریب سکتے تھے!

سے یزیدی کوفیوں کو لعنت ملامت یا ان سے اپیل کرے یہ کچھ بھی ہو ہمیں سے غالباً ضمنی بے شک یہ بھی ایک نہایت مناسب عنوان اور سوال تھا۔ مگر اسی پر انحصار اور صرف اسی کو لے سے حضرت حسین اور ان کے اہل بیت کی عظمت اور ان کا حق جتانا ابن زیاد کے مقابلے میں ان کے بیچ صرف اسی مواد کو وجہ ترجیح بنانا یہ تو شیعیت کا تراشا ہے اور اسی لیے جس طرح حضرت حسین کی تقریروں میں علاوہ معاملات اور احوال بھی لکھے گئے جس وہ پہلو بھی اس تقریر کو غیر واقعی اور جعلی قرار دینے والے اور اسی کے ساتھ اس جعل سازی کی بنا بھی سامنے لانے والے ہیں۔ اسی طرح زہیر بن قین کی تقریر کا یہ پہلو بھی اس کی غیر واقعیت کو ظاہر کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس جعل کاری اور اس کے پیچھے کام کرنے والے اس نقطۂ نظر کو بھی صاف سامنے لے آتا ہے کہ اس طرح کی تقریریں اگر حضرت حسین کی موجودگی میں عثمانی الاصل لوگوں کی زبان سے ادا کرادی جائیں تو شیعی تصورات اور طرز فکر کو ایک عجیب اسناد اور تائید ملتی ہے۔

سبھی کچھ تصنیف

جس طرح یہ تقریریں بول رہی ہیں کہ میدان کربلا میں ہوئی نہیں بلکہ بعد میں تصنیف کی گئی ہیں اسی طرح — جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا تھا — یوم عاشور کی تقریباً پوری کہانی کا یہی حال نظر آتا ہے۔ مثلاً:—

(۱) مبارزانِ جنگ کے قصے

تقریروں کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے تو مبارزہ طلبی شروع ہو جاتی ہے اور عمر بن سعد کا

---

[1] مجھے اس امکان سے انکار نہیں ہے کہ کوئی نقطۂ نظر [illegible] کا بھی ہو سکتا ہے بلکہ ایک [illegible] سودا [illegible] کر کہا جاتا ہے کہ کوئی اس کے متعلق [illegible] اسی طرح دوسرے قصوں سے پہلے [illegible]

احتیاط کی ساری تنبیہات کے خلاف ان حضرات کو تقریر کر کے اس کے اپنے کیمپ میں بغاوت کی آگ بھڑکانے اور بے چینی اور بے دلی پھیلانے کا پہلے ہی کافی موقع دے چکا تھا۔ تقریروں کے بعد حر بن یزید کے علاحدہ ہونے اور دو آدمی بھی ویسی ہی صف کے اس کے ہاتھوں سے جانے کے باوجود ابن زیاد کے انتہائی سخت احکام کی تعمیل میں مجبور و بیزار ہو کر فتنہ ختم کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ بلکہ حسینیوں سے جو مبارزانہ جنگ کا سلسلہ اب شروع ہوتا ہے باوجود معمولی قلت تعداد کی بنا پر اس صف کے لیے مناسب ترین اور پسندیدہ ترین صورت جنگ ہو سکتی تھی، تو وہ اس میں بھی ان کی معاونت شروع کر دیتا ہے۔ اور شمر اپنی آمد کے بعد سے برابر اپنی موجودگی کا اظہار طرح طرح سے کر رہا ہے۔ ابن سعد کی اس بے عملی کے سامنے وہ دور ابھی بالکل نظر نہیں آتا۔ علاوہ وہ بیچارہ ایسی کیا لے گیا ہے کہ ابن سعد کی سست روی اور بے عملی کا سلسلہ روک دے کیسا ہے یہ سمجھ میں آنے والی کوئی بات کہ وہاں جنگ بے ساختہ ہوئی ہوگی؟

(ب) صبح سے سہ پہر تک کے معرکے

ابن زیاد کے سخت احکام کی علاوہ شمر جیسے حسین دشمن[1] کو تعمیل احکام کے لیے مسلط کیے جانے کی روایتیں جس طرح اس بات کو باور کرنے کی اجازت نہیں دیتیں کہ کربلا میں مبارزانہ جنگ کا سلسلہ جاری ہوگا، یہی روایتیں اور لشکر ابن سعد کی تعداد والی روایتیں ذکر ہے کم ۴۔۵ ہزار نہ شیعہ ماخذ کے مطابق کم سے کم تیس ہزار[2] اس بات کا تصور مشکل بنا دیتی ہیں کہ اس لشکر نے تنہا حسین کو کوئی باقاعدہ جنگ کرنے کا موقع دیا ہوگا۔ یہ کہیں اور مقابلہ کسی جنگ کا تھا ہی نہیں۔ یہ تو مزاحمت کا زور توڑنے کا کھیل تھا۔ ابن سعد کی اسی

---

[1] شمر کو حسین دشمن کا سرگرم راوی میں کہا جاتا ہے۔ صحیح صورت معلوم نہیں۔ بظاہر وہ حضرت علی کی صف میں نظر آتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس کی دشمنی بھی عجیب ہے۔

نصب العین کیفیت کو دیکھتے ہوئے جب کہ اس قصے کی تمام روایتیں دیکھی گئی ہیں کہ ایک طرف ابن زیاد کی فرمانبرداری بھی منظور تھی دوسری طرف حضرت حسین کی سلامتی بھی مد نظر اس کیفیت میں اور کم از کم جتنی جتنی گئی تا زیادہ فرصت کے ساتھ ہو واقعۂ کربلا کے سوا کوئی اور صورت از روئے عقل و عادت نہیں ہونی چاہیے تھی کہ ابن سعد کی طرف سے ان لوگوں کو گھیر کر اور مجبور کر کے زیادہ سے زیادہ تعداد میں سلامتی کے ساتھ گرفتار کر لینے کی کوشش ہوتی اور ادھر سے مزاحمت۔ یہ مزاحمت طاقتور ہوتی اور بظاہر طاقتور ہونی ہی چاہیے تھی۔ تو ابن سعد کی کوشش ناکام ہوتی اور زیادہ سے زیادہ تعداد اپنی عزت پر قربان ہو جاتی لیکن اس میں صبح سے سہ پہر تک کا وقت لگ جاتا اور باقاعدہ دو لشکروں کے درمیان جنگ کی صورت تھی جیسا کہ روایتیں کہتی ہیں اور جیسا کہ عموماً دہرایا جاتا ہے یہ کوئی سمجھ میں آنے والی بات ہرگز نہیں۔ بظاہر یہ بیان واقعے کے بجائے واقعہ کی اسی طرح کی ایک مبالغہ آمیز اور انتہا پسندانہ تعبیر ہے جس طرح کی دوسری انتہا پسندانہ تعبیر اس کے مقابل ایک روایت میں یوں پائی جاتی ہے کہ ابن زیاد نے جس شخص زحر بن قیس کو حضرت حسین کا سر دے کر یزید کے پاس بھیجا اس نے یزید کے پاس پہنچ کر کہا کہ:

ابشر امیر المؤمنین بفتح	امیر المؤمنین مژدہ ہو، لشکر کی فتح
الله ونصره ورد علینا الحسین	فتح و نصرت کا، حسین بن علی اپنے
بن علی فی ثمانیة عشر من	اٹھارہ گھر والوں اور ساٹھ شیعوں
اهل بیته وستین من	کے ساتھ آ پہنچے تھے۔ (یعنی ہم پر)
شیعته فسرنا الیهم فسألناهم	ہم لوگ ان کی طرف چلے اور ہم نے
ان یستسلموا وینزلوا علی حکم	مطالبہ کیا کہ اپنے آپ کو ہمارے سپرد
الامیر عبید الله بن زیاد	کر کے امیر عبید اللہ بن زیاد کے فیصلے
او القتال فاختاروا القتال	پر چھوڑ دیں یا جنگ کے لیے تیار

على الاستسلام فعدونا عليهم
مع شروق الشمس فاحطنا بهم
من كل ناحية حتى اذا اخذت
السيوف ماخذها من هام
القوم يهربون الى غير وزر و
يلوذون منا بالآكام والحفر
لواذا كما لاذ الحمائم من
صقر فوالله يا امير المؤمنين
ما كان الا جزر جزور او
نومة قائل حتى اتينا
على آخرهم ...؎

بجز ان لوگوں نے قتال پسند کیا ۔
نتیجہ یہ کہ ہم لوگوں نے سورج نکلتے ہی
ان پر چڑھائی کی اور ہر طرف سے گھیر لیا
حتیٰ کہ جب تلواروں نے ان کی کھوپڑیوں
پر کام شروع کیا تو جدھر منہ اٹھا بھاگ
نکلے کہیں ٹیلوں کی کہیں گڑھوں کی
پناہ ڈھونڈنے لگے جیسے کہ کبوتر شکرے
کے سامنے بھاگا کرتے ہیں۔ بس اے
امیرالمومنین قسم ہے خدا کی بس اتنا
جانئے کہ میں اس سے زیادہ وقت
نہیں لگا جتنا ایک قصاب کو ایک
اونٹ ذبح کرنے میں یا دوپہر کو کسی
شخص کے قیلولہ کرنے میں لگتا ہے

ظاہر ہے کہ جس طرح یہ روایت بے جا طرفداری پر بنی ہے یہی حال اس سے پہلے کی روایتوں کا سمجھنا چاہئے۔

ابو مخنف کے دامن میں لپٹے قصے

ابو مخنف کی روایتیں جب ناقابل اعتبار اور ناقابل قبول ٹھہر جاتی ہیں تو پھر ان ابو مخنف کے دامن پر وہ بہت سی کہانیاں ٹانک دی گئی تھیں وہ بھی کسی اعتماد کے لائق کہاں رہ جاتی ہیں؟ انہیں کہانیوں میں شہدائے اہلبیت کی لاشوں کا ایک کے بعد

؎ طبری ج ۵ ص ۲۶۴

ایک کر کے تنہا حضرت حسین کو ان کے پاس دوڑ دوڑ کے جانا رنج و الم کے کلمات سے انہیں آنحضرت کے لیے رخصت کرنا، ایک طرف کو اکیلے نکل جانا، حضرت زینب کبریٰ کا رونا پیٹنا بار بار میدان جنگ میں نکل آنا۔ وغیرہ وغیرہ

ساری کہانیاں جن میں سے کتنی ہی ایسی ہیں جو دراصل حضرت حسین کی شان کے (جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے) دراصل اختلاقی ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی سبائی ذہن کے تحت گھڑی گئی ہیں جو عرب فرزندانِ اسلام کی متاعِ دین و دانش لوٹ لینے کی جد و جہد میں لگا ہوا تھا اور اسے خانوادۂ رسول کی مظلومیت کے نام پر ایک جوشیلا قسم کی جذباتی فضا پیدا کر دینے میں اپنے اس منصوبے کی تکمیل کا بہترین سامان نظر آیا اور پورا ہے اس حربے اور مقصد میں وہ خوب خوب کامیاب رہا۔ اسلام کے ناواقف اور ضعیف العقیدہ فرزندوں کی ایک بڑی تعداد اس حربے کا شکار ہو کر اسلام کی شاہراہ رواں (MAIN STREAM) سے ہٹ گئی اور بالکل ایک جعلی مذہب جو اسلام تک کے بلکہ اصل اسلام کے نام سے چل نکلا۔ آج جو لوگ اس مذہب یا ماتم حسین کے پیرو ہیں سمجھتے ہیں کہ وہ بے دلی سے اسلام دوست ہیں۔ اس مذہب کے اصل بانیوں کی طرح چھپے دشمن نہیں مگر سبائیوں کے تقابل کا بہکایا ہوا ہے کہ ان کے عقیدہ کی یہ وجہ فضل کی وجہ ہماری ہم عصر ہے، ایک ضد کی جان اور دل سے حفاظت کرنا چاہتی ہے اور اس مذہب والوں کا بھی ہر شخص جس مذہب کے ماحول میں پیدا ہو گیا ہے بے سوچے بے کہ سوچے سمجھے دلوت سے وفا (ما شاء اللہ) ہوشمندی کرتے ہوئے اسی مذہب پر جیتا اور مرا جاتا ہے

۱؎ حسب لقدر مناسب دیکھو۔ ۲؎ تشکیک ۳؎ شکار

۴؎ [illegible]

دامانِ اہلبیت کے لیے ننگ

بہرحال! یہ ہے یوم عاشورہ کی وہ کہانیاں اور تفصیلیں جن سے دراصل حضرت حسینؓ کی شان اور عظمت کو دھبہ لگتا ہے۔ دھبہ لگانے کو تو وہ "قبل از جنگ" کی تقریر ہی بہت کافی ہے جو اوپر نقل ہو چکی۔ علی مرتضیٰ شیرِ خدا کا بیٹا اور ایسا بے حیا، غدار اور پست کردار لوگوں سے جن کا اُدھر خود کیا ہو، احسان جتائے۔ اہلِ شرف و عزت کے یہاں قابلِ تصور نہیں ہو سکتا کہ اپنے والد ماجد کے نام پر، اپنی والدہ خاتونِ جنت کے نام پر، اپنے نانا سید الانبیاءؐ کے نام پر، اپنے چچا جعفر طیارؓ کے نام پر اور اپنے نانا کے چچا سید الشہداء حضرت حمزہؓ کے نام پر اپنی جان کی امان مانگے! جیسا کہ وہ تقریر دکھاتی ہے اور ایک بار نہیں، عنوان بدل بدل کر بار بار مانگے؟ العیاذ باللہ!

اس تقریر میں ننگ و عار کا یہ پہلو ہرگز کوئی ایسا نکتہ نہیں ہے کہ کوئی آگے آ کے کھولے تو لوگوں پر کھلے۔ بالکل کھلی ہوئی اور عام آدمی کو محسوس ہونے والی بات ہے مگر اتنی حد تک عام آدمی کہاں جا سکتا ہے کہ روایت میں کلام کرے۔ اس پہلو کا معاملہ تو وہ حضرت حسینؓ پر چھوڑ دے گا کہ ہوگی کوئی مصلحت! البتہ یہ بات اس کے دل میں کھٹک ہو جائے گی کہ حضرت حسینؓ اپنی اصل عظمت یہ سمجھتے تھے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے، فاطمہ بنت رسول اللہ اور علیؓ وصی رسول اللہ کے بیٹے ہیں اور یہی وہ دوسرے مسلمانوں سے چاہتے تھے کہ انہیں اس نسبی عظمت سے دیکھا جائے اور اسی کے مطابق ان کے ساتھ معاملہ کیا جائے۔ اہلِ بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کے نسبی رشتے کی ہو، دینی رشتے پر نظر ہو یا نہ ہو، حالانکہ اسلام میں اصل عظمت تقویٰ اور دینداری کی ہے۔ مگر نسل و نسب کی اہمیت اگر مسلمانوں کے ذہن نشین ہو گئی ہو اور عزت و احترام کے ساتھ تعبیر کی گئی تو سبائی تحریک کی کامیابی کے لیے پوری بنیاد فراہم ہو گئی۔ یہ رسول اللہ

۱؎ شیعیت کے مؤسس عبداللہ بن سبا کا سیاسی کردار دیکھ، اور گروہ [illegible]

مصطفےٰ اللہ علیہ وسلم کی خلافت اور وراثت کو ایک نسبی سلسلہ بنا دینے اور نسب ہی میں ساری عظمتیں جمع کر دینے کا کام اس کے بعد کچھ مشکل نہیں رہ گیا۔ بس یہ فلسفہ ہے جو اس سراپا سنگ و مار نظریہ کے پیچھے کام کرتا نظر آتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

یہی بیماری جو اس نظریہ کے ذریعے مسلمانوں کے ذہن میں پیوست کرنے کی کوشش کی گئی تھی اسی کو آگے کی ان کہانیوں سے خوب خوب گہرائی میں اتارنے کی سعی کی گئی ہے کہ آپ اپنے فرزندوں، بھتیجوں، بھانجوں اور بھائیوں کی لاشوں کی طرف دوڑے ہوئے جاتے اور اس طرح کے کلمات سے اپنے غم و غصے اور بے بسی کا اظہار کرتے

بُعداً لقوم قتلوك و من	ہلاک ہوں وہ لوگ جنہوں نے تجھے قتل
خصمهم يوم القيمة جدك [1]	کیا اور جن کے مقابلے میں قیامت کے
	دن تیرے نانا فریق ہوں۔

اسی طرح کسی زخمی کو لا کر جانبازی اور مردانہ کارکردگی پر اسے شاباش دیتے ہوئے [2] روایتوں کے مطابق بایں الفاظ دعا دیتے ہیں۔

جزاك الله خيراً عن	اللہ تمہیں اپنے نبی کے اہل بیت کی
اهل بيت نبيه [2]	طرف سے بہترین بدلہ دے۔

بہرحال یہ تو ایک ضمنی بات کی مثالیں آگئیں۔ اصل منشا یہاں حضرت حسینؓ کی تقریر کے علاوہ ان مزید کہانیوں کی کچھ نشاندہی کرنا ہے جن سے واقعہ میں حضرت موصوف کی شان پر یا آپ کے دیگر اہل بیت کی شان پر دھبہ آتا ہے۔ مگر عوام سے مشہور کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) [illegible] سے تحقیق کی ہے کہ یہ کربلا میں نہیں بلکہ [illegible] قتل ہوئی تھی [illegible] کا انکار کر کے [illegible] تو بھلا جب [illegible] علیہما السلام کے وجود کا ہی انکار کر دیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے [illegible] "[illegible]" [illegible] کا بھی [illegible] ہے۔

[1] طبری ج ۶ صفحہ ۲۵۵ یہ کلمات جس [illegible] کے [illegible] کہا جاتا ہے [illegible] نام [illegible] کی [illegible] کا [illegible] ہے۔

[2] ایضاً صفحہ ۲۵۵

گئی ہیں اور ہر سال تازہ کی جاتی ہیں۔

سب سے بڑی مثال

اس کی سب سے بڑی مثال وہ روایتیں ہیں جو دکھاتی ہیں کہ حضرت حسینؓ دوسرے رفقاء و انصار ہی کو نہیں اپنے خاندان کے ایک ایک فرد کو بھی حتیٰ کہ نابالغ بچوں کو بھی اپنے اوپر قربان ہونے کی اجازت دیتے رہے اور جب سوائے ایک بیمار صاحب بستر فراش صاحبزادے علی بن الحسینؓ زین العابدین کے اور کوئی نہ بچا تب آپ نے تلوار اٹھائی۔ اول تو اپنے بچوں ہی کو آگے کرنا [illegible] گر مجبور و مضطر نہیں ہے تو ہلاکت کے لیے انہیں آگے نہیں بڑھاتا یا کم از کم اکیلا نہیں چھوڑتا۔ پھر یہاں روایتیں کیوں باور کرا رہی ہیں کہ حضرت صاحبزادے علی اکبر، بعمر ۱۹-۲۰ سال کو اکیلا آگے بڑھنے دیا اور پھر دیکھتی آنکھوں اکیلا ہی آخر دم تک لڑنے بھی دیا بلکہ بھتیجوں اور بھانجوں اور بھائیوں کے ساتھ بھی ان کی کم عمری کے باوجود یہی معاملہ رکھا۔ کوئی بتائے کہ کیسے یقین کیا جائے؟ اور یقین کیا جائے تو پھر کیسے حضرت والا کے بے عقیدت کو ایک شدید احساس کی چبھن سے بچایا جائے؟

ایک تاویل لاطائل

بات صاف لگتی ہے چنانچہ جو لوگ ان روایتوں کے قائل ہیں وہ بھی اس سوال سے آنکھیں نہ چرا سکے۔ مگر تاویل کی جو راہیں بھی ہیں کسی سند نہیں ہوتی۔ چنانچہ جناب علی نقی صاحب کی کتاب "شہید انسانیت" جس کا ہم پہلے تذکرہ کر چکے ہیں۔ اس میں بھی یہ سوال

لہ بیماری کا ان کی عمر کا مسئلہ کا جو مہم گزرتا ہے اسکا واسطہ بھی "شہید انسانیت" میں صرف کہ بیمار تھے کہ بالغ نہیں ہونے تھے رہتے۔ اور حضرات کا عمر و احمد طبری لکھی ہے اس بیماری کی بیج عمری کی علامتیں پائی جاتی جیسے مثلاً درم کھا کرنا پھیلے بچھانا وغیرہ۔

سامنے لایا گیا ہے اور خطابت و وجاہت کی پوری صلاحیتیں صرف کر کے اس کا عملی رول پیش کیا گیا ہے کہ:-

> حسین کے لیے نسبتہً بہت آسان ہوتا کہ جیسے ہی آپ اپنی جان کا صدقہ رہِ حق میں پیش کر دیتے۔ اس صورت میں آپ کی قربانی اپنی جان کی قربانی ہوتی اور اس کو کسی ایسے شہید کی قربانی سے بڑا درجہ دیا جا سکتا جس نے کبھی بھی حمایت حق میں اپنی قربانی پیش کی ہو۔
>
> اس صورت میں آپ کی قربانی اس سے زیادہ وسیع نہیں سمجھی جا سکتی تھی جتنی کہ بقول انصاری حضرت عیسیٰ کی قربانی تھی کہ آپ دین حق کی تبلیغ کی وجہ سے صلیب پر چڑھا دیے گئے یا سقراط کی قربانی کہ ان کو اصول کی حمایت میں زہر کا جام پینا پڑا۔ اور حسین کے لیے اس منزل سے گزر جانا مشکل بھی کیا ہوتا جب کہ آپ اسی باپ کے بیٹے تھے جن کا قول یہ تھا کہ مجھے اس کی پرواہ نہیں کہ موت مجھ پر آ پڑتی ہے یا میں موت پر جا پڑتا ہوں اور یہ کہ موت سے اسی طرح مانوس ہوں جتنا کہ بچہ پستان مادر سے مانوس ہوتا ہے...... مگر حسین کی شہادت کو جو امتیاز حاصل ہے وہ اسی لیے کہ آپ نے ایسے ہر ہر فرد کو جو آپ کی ذات سے دور یا قریب کا تعلق رکھتے تھے اپنی موجودگی میں راہِ حق میں نثار کر دیا...... حسین کا کمال عمل صرف یہی نہیں تھا کہ وقت موعود آنے پر آپ نے اپنی جان راہِ خدا میں پیش کر دی بلکہ آپ کے نفس کا کمال یہ تھا کہ آپ نے نہایت عزیز ہستیاں رضائے حق کے راستے میں یکے بعد دیگرے قربان کر دیں[۱]۔ اور جب تک صبر و تحمل کے ساتھ ان تمام

---

[۱] اگرچہ ان میں ایسے کم عمر بھی تھے جیسے کم عمروں کو حضور اکرم نے [illegible] میدان میں شریک ہو کر راہِ خدا میں بھی اپنی جان نثار کرنے کی اجازت نہیں دی ؟

خود گوارا و پسند کر کے ذکر کیا اس وقت تک محمد ابھی جہان کا وجود بھی نہیں ہوا تھا۔[1]

ایک بے معنی اور ناقابلِ فہم بات کو خطیبانہ فلسفہ بنانے کی یہ کوشش ایک بڑے فاضل اور نامی گرامی شیعہ عالم کی ذہانت و صداقت کا ثبوت ہے جس میں کسی سنجیدہ سوال کا جواب نہیں ملتا۔ البتہ ایک سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ کیا امام کی شان حضرت عیسیٰ سے بھی بلند تر تھی؟ جس سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ معاملہ کس قدر ناقابلِ توجیہ اور ناقابلِ حل ہے۔ حل صرف ایک ہی ہے کہ ان روایتوں کو جن کی سند میں کوئی وزن نہیں اور جن کے مضمون میں بھی علامتیں موضوع ہونے کی واضح ہیں انہیں موضوع قرار دے کر رد کر دیا جائے۔ لیکن یہ فیصلہ ظاہر ہے کہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے بنیادِ دین و ایمان مظلومیتِ حسینؓ کے ماتم کو قرار نہ دے رکھی ہو ورنہ تو ان روایتوں کی حفاظت لازم ہو جاتی۔ اس لیے کہ ان کے بغیر وہ فضا ہی نہیں بن سکتی جس میں ماتم کی دلکشی اور گرمی آفریں ہو جائے۔ قتالِ حضرت علی اکبر والی روایت سے ہے جس میں علی اکبر کو بغیر جنگ در پا لگنے اور بغیر ایک مزید داستان بنائے سیدھے سادے لفظوں میں یوں پیش کر دیا گیا ہے کہ:

> جب آپ نے ابنِ زیاد کے ہاتھ پر بیعت کی شرط پوری کرنے سے انکار کیا تو
> عمر بن سعد نے آپ سے قتال کیا اس میں آپ کے تمام اصحاب شہید ہو گئے
> جن میں آپ کے اپنے گھر کے تقریباً ۱۵-۲۰ جوان بھی تھے[2] بعد ازاں آپ نے
> خود قتال کیا اور آپ بھی شہید ہو گئے۔

اس روایت سے ظاہر ہے کہ ماتم کے کاروبار کو رونق نہیں مل سکتی اس میں ہر ایک کے بعد ایک لاشہ گرنے کا منظر نہیں ملتا۔ ان لاشوں پر حضرت حسینؓ کا رونا بلبلانا اور جزع

---

[1] "شہیدِ انسانیت" ص ۱۴۱-۱۴۲۔ [2] البدایہ والنہایہ میں ان حضرات کی بابت کئی اقوال نقل کیے گئے ہیں ایک قول ۱۷ کا ہے جو حسن بصری کی طرف منسوب ہے۔ ایک ۲۰ کا جو محمد بن حنفیہ کی طرف منسوب ہے اور ایک ۲۳ کا قول ہے۔ (ج ۸ ص ۱۹۰)

امام کے حالات اور فرمانا نہیں آتا۔ حضرت زینب سر کھولے سینہ پیٹتی اور پچھاڑیں کھاتی ہوئی خیمہ سے آتی ہیں۔ لاش سے لپٹ کے بین کرتی ہیں پانی جاتی ہیں۔ حضرت حسین پیاس کی شدت سے فرات کی طرف گھوڑا دوڑاتے ہوئے اور عین اس حالت میں کہ پانی حلق سے اتارنے جا رہے ہیں گلے میں دشمن کا تیر کھاتے ہوئے اور پھر ان کے لیے بد دعا کرتے نہیں دکھائی دیتے کہ۔

"اے اللہ ان کو گن لے اور پھر انہیں چن چن کے مار اور ایک کو بھی باقی نہ رکھ"[1]

اور پھر بعد میں زخموں سے چور دشمن کے نرغے میں گھرے ہوئے ان سے یوں مخاطب ہوتے ہوئے بھی نہیں ملتے جس سے ایک عاجزی اور بیچارگی کی تصویر کھنچتی ہے کہ۔

"کیا تم میرے قتل پر ایک دوسرے کو اکساتے ہو؟ بخدا میرے بعد کوئی
ایسا بندہ نہیں ہے جس کے قتل سے اللہ تعالیٰ اتنا ناراض ہو جتنا میرے قتل سے ہوگا
اور اگر تم نے مجھے قتل کر ہی دیا (اور وہ ہے) تو اللہ تم پر آپس کی لڑائی
اور خونریزی کا عذاب مسلط فرمائے گا اور پھر اس عذاب دنیا پر بس نہ کرتے
ہوئے آخرت کے دردناک عذاب کا اس پر اضافہ فرمائے گا۔"[2]

اور پھر حضرت زینب یہ کہتی ہوئی نہیں نکل آتیں کہ۔

یا عمر بن سعد ایقتل ابو عبداللہ   اے عمر بن سعد کیا ابو عبداللہ (حسینؓ)

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۵۹ [2] طبری ج ۶ ص ۲۶۰ اس عبارت میں علامہ عباس بانت کے اسلوب کو سمجھو کر حضرت حسین اپنی جان بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ عبارت کے زیر خط الفاظ بھی توجہ طلب ہیں قرات کے اسلوب میں ایک ہی اور حسین کے علاوہ کوئی شخص ایسا نہیں کہ اس کا قتل اپنے بارے میں کہے [illegible] [illegible] اخلفتہ بینکم۔ یہ انگریزی ترجمہ کے وزن پر ہے [illegible] جزا نہ ملنے کی حق ہے زیر حجت [illegible] کیسے [illegible] جاتا ہے کہ حضرت حسین قرآن پاک کی اس اسلوب سے ناواقف تھے اور پیش نظر رہا [illegible] لوٹ پرانا ہے تھے جو اہل قرآن کی شان نہیں۔

جب بطل روایت عظیم المرتبت قتل ہوں گے تو ہم کیا جواب دیں گے؟
چنانچہ اس سارے روایت کا ذکر بعد حضرت محمد باقر کی روایت سے شیخ کلینی نے کیا ہے۔

قصۂ مختصر

اختصار کی کوشش کے باوجود قصہ طویل ہو گیا۔ مختصر یہ کہ سوائے کربلا کی لمبی چوڑی کہانی مالا علی اس کے کہ موقع محل کے حالات ان کے وقوع کے لیے گنجائش نہیں رکھتے اور علاوہ اس کے کہ ان قصوں کی سندیں نہایت بے وقعت ہیں۔ یہ قصے متعدد پہلوؤں سے خاندان نبوت پر بدنما دھبے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی مثال کے ذکر سے ہم نے ابھی بات شروع کی تھی اور اس کے ضمن میں باقی وہ تمام باتیں بھی آگئی تھیں جو الگ الگ ذکر کرنے کا ارادہ تھا۔ یعنی حضرت حسین کا اپنے آپ کو اپنی زبان سے مقتول ہو اور قتیل باپ کا ذکر بتانا۔ جس کی کوئی گنجائش رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں نہیں ہے۔ اپنے دشمن کو بد دعائیں دینا جو ان کے نانا کی سنت نہیں اور رسول اللہ کا میدان جنگ میں طریقہ نہیں۔ سیدہ زینب بنت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا بین اور بکا کرتے ہوئے میدان جنگ میں آ جانا اور ہاتھوں سے پیٹنے کا سماں چلانا۔ پھر حسین کے پیچھے عمر بن سعد سے رحم کی اپیل کرنا۔ بھلا یہ باتیں کیا کہیں خاندان نبوت کی خواتین کو زیب دیتی ہیں اور خاص کر علی رضی اللہ عنہ جیسے شیر مرد کی بیٹی۔ یہ سب باتیں اگر قابل اعتبار ہو سکتی ہیں تو صرف ان لوگوں کے لیے جنہیں خاندان نبوت کی محبت کے نام پر ان کی مظلومیت کے ماتم کی دکان کھولنی ہو۔ مظلومیت کی اس داستان کو رنگین کرنے کے لیے ان تمام چیزوں کا اپنے ہی ہاتھوں سے تو ان کا پیٹنا ہے جو اس خانوادے کا اور کسی بھی خانوادے کی عظمت اور اس کی عزت ہوں۔

لہ طبری ج ۶ ص ۲۶۱

۱۴۔ بندشِ آب

داستانِ کربلا کا ایک اہم جزو ابنِ زیاد کی طرف سے قافلۂ حسینؑ پر پانی کی بندش ہے۔ دوسرے اجزاء پر گفتگو کے اختتام تک یہ مطلب بھی لیا جا سکتا ہے کہ گفتگو ختم ہو گئی۔ مگر اس بندشِ آب والے جزو کو بہت اہمیت دی گئی ہے اس لیے اسے خاص کر لیا جائے۔ بندشِ آب بڑے مبالغہ سے بتائی گئی ہے اور اہلِ قافلہ کا پیاس سے جو حال تھا کہ خود حضرت حسینؑ کا برا حال بتایا جاتا ہے کہ سخت حالتِ جنگ میں بھی دشمن کو نقصان پہنچانے یا اس سے اپنا دفاع کرنے سے بھی بڑھ کر پانی کا حصول ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ مگر اسی یومِ عاشورہ کی روایتوں میں ایک روایت یہ بھی موجود ہے کہ جنگ شروع ہونے سے پہلے حضرت حسینؑ اور ان کے ساتھیوں نے یکے بعد دیگرے غسل کیا اور ایک بڑے برتن میں مشک گھول کر تیار کیا گیا تھا جو ان حضرات نے جسم پر لگایا۔ اس کے علاوہ کربلا کا میدان جس کے بارے میں روایتوں نے یہ تاثر دیا ہے کہ وہ ایک بے آب و گیاہ ریگستان تھا اس کی تردید کے لیے حضرت امام باقرؑ والی وہ روایت کافی ہے جس کا کچھ حصہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ جس کے مطابق کربلا ایک ایسی زمین تھی جس پر نرکل اور بانس کا جنگل یا جھاڑیاں موجود تھیں اور یہ جنگل ریگستان میں نہیں ہوا کرتے۔ یہ مسلّم ہے کہ دریائے فرات یا اس سے نکلنے والی کسی نہر کا کنارہ تھا۔ یہاں پانی زمین کی سطح سے اتنا قریب تھا کہ تھوڑی سی زمین کھود کر پانی مل جائے۔ معجم البلدان[1] میں کربلا کے ذیل میں صراحت ہے کہ یہاں کی زمین میں نرمی و رخاوت ہے۔ اور یاد رکھنا ہے کہ طبری ہی میں یہ روایت موجود ہے کہ اصحابِ حسینؑ کو بھی زیرِ زمین کا یہ تجربہ ہوا تھا کہ ذرا سا کھودنے پر پانی نکل آیا۔ بہرحال تاریخی حقیقت کے طور پر اس لیے یہ بے بنیاد مفروضہ ہے کہ کربلا میں پانی نایاب یا کمیاب تھا اور اس سے مبالغہ ہے بندشِ آب

---

[1] معجم کے صفحہ کا حوالہ مجھے دستیاب نہیں ہے لیکن میرا غالب گمان ہے کہ میری یادداشت صحیح ہے۔ تلاش سے طبری میں یا ابنِ اثیر میں وہ موقع نکل آئے گا۔

والے افسانے کی حقیقت بھی ظاہر ہو جاتی ہے۔

معاملے کے کچھ اور پہلو!

کربلا جیسی لب دریا سرزمین پر اس بات کو ممکن سمجھ لیا کر وہاں سو ڈیڑھ سو ایسے مسلح انسانوں پر جن میں تمام متقی سوار بھی تھے مسلسل تین دن تک پانی کی مکمل بندش کی جا سکتی تھی، یہ بات عقل و خرد سے مکمل رخصت لیے بغیر ممکن نہیں۔ ہاں اگر یہ بات کہی جائے کہ پانی کا گھاٹ ۔۔۔ یعنی اس جگہ کا جو قریبی گھاٹ تھا وہ ۔۔۔ روک لیا گیا تھا۔ تاکہ حسینی قافلہ بسہولت پانی نہ لے سکے تو یہ سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ پانی کے گھاٹ سے ہٹ کر پورے علاقے پر ناکہ بندی نہیں ہو سکتی اور واقعہ یہ ہے کہ روایت میں گھاٹ روکنے ہی کا ذکر ہے جس کے معنی غلط لگائے جا رہے ہیں۔

لیکن اس میں بھی ۷ تاریخ سے شروعات کی جو بات کہی جاتی ہے اور وہ بعض تاریخ والی روایت میں آتی ہے وہ بھی ایسی ہی ناقابل فہم ہے جیسی مکمل بندش والی بات۔ اسکے برخلاف جو بات واقعاتی طور سے قابل فہم ہے وہ یہ ہے کہ ۱۰ تاریخ کو جب دشمن نے جنگی اقدام کا فیصلہ کر لیا تو پھر جلد از جلد کامیابی کے لیے جہاں دوسرے ذرائع اور ہتھیار استعمال کیے وہاں ایک تدبیر یہ بھی اختیار کی جو جنگوں میں عام طور پر کی جاتی ہے کہ فریق مخالف کے لیے پانی کا حصول مشکل بنا دیا جائے۔ اس سے قدرتی طور پر فریق مخالف کی قوت مدافعت گھٹتی ہے۔ پس اگر یہ دعویٰ کیا جائے یا یوں کہیے کہ روایت میں اس طرح کی بات کہی گئی ہو تو یہ ایک قابل فہم بات ہے اور اس پر کسی کو کلام کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوگی۔ نیز پتے کی بات ہے کہ تمام بندش کی روایات کے جن حصوں میں اس کا ذکر ہوا ہے وہ غلط ہوگا جبکہ اس کے برعکس ۷ تاریخ والی روایت بعض دوسری روایتوں کے ساتھ جوڑی بھی نہیں جا سکتی بلکہ یک گونہ تضاد کا درجہ رکھتی ہے تعارض کی آپ اس پہلے روایت کا جائزہ لیجئے۔

ہم نے اگرچہ تفصیل اور ترتیب کے ساتھ وہ روایت اس کتاب میں جمع نہیں کی ہیں جن میں ابن سعد اور حضرت حسین کے درمیان نامہ و پیام اور ملاقاتوں کا بیان ہے۔ اور پھر اس کے نتیجے میں ابن سعد اور ابن زیاد کے درمیان ہونے والی خط و کتابت کا بیان آیا ہے تاہم کچھ نہ کچھ ذکر ان سب چیزوں کا اسی باب کے اوپر کے صفحات میں آچکا ہے۔ علاوہ ازیں بھی یہ باتیں واقعہ کربلا کے سلسلے میں بہت مشہور و معروف ہیں۔ اس لیے قارئین اس بات سے بے خبر نہیں ہو سکتے کہ جس وقت سے ابن سعد نے کربلا میں قدم رکھا اسی وقت سے اس کے اور حضرت حسین کے درمیان نامہ و پیام اور پھر ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور پھر اس کا نتیجہ ابن سعد اور ابن زیاد کے درمیان خط و کتابت کی شکل میں ظاہر ہوا جس کا حاصل یہ تھا کہ ابن سعد حضرت حسین کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرے؟ اس سلسلے میں کئی ایک روایات ہیں جن کا مجموعی تاثر یہ بنتا ہے کہ فریقین کی یہ سلسلہ جنبانی بالکل آخر وقت تک قائم رہی۔ اور دو روایتیں توضاحت کے ساتھ بتاتی ہیں کہ ۹ محرم کی شام کو یہ سلسلہ بند ہوا۔ ان دونوں روایتوں کا ذکر اسی باب میں آچکا ہے۔ طبری جزو ۶ میں ان میں ایک روایت ۲۳۳ پر سعد بن عبیدہ کے حوالے سے ہے۔ دوسری ۲۳۶-۲۳۵ پر عبد اللہ بن شریک عامری کے حوالے سے۔

صورت حال کے اس پس منظر میں ذرا غور کر کے دیکھنا چاہیے کہ ۹ تاریخ سے بند شب کا صورت حکم جس کا مادہ بھی بتانے والی روایت کو ماننے کی گنجائش کہاں سے نکل سکتی ہے؟ ورنہ بات الگ رہ جاتی جو اس گفتگو کے شروع میں عرض کی گئی ہے کہ قتل و قتال کی حالت میں تو ۱۰ تاریخ کو بھی، بلکہ آپ کی کارروائی بھی فیصلہ کن ہو سکتی تھی۔ جبکہ قتل و قتال کی حالت کے بجائے خط و کتابت محض مذاکرات میں ہی بات تھی۔ حر بنگی کیا ہو سکتی ہے۔ ۹ تاریخ سے ایسا ہوا ہو اور ۹ تاریخ سے پہلے کہیں کسی طرح بھی پیاس کی شکایت کی کوئی روایت نہ پائی جائے تو تمام شکایتیں ۹ تاریخ ہی کے ذیل میں

آگئے ہیں۔ اس سے پہلے کا کوئی بیان نہیں تھا۔ حالانکہ سلسلہ فریقین میں یہ بہرحال چل رہا تھا!

روایت کی اندرونی شہادت

روایت میں اس بات کی صراحت تو ہے ہی جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا کہ بندشِ آب کی صورت صرف یہ تھی کہ گھاٹ روک لیا گیا تھا۔

> …… پس عمرو بن حجاج کو پانچ سو سواروں کا دستہ دے کر بھیجا اور وہ گھاٹ پر جا اترے[1] اور حسینؑ کے ساتھیوں اور پانی کے بیچ میں حائل ہو گئے ……

اس کے علاوہ اس بات کی بھی صراحت روایت کے اندر پائی جاتی ہے کہ یہ کارروائی سات تاریخ محرم کو عمل میں آئی جو جنگ کا دن تھا۔ کیونکہ روایت میں اگرچہ مذکورہ بالا سطور کے بعد "وذالک قبل قتل الحسین بثلاث" (اور یہ شہادتِ حسین سے تین دن پہلے کی بات ہے) کے الفاظ آتے ہیں مگر پھر فوراً ابو مخنف کا قصہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس سے پہلے کی کوئی بات نہیں۔

قال و نادہ عبد اللہ بن	حمید کہتا ہے کہ عبداللہ بن ابی الحصین
ابی الحصین الازدی و عداده	ازدی[2] جس کا شمار بجیلہ میں ہوتا تھا
فی بجیلۃ فقال یا حسین الا	حضرت حسین کے مقابلہ پر آیا اور کہا کہ
تنظر الی الماء کانہ کبد السماء	حسین تم پانی کو دیکھتے ہو کیسا آسمان
واللہ لا تذوق منہ قطرۃ	کی طرح شفاف ہے۔ بخدا تم اس میں
حتی تموت عطشا …[3]	سے ایک قطرہ بھی نہ چکھ سکو گے حتیٰ کہ

---

[1] روایت کے اصل الفاظ یہ ہیں "نزلوا علی الشریعۃ وحالوا بین حسین واصحابہ" شریعہ کے معنی گھاٹ یا گذرگاہ کے ہیں۔
[2] یعنی عبداللہ ازدی تھا مگر اس کا نام قبیلہ بجیلہ کے تحت درج تھا۔ [3] حوالہ سابق۔

پیاسے رہ کر ذوالفقر پر دم نکل جائے ۔

سچ بات یہ ہے کہ بالکل سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں یہ بعد کے دور بعد شہادت سے تین دن پہلے کے الفاظ روایت میں درج کیے گئے ہیں ۔ حضرت حسینؓ سے کسی کا مقابلہ اور تاریخ سے پہلے کہیں مروی نہیں اور پانی کی کمی کی شکایت ہیں ، اور تاریخ سے پہلے کہیں بیان نہیں کی گئی ۔

اور خود راوی کے اوصاف !

اس روایت پر غور وفکر کے سلسلے میں اس کے راوی حمید بن مسلم کے کردار پر بھی نظر ضروری ہے ۔ واقعۂ کربلا کے سلسلے میں اس کی روایات بے شمار ہیں جن میں یہ بات کے نہایت واضح قرائن ہیں کہ اس کی روایتیں ہی جعلی اور جھوٹی نہیں بلکہ یہ خود بھی شاید ایک عجیب شخصیت ہے ورنہ ایک نہایت موقع پرست اور کوفیوں کے اعتبار سے (TYPICAL) اوصاف کا مجسمہ ہے ۔ ویسے تو یہ اپنے آپ کو ابن سعد کی فوج میں شامل بتاتا ہے ۔ اور جب تک امام شہید ہو نہیں جاتا یا پانی کوئی ذرا سا بھی ہمدرد نہ کردار اہلبیت کے ساتھ نہیں رکھتا مگر جیسے ہی یہ واقعہ ہو لیتا ہے حضرت سے بڑھ کر اہلبیت کا کوئی ہمدرد کربلا کے میدان میں نظر نہیں آتا لگا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بعد عماد کا نہیں اصلی حسینی کا آدمی تھا ۔ جنگ کے وقت میں حضرت حسینؑ نے دشمنوں کی جارحیت اور سنگدلی پر جو ردعمل اختیار کیا دعا یا بددعا کی صورت میں یا اظہار رنج وملال کی صورت میں منہ سے فرمایا اس کا ایک ایک لفظ آپ اس شخص کی زبان سے سن لیجئے جیسے کوئی ہمراز ہو ۔

ایسا لگتا ہے کہ واقعۂ کربلا کے تین چار سال بعد یزید کی موت کے ساتھ ہی جب حکومت ہلا اور ایک طرف حضرت عبداللہ بن زبیر اور دوسری طرف حضرت مختار ثقفی نے جو سوال بنی امیہ ہمدرد قاتلان حسین کے لیے زمین تنگ کر دی تو بہت سے لوگوں نے عافیت طلبی کے لیے

چاہے وہ حمید بن مسلم ہی ہو مگر اگر ایسا کوئی شخص تھا تو یقیناً یہی جو ایسے لوگوں میں سے ایک تھا۔ اہل بیت کی ہمدردی میں طرح طرح کے غم انگیز افسانے تراشتے ہوئے یہاں تک کہ اس معاملہ میں اپنے آپ کو شمر جیسے سخت گیر سے بھی لڑتا جھگڑتا اور اسے مغلوب کرتا ہوا دکھاتا ہے۔ جو کہ روایات کی روشنی میں معرکۂ کربلا کا سب سے بڑا ذمہ دار ہے۔ اسی کی آمد کے بعد ابن سعد کو بھی اس قتل و قتال پر مجبور ہونا پڑا تھا جس کو وہ برابر ٹالنے کی کوشش میں لگا تھا[1] ان افسانوں سے جن میں سے ایک یہ بھونڈی ترکیب والا افسانہ بنا ہے کہ ایک طرف اپنے آپ کو محب اہل بیت میں شمار کراتا تھا دوسری طرف نظر آتا ہے کہ وہ اس موقع سے ذاتی اور خاندانی رنجشیں اور عداوتیں بھی چکا رہا تھا۔ وہ جب یہ خود یزیدی لشکر میں تھا تو اس کے لیے کوئی جواز نہ تھا کہ مظالم کی مذمت میں افراد کو بھی نامزد کرتا جیسا کہ اوپر کے اقتباس میں عبداللہ بن ابی الحصین کا نام اس نے لیا ہے۔ اس کی روایت میں یہی تنہا ایک نادر روایت نہیں ہے۔ بلکہ اسی ہی کا عکس نظر آتا ہے۔ حضرت حسینؑ کے جسد مبارک کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے روندے جانے والی روایت میں جن دس کے نام گنائے گئے ہیں یہ دس آدمی اس ناپاک کام میں شریک بتاتا ہے مگر صرف نو کا ذکر نام کے ساتھ کیا ہے۔ اس طرح کا معاملہ اس کی اور روایتوں میں بھی ہے۔ بلکہ اس شخص کے اس کردار کی بنا پر یہ بھی خیال ہونے لگتا ہے کہ کہیں شمر کی برائی میں بھی اس کی ذہنی و داخلی بداعمالیوں کے ساتھ حمید بن مسلم کی "مہربانی" کا بھی تو کوئی دخل نہیں ہے؟ اس لیے کہ اس کے ساتھ ہی شمر کا ذکر بار بار آ جاتا ہے اور اس تذکرہ میں اس کی برائیاں ظاہر کرنے سے حمید کو بہت ہی خصوصی دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے۔ اگلے باب میں حمید پر اس کی کچھ اور روایتوں کے ماتحت بھی گفتگو آئے گی۔

---

[1] طبری ۶ صفحہ ۲۶۰ پر اس کی ایک روایت میں دکھایا گیا ہے کہ حضرت علی بن الحسینؑ قتل ہوتے ہوتے بال بال بچ رہے تھے انہیں بھی شمر کی زد سے بچانے کا کارنامہ اسی حمید کا ہے۔

خلاصۂ کلام

یوم عاشورہ کے واقعات کی روایتوں کے سلسلے میں جن حقیقت پسندیوں کو اوپر کے صفحات میں اجاگر کیا گیا اُن کے پیشِ نظر اس بات میں کسی شبہ کی گنجائش نظر نہیں آتی کہ یہ روایتیں بالعموم ناقابلِ اعتبار بلکہ بیشتر بالبداہت (EVIDENTLY) قابلِ رد ہیں اس لیے عقل اور نقل، قانونِ شریعت اور تقاضائے دیانت ہر ایک کے ماتحت ان روایتوں کی ذرا ذرا سی جزوی تفصیلات کو کم از کم ناقابلِ اعتبار ضرور قرار دینا چاہیے اور اس سے زیادہ کچھ کہنے کی گنجائش نہیں سمجھی جانی چاہیے جو کسی روایت میں آتا ہے جیسی روایت حضرت محمد الباقر کے حوالے سے اوپر نقل کی گئی ہے:

> "جب حضرت کربلا میں ٹھہرنے پر مجبور ہو گئے اور کوفہ سے ایک ہزاری لشکر عمر بن سعد کی شکل میں بلاد سے آگئی تو آپ نے اس نئی صورتِ حال سے علیحدہ ہونے کے لیے تین شکلیں ابن سعد کے سامنے رکھیں۔ میں تو واپس چلا جاؤں۔ یزید کے پاس چلا جاؤں۔ یا کسی سرحد پر نکل جاؤں اور یہی ملک چھوڑ دوں۔ ابن سعد نے تجویز پسند کی اور ابن زیاد کے پاس بھیج دی۔ وہاں سے نامنظور ہوئی اور اس کی جگہ یہ حکم بھیجا گیا کہ وہ کسی اور بات سے پہلے ابن زیاد کے ہاتھ پر بیعت کریں۔ پھر ان کی کسی بات پر غور کیا جائے گا۔ اس حکم کو حضرت حسینؓ نے قطعی طور سے رد کر دیا۔ نتیجہ یہ تھا ابن سعد نے جیسا کہ اس کو حکم تھا طاقت استعمال کی۔ اور اس میں حضرت حسینؓ کے تمام ساتھی شہید ہوئے۔ ان میں آپ کے گھرانے کے بھی قریب ۱۵-۱۶ جوان تھے۔ آپ کا ایک چھوٹا بچہ بھی ایک

---

[1] یہ احتیاط علمی ذمہ داری کی بنا پر لازم نہیں ہے بلکہ شرعی اور اخلاقی ذمہ داری بھی کہی جا سکتی ہے اس لیے کہ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کا تعلق دو فریقوں سے ہے اور شرعاً و اخلاقاً کسی فریق کی حمایت یا مخالفت میں کوئی بات بے ضابطہ شہادت کے بغیر جائز نہیں۔

تیر لگنے سے شہید ہوا۔ اس کے بعد آپ نے بھی تلوار اٹھالی استعمال کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔[1]

روایت حضرت باقر کی خطا؟

واقعۂ کربلا کے بیان میں شیعہ مصنفوں کی جو کتابیں اب تک ہماری نظر سے گزری ہیں ہمیں دیکھنے کا موقع ملا اس سے ظاہر ہوا کہ حضرت محمد باقرؒ کی یہ روایت ان حضرات کے یہاں ذکر میں نہیں لائی جاتی۔ حالانکہ شیعیت کے عقیدے سے ان حضرات کے یہاں ائمہ کی بے حد قدر ہونی چاہیے تھی۔[2] اس روایت کا آخری حصہ جو دربار یزید میں حضرت حسینؓ کا سر لے جائے جانے سے متعلق ہے جس کا ذکر ہم آگے کریں گے اس کا تذکرہ یہ حضرات کرتے ہیں وجہ صرف یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس روایت میں یزید کے پاس جانے کی پیشکش بھی پائی جاتی ہے۔ اور یہ پیشکش باوجود حسینؓ کی "پیشکش" ہونے کے ایسی نادرست گردانی گئی ہے کہ یوم عاشورہ کی ان معاملات کا جو بڑے ذوق و شوق سے بیان کیا جاتا ہے اس میں بھی جہاں کہیں اس پیشکش کی بات صراحتاً یا اشارۃً آگئی ہے وہاں یا تو روایت کا بیان اسی جگہ ختم کر دیا گیا ہے یا پھر حذف ہے۔ کئی ایک مثالوں میں سے ہم یہاں ایک مثال حضرت حسین کے رفیق زہیر بن قین کی تقریر کی لیتے ہیں جو اسی باب میں پہلے گزر چکی ہے۔ اس میں یہ الفاظ بھی آگئے ہیں کہ۔

> "اے اللہ کے بندو! فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد بہ نسبت ابن سمیہ (ابن زیاد)
> کے تمہاری محبت اور نصرت کی زیادہ مستحق ہے۔ لیکن اگر تم ان کی مدد نہیں
> بھی کرتے تو ان کے قتل کے درپے ہونے سے باز آؤ اور [illegible]

---

[1] الطبری [illegible]

[2] جیسا کہ باب سابق میں گزر چکا ہے شیعہ اہل سنت کے یہاں تو صحابہ کرام [illegible] ان کے اعتقاد میں [illegible] ہوتے ہیں۔

حضرت حسینؓ سے کہو اس کے چچا زاد یزید بن معاویہ کے دربار میں جا کر بیعت

ہاں میری جان کی قسم یزید کو ہم سے راضی کرنے کیلئے اس بات کی ضرورت

نہیں ہے کہ ہم حسینؓ کو قتل کر دیں۔[1]

لیکن شہیدِ انسانیت کے مصنف اس تقریر کو اس جملے سے پہلے والے جملے پر ہی ختم کر گئے ہیں۔ یہ بعد کے جملے بھی ان کے تذکرہ میں جگہ نہ پا سکے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حسینؓ یزید کے پاس جانا چاہتے تھے۔ اس کو انہوں نے پسند نہیں فرمایا۔

اور شیعہ حضرات کا کیا کہیں خود اہل سنت حضرت حسینؓ سے متعلق شیعی تصورات سے اس درجہ متاثر ہوئے ہیں کہ ان کے یہاں بھی واقعہ کے اس جزو کو جو حتمی طور پر ثابت ہے، "تاریکی" ہی میں رکھنا عام طور پر پسند کیا گیا۔ ۲۳ محرم ۱۳۸۳ھ کو "واقعہ کربلا" اسی نام کا مضمون جس پر نظر ثانی اس کتاب کی شکل اختیار کر گئی جو آپ پڑھ رہے ہیں اس مضمون میں راقم نے اس حقیقت سے بے خبری کے عالم میں کہ حضرت حسینؓ نے جو تیسری پیش کش کربلا میں کی تھی جس کا ایک جزو یزید کے پاس جانا اور اکثر روایتوں کے مطابق بیعت کے لیے ہاتھ بڑھانا تھا۔[2] اس کا یہ جزو مکمل تاریکی میں ہے اس جزو کو بھی روشنی دکھانے

---

[1] طبری جلد ۶ صفحہ ۲۲۶ [2] ملاحظہ ہو صفحہ ۱۸۰ [3] حر بن یزید تمیمی کی تقریر اور اس سے متعلق قصے میں بھی اب حضرت حسینؓ کے پیش کردہ شرائط کے الفاظ یہ ہیں۔ یہ روایت بھی طبری ہی کی ہے اور ان میں پیش کردہ شرائط کو بیان کرنے سے روکا ہے۔ ان کا تقریباً ہر مصنف کے یہاں تذکرہ ملتا ہے اسی مصلحت میں پوری تفصیل سے موجود ہیں مگر ان کی صحت سے یکسر انکار کر دیا جاتا ہے۔ آخری بات یہ ہے کہ اس مسئلہ پر اختلافی بیانات اور روایتوں کی روشنی میں طبری نے صفحہ ۲۲۳ پر بحث کی ہیں ان کا یکجا مطالعہ بھی اس طور سے اسی نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ یہاں شرائط والی روایتیں ہی مستند ہیں اور دوسری سب گھڑی ہوئی ہیں۔

[4] ان روایتوں کے الفاظ یہ ہیں حتی اضع یدی فی ید یزید جس کا لفظی ترجمہ ہے یہاں تک کہ میں اپنا ہاتھ یزید کے ہاتھ میں رکھ دوں کوئی محاورہ ہو یا بیعت سے کیا جاتا ہے تو پھر اس سے مراد بیعت کے سوا کیا ہو سکتا ہے مشہور محاورے کے مطابق ہاتھ میں ہاتھ دینا بیعت ہی ہے

کی غلطی کر دی اور بس یہی "غلطی" قیامت خیز ہو گئی۔ بہت بہت پڑھے لکھے سنی حضرات جن میں میرے بعض بزرگ و محترم اللہ شفیق بھی شامل تھے، ان کے لیے حضرت حسینؓ کی طرف اس بات کی نسبت ناقابل برداشت ہوئی اور معاملہ اس وقت ٹھنڈا ہوا جب الفرقان کی اگلی اشاعت میں تاریخ طبری اور ابن کثیر وغیرہ کے پانچ چھ حوالوں سے اصل عربی عبارتوں میں یہ پیش کش نقل کر دی گئی اور لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ اس پیش کش کی بات کوئی افتراء اور بہتان یا کسی کمزور ذریعے (SOURCE) کی بات نہیں تھی۔

ناقابلِ انکار حقیقت

بہرحال یہ بات پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ سامنے آجاتی ہے کہ حضرت حسینؓ نے کربلا میں یہ دیکھ کر کہ حالات کا رُخ اُس خیال اور گمان کے بالکل برعکس ہے جس گمان اور اطمینان کے ساتھ کوفے کی طرف سفر شروع کیا گیا تھا، ابن زیاد کے نائب عمر بن سعد کو وہ پیش کش کی جو حضرت محمد باقرؒ کی روایت میں بیان ہوئی ہے۔ وہ جس کی تائید واقعۂ کربلا سے متعلق چند در چند روایات میں صراحتہً یا اشارۃً پائی جاتی ہے۔ یہ حضرت حسینؓ کے ورودِ کربلا کے ساتھ جڑی ہوئی ایسی حقیقت ہے کہ جب تک آپ کے ورودِ کربلا اور عمر بن سعد کے مقابل آنے سے انکار نہ کر دیا جائے اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا ہے۔ جسٹس امیر علی جیسے شیعہ مصنفین جن کے یہاں شیعیت تو قدرتی طور سے پائی جاتی ہے، مگر علمی دیانت کے غلبہ سے قائل رہے ہیں، انھوں نے بھی واقعہ کربلا کے سلسلے میں نہ صرف اس سہ گانہ پیش کش کی بات پوری صراحت سے درج کی ہے بلکہ ایک روایت (صرف ایک روایت) جو اس کی تردید میں پائی جاتی ہے اس کو رد بھی کر دیا ہے۔ (اپنی مشہور کتاب "اسپرٹ آف اسلام" (SPIRIT OF ISLAM)

میں واقعۂ کربلا کے ذکر میں حضرت حسین کی سہ گانہ پیش کش بیان کر کے مولفؒ نے اس پر حاشیہ دیا ہے جو کتاب کے اردو ترجمے میں بایں الفاظ درج ہوا ہے۔

> "صاحب روضۃ الصفا یہ شرائط بیان کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ خدام حسین میں سے ایک شخص نے جو قتل کربلا سے صاف[1] بچ نکلا اس دعوے کو غلط بتایا کہ امام حسین نے اموی سردار کے سامنے کسی قسم کی شرائط صلح پیش کیں، ممکن ہے کہ اس شخص نے یہ انکار یہ ظاہر کرنے کی خاطر کیا ہو کہ امام حسین نے صلح کی تجویز کر کے اپنے آپ کو دشمن کے سامنے ذلیل نہیں کیا۔ لیکن میرے نزدیک صلح کی تجویز سے حضرت حسین کی سیرت عالیہ کی کسی طرح کسر شان نہیں ہوتی[2]"

* * *

---

[1] یہاں سے جسٹس امیر علی کا اصل فقرہ شروع ہوتا ہے۔

[2] روح اسلام ترجمۂ اسپرٹ آف اسلام از محمد ہادی حسین۔ اسلامک بک سینٹر دہلی ص ۲۰

باب یازدہم

شہادت کے بعد کی کہانی

شہادت تک کے مرحلے میں جس طرح کی بے سروپا کہانیاں اللہ ہی جانتا ہے کہ گھڑنے والوں نے کن کن مقاصد کے لیے بنائیں اور ہمارے اہل تاریخ نے شائع کیں، ان کہانیوں کا سلسلہ شہادت کے المناک منظر پیش کرنے پر ختم نہیں ہو گیا، جنھیں پیش کرنے کی ہمت ہم اپنے اندر نہیں پا سکے کیونکہ ایک جھوٹ سے خواہ مخواہ دل دکھی کیا جاتا، بلکہ ان سے بھی بدتر قسم کے مناظر دکھانے والی کہانیاں ہم اپنی تاریخی کتابوں میں مابعد شہادت کے سلسلے میں پاتے ہیں۔

خواتین کی بے حرمتی

شہادت اور اس کے ذیل کے واقعہ شنیع جس روایت کے اندر آتے ہیں اس کا خاتمہ خواتین اہل بیت کی بے حرمتی پر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ حضرت حسینؓ کا سر تن سے جدا کرنے اور آپ کے جسم کی پوشش، پاجامے، جوتے، ٹوپی کھسوٹ لینے کے بعد یہ لوگ مستورات اور خیمے کے مال و اسباب پر پل پڑے، حتیٰ کہ سروں سے اوڑھنیاں اور چادریں تک کھینچ لی گئیں۔[1] اس کے بعد کی روایت کہتی ہے کہ اس مرحلے پر عمر بن سعد

---

[1] طبری جلد ۲ ص [illegible] ابن اثیر کا تو ایک [illegible] تھوڑی سی متعلقہ عبارت [illegible] [2] طبری جلد [illegible] ص ۲۳

پہنچے اور اعلان کیا کہ کوئی شخص ان عورتوں کے خیمے میں نہ جائے۔ اور ان کے سامان سے کسی نے کچھ لیا ہو تو واپس کرے۔ مگر کسی نے کچھ واپس نہیں کیا۔

لاش کی بے حرمتی

پھر جیسا کہ روایت بتاتی ہے عمر بن سعد نے ضروریہ حکم جاری کرنے کے بعد دوسرا ابن زیاد کے مطابق یہ حکم جاری کیا کہ

"اب کون ہے جو اپنے گھوڑے سے حسینؑ کی لاش کو روندے؟" چنانچہ دس ہمت والے نکل کھڑے ہوئے اور انھوں نے جیسا عمر نے کہا بعینہٖ اسی طریقے سے انجام دیا۔

سر کی بے حرمتی اور باقیات قافلہ سے بدسلوکی

اسی روایت کے مطابق حسینؑ کا سر خولی کے ذریعہ روانہ کیا گیا اور دوسرے دن قافلے کی خواتین اہل بیت اور باقی ماندہ بچوں کو ساتھ لے کر عمر بن سعد اور اس کی فوج بھی کوفہ کے لئے روانہ ہوگئی۔ ایک روایت کے مطابق جس کا راوی حمید بن مسلم ہے، حضرت حسینؑ کا سر اور آپ کے اہل بیت جب ابن زیاد کے یہاں پہنچائے گئے تو اس نے سر کی بھی بے حرمتی کی۔ چھڑی اس کے دانت سے لگائی اور اہلبیت کے تمام لوگوں پر بھی خوب خوب تمسخر کیا۔ اور پھر اس کے آگے آنے والی روایت کے مطابق حضرت علی بن الحسینؑ (یعنی حضرت زین العابدینؑ) جو کربلا میں بیمار صاحب فراش ہونے کی وجہ سے میدان جنگ میں نہ نکل سکے تھے اور بعد ازاں محض حمید بن مسلم کی حمایت سے بچ گئے تھے، کو باقیات قافلہ میں دیکھ کر ابن زیاد کو اس قدر ناگوار ہوا کہ اس نے ان کا ستر کھلوا کر دیکھا اور بالغ ہو سکنے یا بچہ ہونے کی تحقیق کرائی اور پھر بالغ پاکر قتل کا حکم دیا۔ مگر پھر مختلف روایتوں کے مطابق بحث و جرح سے جان کی

---

۱ طبری جز ۶ صفحہ ۲۶۰ ۲ ابن اثیر صفحہ ۲۹۱ ۳ ایضاً صفحہ ۲۴۳

[illegible]

تنقید کی ایک نظر

پچھلے باب میں ہم نے کہا ہے کہ اس واقعہ کی روایتوں میں روایت اور درایت کے اصولوں کے اعتبار سے اس قدر ناقابلِ قبول اور خلافِ قیاس باتیں بھری ہوئی ہیں کہ کسی بھی روایت کو خاص کر جس سے کسی پر کوئی الزام آتا ہو قبول کر لینا ایک بڑا مشکل اور بھاری ذمہ داری کا کام ہے کیونکہ شبہ کا فائدہ ملزم کو دیا جانا ہر مہذب قانون کا مسلمہ قاعدہ ہے۔ شریعتِ اسلامی کا ضابطہ بھی یہی ہے۔ یہ سب روایتیں جن کا اختصار پچھلے صفحات میں بیان ہوا اسی انداز کی روایت کی ہیں۔ تاہم جہاں تک ابن زیاد کا سوال ہے اس کے متعلق یہ تو اس قدر خلافِ قیاس کچھ بہت مشکل نظر نہیں آتا کہ حضرت حسینؓ کا سر اس کے سامنے رکھا گیا ہو تو اس نے آپ کے بارے میں کچھ کہتے ہوئے چھڑی سے آپ کے دانتوں یا سر کو چھو دیا ہو۔ لیکن آلِ رسول خواتین کے ساتھ جس قسم کی بدسلوکی کی باتیں اس سے منسوب کی گئی ہیں ان کے پیچھے جنگ کی نہایت مسعود شہادت بھی کوئی جواز تحقیق کے ہاتھ کا نظر نہیں آتا۔

حضرت حسینؓ کے دانتوں کو چھڑی لگانا بالکل بعید از قیاس نہیں ہے کیونکہ ابن زیاد کو خاندانِ حضرت حسینؓ کا کوئی ایسا احترام نہیں تھا جیسے امام کے قتل سے روکتا یہ بات بے حد قبیح معلوم ہوتی ہے۔ اسے اگر کوئی احترام ہوتا تو کربلا کا سانحہ ہی کیوں پیش آتا، لیکن خواتین کی بات بہت مختلف ہے۔ حضرت حسینؓ کے لیے بے احترامی کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ واقعہ جس حکومت کا عہدہ دار تھا اس کی پُرتشدد جنگ خلافت حضرت حسینؓ اس کو چیلنج کرنے کیلئے نکلے تھے اور خواتین بیچاری محض ساتھ آئی تھیں اور انھوں نے کوئی عمل یزید کی حکومت کو

۱۔ طبری ج ۶ ص ۲۶۲

چیلنج کرنے کا نہیں کیا تھا۔[1] اس لیے یہ قرین قیاس نہیں ہے کہ خواتین کے سارے خاندانوں سے اُن کی غیر موجودگی میں ایسے طور سے پیش آیا جسے کوئی بھی ماحول پسند نہیں کر سکتا۔ ایسی حالت میں اس بات کا الزام کسی کو دینے کے لیے بہت ٹھوس شہادت چاہیے۔ ایسی شہادت کس کی ہے؟ حُمید بن مسلم کی۔ جیسا جھوٹا اور بے بنیاد راوی جس کے جھوٹ و افسانہ تراشی کی شہادت طبری کے اندر ہی اس کی روایتوں میں موجود ہے۔ حتیٰ کہ اپنی روایتوں میں خود شمر اور زیر بحث روایت موجود ہے[2] جو اوپر کے صفحات میں پیش کی گئیں۔ اس نے تک گھڑ ڈالے۔

حُمید بن مسلم کے تضادات

اس روایت کو جو کہ زیر بحث ہے شروع کرتے ہوئے حُمید بن مسلم کہتا ہے کہ کربلا سے عمر بن سعد نے اپنے گھر روانہ کیا تاکہ اس کی خیر و عافیت کی خبر اور فتح[3] کی خوشخبری پہنچائے۔ اور یہ کہ وہ اس کے بعد ابن زیاد کی طرف گیا اور وہاں دیکھا کہ سر حسینؑ رکھا ہوا ہے اور قافلۂ حسینی کے باقیماندہ افراد بھی پہنچے ہوئے ہیں۔ جب اس کے آگے وہ خواتین اور بچوں کے دربار ابن زیاد کی تنگ دامنی کا قصہ سناتا ہے۔ جبکہ یہی شخص ایک صفحہ پہلے (ص ۲۱۱) کی روایت میں یہ بیان دے رہا ہے کہ عمر بن سعد نے اس کو اور فلاں دوسرے شخص کو حضرت حسینؑ کا سر ابن زیاد کے پاس پہنچانے کے لیے بھیجا تھا۔ یعنی اس کی ایک روایت کے مطابق سر پہنچانے والا یہ خود تھا اور دوسری روایت کے مطابق کسی دوسرے شخص نے یہ کام کیا۔

---

[1] شیعہ حضرات کا کہنا ہے کہ ان خواتین کی طرف جو باغیانہ تقریریں کلمے میں ان کے واقعے کے متعلق منسوب کی گئی ہیں۔ ان سے خود ہی کوئی بھی اندازہ کر سکتا ہے کہ وہ سب تصنیف ہے۔ عجیب وہ انجان لوگوں کے جملے یا دل کی طرح سے جاری تھیں۔ کون انھیں سامنے ہی کھڑے ہو کر باغیانہ تقریریں کرنے دیتا۔ [2] پچھلے باب میں اس کے کردار پر کافی روشنی پڑ چکی ہے۔

بہرحال یہ شخص ایک حاضر و ناظر "قسم کا راوی ہے" جو ہر جگہ موجود رہتا ہے۔ اور متضاد قسم کی باتوں پر یقین کی دعوت دیتا ہے۔ اس کی شہادت پر کیسے کسی کو ملزم ٹھہرایا جا سکتا ہے؟ افسوس ہوتا ہے کہ آخر لوگ اس کے ایسے بیانات کیونکر لا کر تعمیر اور ترتیب کے بعد پیش کر دیتے ہیں جو خواہ مخواہ شورش ذہن اور ضیاع وقت کا باعث ہوں!

یہی وہ روایت ہے کہ حضرت زین العابدین کا ستر کھول کر ان کے بلوغ اور عدم بلوغ کا امتحان کیا گیا۔ تو اس مذاق کے پیچھے کیا کہا جائے؟ اس راوی کو اتنا بھی پتہ نہ تھا کہ حضرت زین العابدین ۲۲ سال کی عمر کے شادی شدہ اور ایک بچے حضرت محمد الباقر کے باپ تھے۔ اور بچہ بھی قافلے میں موجود تھا۔"

لہ شیعہ کتب میں تو ابن زیاد کے دربار میں ان کی گفتگو سے متعلق ایسی ایسی باتیں ہیں کہ اللہ کی پناہ اور وہ کسی مستند کتب میں بھی نہیں ملتی ہیں۔ اس لیے ان کی بابت تفصیل بیان کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ البتہ ایک روایت کا ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ ابن زیاد کے ساتھ ہم کوئی بے انصافی کا معاملہ نہ کریں بلکہ حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ یہ روایت طبری کی ان الفاظ سے متعلق ہے کہ:

فعش برأس الحسين الى ابن	پھر حسین کا سر ابن زیاد کے پاس لے جایا گیا اور
زیاد فوضع بین یدیہ فجعل	سامنے رکھا گیا۔ ابن زیاد اپنی چھڑی سے اشارہ
ینکت بقضیبہ ویقول ان	کرتا اور کہنے لگا کہ ابو عبد اللہ کے
ابا عبد اللہ کان شمط قال	بال تو کھچڑی ہو گئے تھے۔ راوی کہتا ہے
وجیء بنسائہ وبناتہ واہلہ	پھر ان کی مستورات اور بچیاں اور اہل خانہ لائے گئے
وکان احسن شیء صنع ان	ان کے سلسلے میں ابن زیاد نے سب سے اچھا
امر لہم بمنزل فی مکان معتزل	کام یہ کیا کہ ان کے قیام کے لیے ایک
واجری علیہم رزقہ وامر لہم	الگ تھلگ جگہ پر انتظام کیا اور ان
بنفقۃ وکسوۃ قال فانطلق	کو کھانا پینا دیا اور نفقہ و پوشاک دی (تاریخ طبری)

اس کے بعد پچھلی رات چلے۔ حضرت حسینؓ کے جسد خاکی کو گھوڑوں سے روندوانے کی روایت ان روایتوں میں سرفہرست رکھے جانے کی مستحق ہے جن کی وجہ سے روایتوں کا یہ سارا کارخانہ جعل و فریب پر مبنی نظر آتا ہے۔ اس کا راوی بھی وہی مسلم بن حمید ہے جو اسی روایت میں حمید کا وہ بیان بھی آ چکا ہے جس میں اس نے بتایا ہے کہ پھر عمر بن سعد نے حضرت حسینؓ کا سر لے کر ابن زیاد کے پاس روانہ کیا تھا۔ اور آپ ابھی معلوم کر چکے ہیں کہ اسی شخص کی دوسری روایت اس بیان کی تردید کرتی ہے۔ علاوہ ازیں اس روایت میں جھوٹ کی یہ صریح علامت بھی موجود ہے کہ حضرت حسینؓ کے ساتھیوں میں سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

علامات سهم لصق بقلبه
عمروا من عمر فاتبعه رجلا
من طيء فلحق إليه فضرب
ما تيه وجاء برؤسهما
حتى وضعهما بين يدي
ابن زياد قال فأمر بضرب
عنقه وامر بداره فهدمت.

دوسری صورت یہ ہوا اور خدا فراموش کیے گئے
ہٹا دیئے گئے۔ اور دونوں میں ایک ایک تیر پیوست تھی
آیا کہ ان میں سے قبیلہ طے کا ایک شخص پیچھا
بھی نکل کر قبیلہ طے کے ایک لڑکے کے یہاں
پہنچ گئے اور اس کا سر جدا کیا اور اس غلام
نے اس کی گردن میں دونوں سروں کو ابن
زیاد کے پاس لے آیا۔ راوی کہتا ہے کہ ابن
زیاد نے اس کے قتل کا حکم دیا
کیا اور اس کے بعد اس کا گھر ڈھانے
کا حکم دیا اور وہ ڈھا دیا گیا۔

اس روایت میں اور سب باتیں خود سمجھ سکتے ہیں مگر ایک نقطہ عام قارئین کے اعتبار سے وضاحت طلب ہے کہ اہل عرب کے ہاں کنیت سے کسی کا ذکر یا اس کو خطاب ادب و تعظیم ہوتا ہے اس روایت کے مطابق ابن زیاد نے حضرت حسینؓ کا ذکر آپ کی کنیت ابو عبد اللہ سے کیا ہے اور مجرموں کے لیے کہیں کنیت کا استعمال نہیں ہوتا ہے جیسا کہ اشارہ کیا ہے جو ابن زیاد کے رتبے و عظمت کی شکل دینے والا ہے اور کسی کے لئے تب تک کہ وہ ان کی تعظیم اس روایت کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

شہداء کی تعداد بہتر بتاتا ہے جو محض ایک شہرت ہے واقعہ نہیں۔ جناب علی نقی صاحب لکھنوی بھی لکھتے ہیں کہ:۔

> ایک تاریخی صراحت کے مطابق یہ تینتیس سوار اور چالیس پیادوں سے زیادہ نہیں تھے۔ اس لیے شہدائے کربلا کے لیے بہتر کا لفظ زبان زد خلائق ہے۔ مگر کربلا کے حالات جنگ اور مجاہدین کے ناموں کی تفصیل اور دوسرے متعلقہ واقعات سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ تعداد تہتر سے زیادہ اور دو سو سے کم تھی۔ ؎

اگر یہ شخص (حمید بن مسلم) واقعی کربلا میں موجود ہوتا اور جو روایتیں اس کے نام سے آتی ہیں وہ واقعی کسی کی بھی، ایسے شخص کی ہوتیں جو کربلا میں موجود تھا تو بہتر کی خلاف واقعہ تعداد اس نے نہ بتائی ہوتی۔ اور یہی وہ روایت ہے جو خواتین کے سروں سے چادریں تک کھینچ لینے کا قصہ سناتی ہیں۔ پس خود ہی سمجھ لیا جا سکتا ہے کہ کس قسم کی روایت ہے اور اس میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں ان کی کیا حیثیت ہے؟

قصر یزید میں

بیان میں کہا گیا ہے کہ کوفے سے حضرت حسینؓ کا سر امیر یزید کے پاس دمشق بھیجا گیا۔ علی ہذا قافلہ حسینی کے باقیماندہ مستورات و خواتین اور بچے بھی وہیں پہنچائے گئے۔ اس بارے میں جو روایتیں مشہور ہیں وہ تو یہ ہیں کہ یزید نے بھی سر کے ساتھ ٹھوکا دینے کی گستاخی کی اور اہلبیت اہل خاندان کے ساتھ بھی رنج پہنچانے والی باتیں کیں۔ بلکہ شیعہ روایات کے مطابق تو اہل بیت کا قافلہ کوفے سے دمشق تک لایا گیا غیر مسلم قیدیوں کی طرح نہایت ذلت اور تشہیر کے ساتھ تھا۔ اور بھری مجلسوں میں کھلے منہ بے پردہ کھڑا رکھا گیا وغیرہ وغیرہ خرافات۔ جن میں امویوں کے کم اصول خاندان نبوت کی وہ تذلیل دکھا کر جو مسلمانوں نے کبھی غیر مسلموں کے ساتھ بھی روا نہیں رکھی

؎ شہید انسانیت صفحہ ۲۰۰

علمبرداران اہلبیت کی موجودہ ہے ہاتھوں بھی یہی تبدیل اور تشہیر انکی تقریروں وغیرہ کی شکل میں، مگر دراصل حقیقت یہ ہے کہ تمام اعتقادات اعمال و رسوم کی سند اور اصل اہلبیت ہی سے فراہم کرنے کا وہ شاہکار اختراع کیا گیا ہے کہ ایک فن کے اعتبار سے بلا شبہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن چونکہ اصلیت اور حقیقت دیکھنے کے لیے بہت سی کڑیاں ہیں جن میں خود کافی تضادات موجود ہیں؛ ان تمام جعلسازیوں کی تردید کا سامان بھی موجود ہے۔

روایت ہے تو دوسری باب میں مگر یوں ہے کہ ابن زیاد نے جو آدمی حضرت حسینؓ کا سر لیکر دمشق بھیجا تھا اور انس سے کہا کہ جا کر یہ کہانی سنا ان کی کہ حسینؓ اور انکے ساتھی ہمارے سامنے دیکھے گئے جیسے شکاری کے سامنے کبوتر تھی کہ خدا کی مدد سے انکا کام کردیا گیا۔ اس میں آگے مزید یہ اضافہ بھی تھے کہ اب وہاں ان کے جسم بے لباس پڑے ہیں خون آلود چہرے خاک آلود۔

دوسری روایت اس کے بعد بتاتی ہے:

فدمعت عین یزید وقال قد کنت	یہ سن کر یزید کی آنکھیں بھر آئیں اور کہا کہ میں
ارضی بطاعتکم بدون قتل	بغیر قتل حسینؓ کے بھی تمہاری اطاعت سے خوش تھا
الحسین لعن الله ابن سمیة اما	خدا ابن سمیہ[1] پر لعنت کرے بخدا اگر
والله لو انی صاحبه فعفوت عنه	میں اسکی جگہ ہوتا تو حسینؓ سے درگزر کرتا
فرحم الله الحسین ولم یصله	اللہ حسینؓ پر رحمت کرے اور
بشیء۔	اور انکو کوئی انعام بھی نہ دیا جس کا وہ مستحق تھا

اس کے بعد راوی مزید بیان اس بارے میں دیتا ہے کہ ابن زیاد نے حضرت حسینؓ کے اہل خانہ کو بھی دو آدمیوں کی تحویل میں امیر یزید کے پاس ارسال کیا تھا ان دو میں ایک کا نام محفز بن ثعلبہ تھا۔ اس محفز نے محل کے دروازے پر آکر آواز لگائی:

هذا محفز بن ثعلبة اتی	یہ محفز بن ثعلبہ ہے لایا ہوں

---

[1] ابن سمیہ تو ابن زیاد کے باپ زیاد کو کہا جاتا تھا مگر یہاں ابن زیاد کے لیے کیوں استعمال ہوا

بالشام الفجرة۔ دیوث اکبر رسالۃ الشیٔ لے کر آیا ہے۔

زینب نے اس کے جواب میں کہا کہ۔

ما ولدت اُم محمد شر الانام محمد کی ماں نے اس سے بدتر اور

(بیت ۱۶) اس سے بدتر لئیم نہیں جنا۔

ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ روایت ضرور صحیح ہے لیکن یہ ضرور کہا جائے گا کہ اس روایت کی موجودگی ان روایتوں کو مشکوک ضرور بنا دیتی ہے جن میں یزید کے اس رویے کے برعکس رویہ دکھایا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا جائے گا کہ جو مزاج جو طبیعت اور جو ماحول یزید کیلئے علی الوقت ثابت ہے وہ ان کا خاصا نمونہ ہیں اور حضرت حسینؓ کے [illegible] اور حرم سادات کی عفیفہ خواتین شہادت کربلا کے واقعہ شہادت کے [illegible] کیلئے [illegible] ہے جن کا کچھ بیان اس کتاب کے بعض گزشتہ ابواب میں بھی ہوا ہے، یہ طبیعت اور یہ [illegible] میں بہرحال اپنا وزن اس روایت کے ساتھ ایسی روایتوں کے پلڑے میں ڈالتی ہیں۔

حضرت محمد الباقر کی روایت اور یہ قصے؟

ہم نے حضرت محمد الباقر کی روایت کا ابتدائی حصہ اگرچہ گزشتہ صفحات میں [illegible] شہادت تک کا حصہ نقل بھی کیا ہے۔ اس حصے کے بعد اس روایت میں بھی مابعد شہادت واقعہ ابن زیاد اور یزید سے متعلق آیا ہے ضروری ہے کہ اس گفتگو میں اس کو بھی سامنے لایا جائے۔

اس روایت کو ہم نے شہادت حضرت حسینؓ تک نقل کیا تھا اس کے آگے اس روایت میں ہے کہ آپ کو قبیلہ مذحج کے ایک آدمی نے قتل کیا تھا پھر اس نے سر کو تن سے جدا کیا اور

---

[۱] بیت کے معانی تھے اس سے بدتر نہیں کہا گیا ہے عربی الفاظ میں لئیم کا لفظ ہے [illegible] شر الانام [illegible] بجائے [illegible] اس شعر میں یوں آیا ہے "الام واحسن" ۳۶ ص۳۱۱۔

پھر جب حضرت زینب کے پاس گئیں اور شام کا ماتم ہوا۔ ابن زیاد نے یزید کے پاس بھیج دیا۔
یزید کے سامنے لا کر رکھا گیا تو وہ آپ کے منہ پر چھڑی سے ٹھوکے دیتے ہوئے ایک شعر پڑھنے
لگا جس کا مطلب یہ ہے کہ حسین نے اس حق کا پاس نہ کیا حق شناسی ہی کی تھی جو ہمارا ان پر تھا
کہ حضرت ابو برزہ اسلمی صحابی موجود تھے انہوں نے کہا کہ چھڑی ہٹا لو میں نے رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کو اس منہ کو چومتے دیکھا ہے جس منہ پر تم چھڑی مار رہے ہو۔ بعد ازاں حضرت حسینؓ کے اہل خانہ
بھی کوفہ سے دمشق بھیج دیئے گئے۔ اس موقع پر یزید نے اپنے محل میں اہل شام کو جمع کیا
جس میں ایک شخص نے فاطمہ بنت حسین کی طرف جو گوری رنگ کی لڑکی تھی یزید سے کہا امیر المؤمنین یہ لڑکی مجھے
بخش دیجئے۔ حضرت زینبؓ نے تڑپ کر کہا ایسی بات کسی شخص کو روا نہیں ہے۔ یہ کوئی کیسے کہہ سکتا
ہے اس نے ایسی بات کہی تو پھر یزید نے بالکل انکار کر دیا (ملخصاً) اور پھر ان لوگوں کو
اپنے گھر میں بھیجا۔ سامان اکٹھے کیے ایصال و عنایت کیا کہ کوچ مدینہ کی جانب
گیا۔ اس روایت کا بیان ہی بتا رہا ہے کہ کتنا عقل کے خلاف ہے جس کو ہم کہتے ہیں
کہ اسی طرح کی دوسری حکایات کا ذکر کر کے صحابہ حضرت ... طبری ... کتاب البرزخ مختصر بیان کیا ہے بری
سر پر چھڑی لگانے والی بات کہی ہے سو اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ پہلے تو
یہ کہ یزید سے حضرت حسینؓ کے سر اقدس کی توقع نہیں کی جا سکتی دوسرے یہ کہ ایک صحابی نے
یزید کو بالکل منہ پر چھڑی سے منع کیا تھا شکایت کا واقعہ ہے۔ اور پھر یہ
بھی کہ روایت کس حد تک ہے طور پر الحاق کی نشانیاں موجود ہیں۔ ہے۔

ا۔ یہ روایت کہتی ہے کہ قاتل نے سر آپ کے تن سے جدا کیا اور سیدھا لے کر ابن زیاد کے پاس پہنچ
گیا حالانکہ اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا کہ فوج کا سالار لشکر ابن سعد کے ہوتے ہوئے کوئی شخص
یہ کام بالا ہی بالا دور کر دے۔

۲۔ یہ شعر بھی اس روایت میں اسی شخص کی زبان سے ابن زیاد کے سامنے کہلوائے گئے ہیں

ف طبری ۲۵ صفحہ ۲۲

جن کا ترجمہ ہے

"حضور والا میری سواری کو سونے اور چاندی سے لاد دیجئے۔ اس لیے کہ میں نے ایک شاہ ذی شان کو قتل کیا ہے۔

میں نے اس کو قتل کیا ہے جو اپنے حسب و نسب ماں باپ کے اعتبار سے سب سے اچھا ہے"

لیکن یہاں شعر پڑھتا ہوا قاتل ہمیں ایک مصری روایت میں کربلا کے میدان میں عمر بن سعد کے خیمے پر ہی کھڑا پایا گیا ہے۔ اور پھر اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ عمر بن سعد نے سنا تو کہا۔

"واللہ تو دیوانہ ہے لاؤ اس کو میرے اندر۔ چنانچہ اندر لیا گیا تو چھڑی سے اس کی پٹائی کی۔ اور کہا اے مجنوں تو ایسی باتیں منہ سے نکال رہا ہے، ابن زیاد نے اگر سن لیا تو تیری گردن مار دے گا"

عمر بن سعد کے خیمے پر یہی الفاظ یہ شعر پڑھے گئے تھے یا نہیں، یہ الگ بات ہے لیکن یہ بات ہے کہ قاتل سرِ حسینؓ کو بالا بالا ابن زیاد کے پاس لے گیا ہو اور اس امکان احتمال کی صداقت کا ہو یہ بات زیادہ سمجھ میں آنے والی ہے کہ روایت نگار نے لشکر کے عمر بن سعد والے لشکر کے خیمے پر کھڑا ہوا اور وہ انعام کا طالب ہوا ہو۔

بہرحال کچھ بھی ہو۔ ایک روایت کے مطابق یہ شعر قاتل نے میدان کربلا میں ابن سعد کے خیمے پر پڑھے تھے۔ اب اگر بعد میں یہی قصہ کوئی ابن زیاد سے متعلق کر کے سناتا ہے تو صاف ظاہر ہے یہ کسی گڑبڑ کا شاخسانہ ہے اور وہ بھی بہت اُلٹ پلٹ قسم کی گڑبڑ۔ اور پھر اس قسم کی گڑبڑ کے نتیجے میں بالکل قرین قیاس نظر آتا ہے کہ یزید کی طرف چھڑی سے ہونٹ چھونے" کی نسبت بھی اسی نوعیت کی چیز ہو۔ یعنی یہ کہ واقعہ تو ابن زیاد کا تھا جیسے کہ دو روایتوں میں آ چکا ہے۔ مگر حافظہ کی گڑبڑ یا ارادے کی گڑبڑ سے کسی راوی نے یزید کے سر لگا دیا۔ یاد رہے کہ ابن زیاد کے بارے میں ہم اپنی رائے کا اظہار کر چکے ہیں کہ ایسے واقعہ کا

سلہ طبری جلد ۶ صـ ۲۶۱

بہرحال یہ قرین قیاس اگرچہ ہرگز نہیں ہے لیکن جب ایک روایت "ٹہوکا دینے" کے بجائے امداد کرنے کی موجود ہے تو کم از کم شک کا فائدہ ابن زیاد کو پہنچنے سے ہم نہیں روک سکتے۔ خواہ وہ قتل حسینؓ کی اصل ذمہ داری کے لحاظ سے ہمیں کتنا ہی مبغوض ہو۔

خواتین خانوادۂ نبوت کے ساتھ اور صاحبزادہ علی بن الحسینؓ کے ساتھ رنج رسانی اور سخت کلامی وغیرہ کی روایتیں، طبری میں بھی آتی ہیں اور دوسری کتابوں میں بھی لیکن ان سب کے بارے میں ہم اپنے آپ کو یہی کہنے کے لیے مجبور پاتے ہیں کہ جب ان روایتوں سے بالکل مختلف صورت بتانے والی روایتیں بھی موجود ہیں جو ابھی ہمارے سامنے گذریں تو کوئی جواز نہیں کہ ہم ان لاریب بدسلوکی کا سلسلہ دکھانے والی روایتیں قبول کر لیں اور یہی ہوا ہے کہ یزید نے اس قافلے کو بیت سے لاکر نہایت احترام کے ساتھ ایسے لوگوں کی معیت میں مدینے روانہ کیا تھا جن کے احترام اور حفظ قرابت کے رویے سے اہل قافلہ نہایت خوش اور شکر گزار ہوئے تھے۔ اور پھر حضرت امیر اس خاندان کے ساتھ مخصوص مراعات اور حسن سلوک کا رویہ رہا جس کی تفصیلات میں جانے کی شاید ضرورت نہیں اور پھر یہی رویہ اس خانوادۂ نبوت کا بھی حضرت یزید کے ساتھ رہا۔ مگر اسکو کیا کہا جائے کہ ان سارے حقائق کے باوجود ان گھڑنت روایتوں کے پروپیگنڈے سے بنائی ہوئی ذہنیت باقی ہے ہم میں لوگ ہیں جو یہاں تک تسلیم کرنے پر تلے ہوئے ہیں کہ کوفہ سے جب شہدائے کربلا کے سر اور بقیۃ السیف افراد کا قافلہ دمشق کے محل میں داخل ہوا اور یزید کی "خمار" نظریں اپنے محل کی بلندی سے اس پر پڑیں تو اس نے مستی میں آکر یہ کافرانہ شعر پڑھے۔

لما بدت تلک الحمول واشرفت   تلک الرؤس علی ربی جیرون

نعق الغراب فقلت نح او لا تنح   فلقد قضیت من النبی دیونی

ترجمہ۔ جب جیرون کے ٹیلوں پر کجاوے اور سر نمودار ہوئے تو کوے نے کائیں کائیں شروع کی

لہ تاریخ طبری ج ۶ ص ۲۶۶

میں نے کہا کہ تو بڑی بات بول رہا ہے [illegible] سے پہلا قرض چکایا یعنی جنگ بدر کا [illegible] کاش ہم ہو سکتے [illegible] حضرت حسینؓ کے سر [illegible] یزید کی طرف منسوب کئے گئے ہیں

امام ابن تیمیہ کا ارشاد

اس موقع پر امام ابن تیمیہؒ کی بات قابل ذکر نظر آتی ہے۔ اپنی مشہور کتاب منہاج السنہ[1] میں یزید کے لکھتے ہیں جس کا ترجمہ [illegible] صاحب پیش کر رہے ہیں:

"یزید کے سلسلے میں لوگوں کے تین گروہ ہیں، ایک کا اعتقاد ہے کہ یزید صحابی بلکہ خلفائے راشدین میں سے ہے یا بلکہ انبیاء میں سے کہ اس کے قتل سے [illegible] دوسرا گروہ کہتا ہے کہ وہ کافر اور باطن میں منافق تھا اس کے علاوہ وہ ہاشم اور اہل مدینہ سے اپنے ان کافر رشتہ داروں کا بدلہ لینے کا ارادہ رکھتا تھا جو جنگ بدر وغیرہ میں مسلمانوں کے ہاتھ سے مارے گئے تھے چنانچہ یہ لوگ کہتے اشعار اس کی دلیل میں [illegible] لیکن یہ دونوں قول ایسے غلط ہیں کہ ہر سمجھدار اس کا بطلان اندازہ کر سکتا ہے یزید حقیقت میں ایک مسلمان بادشاہ اور بادشاہوں اور خلفاء میں سے ایک خلیفہ تھا نہ وہ صحابی یا نبی تھا اور نہ ہی کافر و منافق۔"

حضرت حسینؓ اور یزید کے قصے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"ایک مجہول السند روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت حسینؓ کا سر یزید کے سامنے رکھا گیا اور اس نے آپ کے دندان کو اپنی چھڑی سے ٹھوکا دیا۔ یہ روایت صرف یہ کہ ازروئے سند ثابت نہیں ہے بلکہ اس کے متن ہی میں اس کے جھوٹ ہونے کا ثبوت ہے اس لئے کہ صحابہؓ کی موجودگی اس وقت یزید کے پاس بتائی گئی ہے جو کہ انہوں نے اس کی حرکت پر ٹوکا تھا (وہ شام میں نہیں عراق

---

[1] یہی اشعار یہی ہیں جو ابھی ہم نے نقل کئے۔

میں سمجھتے تھے۔ اور اس روایت کے برعکس متعدد لوگوں کی روایت یہ ہے کہ یزید نے قتلِ حسینؓ کا حکم دیا۔ اُن کا یہ مقصود تھا بلکہ وہ تو اپنے والد حضرت معاویہؓ کی وصیت کے مطابق آپ کا عزت و اکرام ہی پسند کرتا تھا۔ البتہ اس کی خواہش یہ تھی کہ آپ اس کی حکومت کے خلاف مقابلہ کرنے کے ارادے سے باز آئیں۔ چونکہ آخر میں یہی ہوا کہ لڑنے کے قریب پہنچ کر آپ نے اپنا ارادہ ختم کر دیا اور یزید کے پاس جانا یا کسی سرحد پر نکل جانے کی خواہش کی تھی۔ اس لیے جب یزید کو اس کے گورنر کے ذریعہ آپ کی شہادت کی خبر پہنچی تو اس کے لیے نہایت تکلیف دہ ہوئی۔ یزید نے اس وقت یہ تک کہا کہ خدا کی لعنت ہو ابن مرجانہ (ابن زیاد) پر۔ اس کی اگر حضرت حسینؓ سے رشتہ داری ہوتی تو وہ کبھی ایسی حرکت نہ کرتا۔ یزید نے آپ کے اہلِ خاندان کے لئے نہایت اچھی دلداری کا سامان کیا اور ان کو مدینہ بھجوا دیا اور اس سے پہلے خیر گیری بھی کی حتی کہ اپنا بہترین دسترخوان ان کے پاس رکھا۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ اس نے حسینؓ کے قاتلوں سے بدلہ نہیں لیا۔

اسی طرح جو روایتیں بیان کی جاتی ہیں کہ حضرت حسینؓ کے گھرانے کی خواتین کو یزید کے سامنے ننگے سر پیش کیا گیا تو یہ اتنا غلط ہے کہ مسلمانوں نے کبھی کسی ہاشمی خاتون کو باندی نہیں بنایا۔ اسلام اُمتِ مسلمہ کو کیا خود بنی اُمیہ میں ہاشمی خواتین کی تعظیم کا یہ حال تھا کہ حجاج بن یوسف نے جو قریشی نہیں تھا حضرت عبداللہ بن جعفر کی بیٹی سے شادی کر لی تھی تو عبدالملک بن مروان اس قدر برہم ہوا کہ ان دونوں کی علیحدگی کرا دی۔[1]

* * *

---

[1] انتخاب و تلخیص از منہاج السنۃ ص ۲۴۱ تا ۲۴۸

باب دوازدہم

وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا

ایک نوشتۂ تقدیر تھا جو پورا ہوا

کربلا کا یہ حادثۂ فاجعہ اسے بجز تقدیر الٰہی کے اور کیا کہا جائے؟ کرنی بھر

یہ آنے والی بات ہے کہ اہل تحقیق اور اہل بحث جن میں وقت کے بزرگ ترین اکابر اہل علم و فضل بھی ہیں، آپ ایک زبان ہو کر سمجھائیں کہ عراق کا قصد نہ کیجئے۔ یہ غداروں اور دھوکہ بازوں کی سرزمین ہے، یہ تیغ توڑ پھوڑ جانے والوں کی سرزمین ہے، اور ان آزمائے گئے ناکاروں کی سرزمین ہے جنہوں نے آپ کے والد ماجد کو رلایا اور آپ کے بھائی کو بھی دھوکہ دیا جانے والا تجربہ کرایا۔ مگر ساری فہمائشیں دھری کی دھری رہ جائیں۔ نہ محمد بن حنفیہ جیسے جان نثار بھائی کی خیرخواہانہ اور مخلصانہ گفتگو کام آئے۔ نہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی بزرگانہ اور محبانہ فہمائش۔ نہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت ابوبکر بن عبدالرحمن بن حارث کا مخلصانہ مشورہ سلجھا سکا اور نہ حضرت عبداللہ بن مطیع کا فدویانہ مشورہ دیا۔ نہ حضرت ابو سعید خدریؓ، حضرت واثلہ بن واقد اللیثی، حضرت مسور بن مخرمہ اور حضرت جابر بن عبداللہ کا اپنے اپنے انداز سے فیصلہ بدلوانے کی کوشش کرنا، حتی کہ وہ آخر میں حضرت عبداللہ بن جعفر کا پیچھے آکر آخری زور لگا لینا بھی اسی طرح بے کار جائے، جیسے کمان سے نکلے تیر کو واپس لانے کی کوشش بے سود ہوا کرتی ہو!

اور پھر جب وقت آتا ہے کہ آپ حضرت حسینؑ سفر کے آخری مرحلے میں اُس مہم سے دستکشی کا فیصلہ فرما لیتے ہیں جس مہم کے لیے سفر اختیار فرمایا گیا تھا تو مقصد سے اپنی بیعت ہی کے اعلان سے اور عبیداللہ بن زیاد جس کو بظاہر بڑی خوشی کے ساتھ آپ کی تین باتوں سے یزید کے پاس جاؤں والی بات قبول کر لینی چاہیے تھی کیونکہ مقصد ہے وہ جاتا اور بیعت ہو جاتی یہی ان کی خواہش تھی۔ مگر بالکل خلاف قیاس ہوا کہ ابن زیاد نے آپ کی تینوں باتوں کو یکسر طور پر رد کر دیا اور پہلے کی طرح ضد کی وہ شمر الجوشن کی معاونت اور امیر یزید کی شکل میں بے جگری بنی ــــ آخر اسے تقدیر الٰہی کے سوا اور کیا کہا جائے!

ثعلبیہ کی منزل پر جب کہ پہلے سفیر اور سفیر مسلم بن عقیل کی کوفے میں گرفتاری اور انجام کی خبر ملی اور ساری امیدوں کی بنا ٹوٹتی ہوئی نظر آئی جس کی بنیاد پر آپ نے سفر شروع کیا تھا تو وہ پہلا وقت تھا کہ آپ کو دفعتاً عورتوں اور بچوں کے خیال سے سفر ترک کر کے واپس چلے جانے کا خیال ہوا۔ اور یہ ایک مناسب وقت تھا کیونکہ کوفہ ابھی کچھ دور تھا۔ اور اُن مخلصین کی خواہشوں، گزارشوں اور مشوروں کے پیش نظر جو اس سفر سے مانع ہو رہے تھے۔ اور ان تجربات کے پیش نظر جو حضرت علیؓ اور حضرت حسنؓ کو اہل کوفہ سے ہو چکے تھے اور جب کہ خود مسلم بن عقیل کے خط کے پیش نظر جو انہوں نے اپنی گرفتاری پر اہل کوفہ کی بزدلی اور غداری کے حوالے سے حضرت حسینؓ کو اس مقصد سے لکھا تھا کہ وہ سفر ترک کر کے پیچھے پلٹ جائیں۔ ان سب باتوں کے پیش نظر آپ کا بھی واپسی کے خیال سے متاثر ہو جانا ہی تھا مگر جیسے کوئی بات ہو کر رہتی ہو اور کسی جوش و خروش سے برادران مسلم بن عقیل بول اٹھے کہ نہیں اب پیچھے نہیں لوٹا جا سکتا ہم اپنے بھائی کا بدلہ لیں گے یا اپنی جان بھی دے دیں گے ظاہر بات ہے کہ اس صورت حال میں حضرت حسینؓ کے لیے ممکن نہ تھا کہ واپسی پر اصرار فرماتے اکیلے واپسی کا خیال ترک کر کے معاملہ قدرت پر چھوڑ دینا پڑا اور پھر تقدیر کا لکھا پورا ہو گیا۔

اور پھر جب قادسیہ کے قریب پہنچ کر حر مل گئے کہ حالات کی خبریں سنا کر بجائے آگے کی

یا تصوری شکل بصورت ہی سامنے آجائے لہٰذا اس موقع پر بھی بلا شبہ بھی غالباً اپنے جذبات کے تلاطم سے نکل آئے۔ تو یہ بالکل ایسی صورت تھی کہ خیال پر عمل کرنا تو ممکن نہیں رہا تھا مگر آپ نے کوفے کی سمت سے پھر عمل ہٹ جانے کے لیے ایک غیر معمولی فیصلہ فرمایا۔ یہ فیصلہ تھا یزید کے پاس دمشق چلے جانے کا!

بلاشبہ یہ ایک غیر معمولی فیصلہ تھا، یہ ایک انقلاب لا سکتا تھا۔ روایت میں صراحت ہے کہ آپ نے یہ فیصلہ یزید کے ہاتھ میں ہاتھ دینے "فیضع یدہ فی یدہ" کے لیے کیا تھا اور صراحت کی گئی ہے کہ جب بھی جن حالات میں آپ یزید کے پاس جا رہے تھے، اُن حالات میں آپ کے وہاں جانے کے کوئی دوسرے معنی نہیں ہوتے۔[1] پس ابن زیاد کو بصد حسرت یہ بات قبول کر لینی تھی کہ آپ یزید کے پاس تشریف لے جائیں۔ حضرت حسینؓ اور خود یزید کے پاس جانے کا ارادہ فرما رہے ہیں! اس سے زیادہ کسی کو کیا چاہیے! زیادہ سے زیادہ اس کا اطمینان کر لیا جاتا کہ آپ واقعی وہیں جائیں گے اور کہیں نہیں چلے جائیں گے، اس کے لیے ابن زیاد اپنا ایک دستہ ساتھ میں کر سکتا تھا۔ بلکہ بعض روایات کے مطابق تو آپ نے عمر بن سعد سے فرمایا بھی یہی تھا کہ،

وانا اتيت هذا المسير في الی	(اگر میری بات منظور نہیں ہے تو مجھے
یزید بدمشق[2]	یزید کے پاس دمشق چلے جانے دیجئے بلکہ بھیجئے)

یزید کے پاس آپ کا اس دستہ کے ساتھ جانا گویا اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دینا ہی تھا۔ تعجب وقت کے تمام اسباب سے قطع نظر ان شواہد کی بنا پر سوائے اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ یزید آپ کا اکرام کرتا اور ہر ممکن طریقے سے اس بات کی کوشش کرتا کہ آپ کی اس کے ساتھ کشیدگی جاتی رہے۔ وہ کیا شکل ہوتی؟ یہ ہم نہیں کہہ سکتے۔ لیکن اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ حضرت معاویہؓ کی وصیت کے مطابق انہی کے نقش قدم پر صلح حسنؓ جیسا کوئی باب یزید اور حضرت حسینؓ کے درمیان بھی ضرور رقم ہوتا۔ مگر قیاس و گمان کے تمام تقاضوں کے

---

[1] یہ گمان خاص حالات سے قطع نظر بھی اس لیے ہے کہ ہم لوگ ان سب کے معانی اور معنی کی تعبیر میں منظور کا اشارہ سے بھی ہو سکتا ہے "ید بیعت" ہی کہا جا سکتا ہے۔ [2] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۷۰

برعکس ابن زیاد کو آپ کی پیش کش قبول نہ ہوئی اور اسے وہی کرنا پڑا جو کاتب تقدیر کے ہاتھ سے رقم ہو چکا تھا وہ وجود میں آ کر رہا۔

نوشتۂ تقدیر کا راز ؟

اس تقدیر کا راز اور اس کی حکمت کیا ہو سکتی ہے جو ایک الم انگیز واقعہ کے لیے راہ بناتی آ رہی تھی؟ سوال کافی سخت ہے۔ مگر امام ابن تیمیہؒ کے یہاں اس کا ایک جواب ملتا ہے جو ہے تو قیاس و گمان ہی کی بات مگر امام موصوف نے بڑے اعتماد کے ساتھ پیش کیا ہے فرماتے ہیں :۔

> "حسینؓ کا قتل بلا شبہ مظلومانہ قتل ہے جو اللہ کے ہاں ان کی شہادت، علو منزلت اور رفع درجت ہے اور وہ اس کا اہل ہے کہ انہیں اور ان کے بھائی کیلئے اللہ کے یہاں سعادت اور نیک بختی کا وہ مقدر مرتبہ طے ہو چکا تھا جس کیلئے کسی نہ کسی طرح کی بلا و مصیبت سے گزرنا لازم ہے۔ مگر ان دونوں کو اپنے دوسرے اہلبیت کی طرح سے اس کے مواقع اس لیے حاصل نہ ہو سکے تھے کہ ان کی زندگی اسلام اور عزت و عافیت کی گود میں بسر ہوئی تھی۔ پس ایک بھائی کی وفات زہر خورانی سے ہوئی اور دوسرے کی قتل سے تاکہ اس مصیبت کے بدلے میں وہ شہداء کا عیش اور سعداء کی منزلت پا سکیں[1]۔"

گویا حضرت حسینؓ کا کوفہ کی جانب نکلنے والا سفر ہو یا ابن زیاد کا اس سے بھی زیادہ ناقابل فہم رویہ، دونوں تقدیر الٰہی کے ایک منصوبے کا کرشمہ تھے جو پہلے سے طے ہو چکا تھا۔

حضرت حسینؓ کا اقدام اور ابن تیمیہؒ

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ابن تیمیہؒ حضرت حسینؓ کے لیے اس علو منزلت کے

---

[1] منہاج السنہ ج ۲ ص ۲۴۱

قائل ہونے کے باوجود جو اُن کے مذکورہ بالا بیان میں نظر آتی ہے آپ کے اس اقدام کی صحت کے قائل نہیں ہیں جس کے نتیجے میں شہادت کا مرتبہ آپ نے پایا، فرماتے ہیں کہ :-

"یہ بات جان لینی چاہیے کہ صحابہ کرام کا طبقہ ہو یا تابعین عظام کا یا بعد کے اولیاء اہل بیت یا غیر اہل بیت کا، ان میں سے جو بڑے اہل علم و دین ہیں ان سے بعض وقت ایسی روایت کا اجتہاد سرزد ہو جاتا ہے جس کے ساتھ کچھ ظن اور وہم اور کبھی کبھی ایک قسم کی ہوائے نفس شامل ہو جاتی ہے، ایسا اجتہاد اس شخصیت کی عظمت کے باوجود قابل اتباع نہیں ہوتا، لیکن جب کبھی ایسی بات پیش آ جاتی ہے تو دو قسم کے انسانوں کے لیے فتنہ بن جاتی ہے جو لوگ اس شخص کی عظمت کے قائل ہوتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ اس کے اس خاص فعل کو بھی صحیح اور قابل اتباع قرار دیا جائے، جو لوگ اسے ناپسند کرنے والے ہوتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ ایک اجتہادی فعل کی بدولت اسے ولایت و تقویٰ کے مرتبے ہی سے نہیں بلکہ جنت اور اہل ایمان کے زمرے سے بھی خارج کر دیں[1]۔"

کیوں وہ اس اقدام کی صحت کے قائل نہیں ہیں؟ منہاج السنۃ کی اسی بحث میں جو بحث سے علاوہ جس کے دو اقتباس پیچھے دیے گئے ہیں، ہمیں اس سوال کا یہ جواب ملتا ہے :-

"حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت انسانوں کی معاش و معاد (دنیوی اور اخروی زندگی) کی اصلاح کے لیے ہوئی تھی، آپ نے ہر اس بات کا حکم دیا جس میں مصلحت راجح ہے اور ہر اس بات سے منع فرمایا جس میں فساد راجح اور برائی ہے پس ایسا کوئی کام اگر سامنے آتا ہے جس میں صلاح و فساد دونوں پہلو پائے جاتے ہیں تو اہل سنت یہ دیکھتے ہیں کہ فساد کا پہلو غالب ہے یا صلاح کا؟ اور جو پہلو غالب نظر آتا ہے اسی کے مطابق اس کام پر حکم لگاتے ہیں، صلاح اور فلاح کا پہلو

---

[1] منہاج السنۃ ج ۲ ص ۲۱۹

غالب ہے تو اس کام کے کرنے کو ترجیح دیتے ہیں اور اگر خرابی کا پہلو غالب نظر آتا ہے تو اس کام کے ترک کو ترجیح دی جاتی ہے ۔

پس اب ایک یزید یا عبدالملک اور منصور جیسا کوئی شخص خلافت کے منصب پر فائز ہو جاتا ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا اس سے نااہل کر کے کسی بہتر شخص کو اُس کی جگہ لانے کی کوشش کی جائے ؟ اہل سنت اس کا جواب نفی میں دیتے ہیں کیونکہ ایسے شخص سے بہ نسبت بھلائی اور مصلحت کے بگاڑ اور فساد کے زیادہ امکانات ہمارے سامنے آ گئے ہیں تاریخ بتا رہی ہے کہ کسی صاحب سطوت و قوت شخص کے خلاف جب بھی خروج کیا گیا بالعموم اُس کا فائدہ بہت معمولی اور خرابی بہت زبردست ہوئی مثلاً عبداللہ بن مطیع اور اہل مدینہ نے یزید کے خلاف جو خروج کیا یا ابن الاشعث نے عبدالملک کے خلاف عراق میں کیا یا ابن مہلب نے اپنے چچا کے خلاف بغاوت کی یا ابو مسلم خراسانی نے بنی امیہ کے خلاف جو بغاوت برپا کی یا محمد نفس زکیہ نے منصور کے خلاف جیسا اور اس سے پہلے امام حسن ۔ ان سب میں بہت بڑی خونریزی کے سوا کچھ نہ ہوا ۔ ابو مسلم خراسانی جیتا بھی تو کیا نتیجہ اُس کی ہوا ؟ منصور کے ہاتھوں خود مارا گیا اور بیعت میں کس قدر خونریزی اُس نے روا رکھی ! اللہ کی پناہ ! الغرض ایسے لوگ

فلا اسلاما نصروا ولا اقاموا دنیا نہ دین ہی قائم کر سکے نہ دنیا ہی بچا سکے

حالانکہ اللہ تعالیٰ کسی ایسے کام کا حکم نہیں دیتا کہ جس میں نہ دین کی فلاح ہو نہ دنیا کی صلاح رہا ایسے کام اللہ کو پسند نہیں ہیں چاہے اُن کے کرنے والے کیسے ہی متقی بندے اور اصحاب جنت کیوں نہ ہوں ۔ دراصل یہ لوگ دیکھتے کہ اسلاف ایسے گئے ہیں علی، طلحہ، زبیر، عائشہ سے بڑھ کر کون ہیں جن کے تقویٰ اسلام ہونے اور جنت کی بشارت جنہیں حاصل ہونے کے باوجود جنگ کے تنازع میں پڑ جانے والے فعل کو قابل تعریف نہیں قرار دیا گیا !

مسلمانوں کے اکابر اہل علم سے جنہوں نے ان خروجوں کی مخالفت کی ہے مثلاً یزید کے خلاف اہل مدینہ خروج پر آمادہ ہوئے تو عبداللہ بن عمرؓ اور سعید بن مسیب اور علی بن حسین زین العابدین نے ان کو اس کام سے منع کیا۔ ابن الاشعث کی بغاوت کا فتنہ اٹھا تو حسن بصری اور مجاہد وغیرہ نے بھی [illegible] البتہ اہل سنت کا یہ مذہب بالکل طے شدہ ہے کہ فتنے کے اوقات میں [illegible] مناسب نہیں۔ علمائے اہل سنت نے اس مسلک کی [illegible] اہمیت بھی [illegible] عقائد کی فہرست میں داخل کر کے لازم کیا ہے کہ ظلم و [illegible] کے جور و ستم [illegible] کے خلاف صبر و برداشت سے کام لیا جائے حالانکہ وہ یہ جانتے تھے کہ کیسے کیسے جلیل القدر اہل علم اور اہل دین ان فتنوں کی لڑائیوں میں شریک ہو چکے ہیں۔ [illegible] اس مسئلے میں [illegible] حکم ثابت ہو چکا ہے اور جو کوئی بھی اس مسئلے کی احادیث پر غور کرے گا وہ [illegible] اس نتیجے پر پہنچے گا کہ احادیث کا حکم بہترین حکم ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جب حسینؓ نے عراق جانے کا ارادہ فرمایا تو اکابر اہل علم و دین مثلاً ابن عمرؓ، ابن عباسؓ، ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام نے اس ارادے کے خلاف مشورہ دیا۔ انہیں صاف نظر آ رہا تھا کہ اس کا انجام آپ کی جان کا گزند پہنچنے کے سوا [illegible] یہاں تک کہ جب آپ [illegible] تیار ہو گئے تو بعض نے کہا [illegible] کہ آپ کو اللہ کے سپرد کیا[1] اور بعض نے کہا کہ "اگر بدنام ہو جانے کا ڈر نہ ہوتا تو جی چاہتا تھا کہ آپ کو زبردستی روک لیں۔"

ان حضرات کا یہ کہنا [illegible] کسی وجہ سے نہیں تھا [illegible] مصلحت مسلمین کی مصلحت اسی میں تھی اور اللہ و رسول نے [illegible] کی رعایت اور مفاسد سے بچنے ہی کا حکم دیا ہے [illegible]

---

[1] استودعک اللہ من قتیل۔

کا اندیشہ تھا کہ دین یا دنیا کی کوئی مصلحت تو اس خطے سے کسی کو حاصل نہ ہو سکی۔ البتہ یہ کہ کچھ ہی ظالموں کو بعد والوں پر غلبہ مل گیا اور ان کو شہید کر ڈالا۔ کاش وہ اپنے شہر ہی میں رہتے تو وہ فساد لازم نہ آتا جو ان کے خروج اور قتل سے رونما ہوا۔

فإن ما قصده من تحصيل الخير	اصلاح کی جو آپ کے پیش نظر تھی یعنی تحصیل خیر اور
ودفع الشر لم يحصل منه شيء بل	دفع شر کا ان دونوں میں سے کچھ بھی حاصل نہ
زاد الشر بخروجه وقتله ونقص	ہوا۔ اس کے بجائے اس خروج اور پھر
الخير به وصار سببا لشر	قتل سے شر بڑھا اور خیر کم ہوا اور یہ
عظيم وكان قتل الحسين مما	قتل ایک شرِ عظیم کا سبب بن گیا یعنی قتل
أوجب الفتن كما كان قتل عثمان	حسینؓ ان فتنوں کا موجب بن گیا
مما أوجب الفتن.	جیسے قتل عثمانؓ سے فتنے اٹھے تھے۔

"یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حسنؓ کے لیے بطور تعریف فرمایا تھا کہ "میرا یہ بیٹا سردار ہے، زمانہ آئے گا کہ اس کے ذریعہ اللہ مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرائے گا" لیکن کسی کی بھی تعریف آپ نے اس کے لیے نہیں فرمائی کہ وہ حالت فتنہ میں تلوار اٹھائے گا۔ یا کسی امام جائر پر خروج کرے گا اس کی سرداری ماننے سے انکار کرے گا بلکہ خوارج کے سلسلے میں خود آپ نے صاف ارشاد فرمایا تھا کہ ایک جماعت مسلمانوں میں رونما ہو گی جس سے ضرور قتال کیا جائے۔ چنانچہ جب علی رضی اللہ نے قتال خوارج کیا تو وہی صحابہؓ جو جمل اور صفین کے قتال میں آپ کے ہمنوا نہیں تھے اس قتال میں سب کے سب متفق ہو گئے۔ اسی طرح سب کے اہل علم نے بھی ان دونوں قتالوں میں فرق کیا۔"[ل]

[ل] منہاج السنہ جلد ۲ ص ۲۴۲ تا ص ۲۴۵ سے تلخیص و انتخاب۔

ظلم کی ذمہ داری کس پر؟

امام ابن تیمیہؒ کی یہ بحث کہ حضرت حسینؓ کا یہ اقدام جس کے نتیجے میں آپ کی مظلومانہ شہادت ہوئی کس شرعی نقطہ نظر سے کیا حیثیت رکھتا تھا؟ اور کیوں درست تھا؟ یہاں یک گونہ ذکر کی جانے والی بحث تھی۔ ہمارے موضوع کا اس شرعی بحث سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ خالص شہادت کی بات کی تھی کہ اس کو جان لینے کے بعد جو مسئلہ بھی طے ہو جانے والا ہے وہ یہ ہے کہ اس ظلم کی ذمہ داری کس پر ہے؟ یزید پر یا ابن زیاد پر؟

تاریخی شواہد اس کا جو نقشہ پیش کرتے ہیں وہ کسی طرح اس کی اجازت نہیں دیتا کہ اس ظلم کی ذمہ داری یزید پر ڈالی جائے۔ بے شک ابن زیاد کے سپرد یہ کیا گیا تھا کہ حضرت حسینؓ سے نپٹے اور کوفے میں ان کا داخلہ نہ ہونے دے۔ اس کے بعد اگر یہ بات صحیح مان لی جائے کہ حضرت حسینؓ نے اس اقدام سے قطع نظر کر کے جس کے لئے گھر سے نکلے تھے یزید کے پاس جا کر اپنا فیصلہ اس کے ہاتھ میں دینے کی پیشکش کر دی تب بے شک ابن زیاد کے حکم سے کی جانے والی جنگ کا روائی کی اصل ذمہ داری یزید ہی پر آتی مگر اس کا اطلاق یہ تبدیل شدہ صورت کہ ابن زیاد نے یزید سے رجوع کئے بغیر کاروائی کے ذریعے براہ راست شمر کے بھی برخلاف جو قتل و قتال کی کاروائی کرائی اس کی ذمہ داری یزید پر ڈالنا کیسے انصاف کی بات ہوگی۔ ہاں اگر یزید اس کاروائی سے اپنی رضا مندی اور خوشنودی کا اظہار کرتا تو بے شک پھر اسی کو اصل ذمہ دار قرار دیا جاتا۔ مگر اس بارے میں ہم گزشتہ باب میں مختلف روایتوں کا جائزہ لے کر دیکھ چکے ہیں کہ یزید کی کسی ایسی بات یا روایت کو منسوب کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے بلکہ مستند تاریخی شواہد کی روشنی میں جو صورتحال سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ یزید کی بے اطمینانی اور ناخوشی ظاہر کرتی ہیں۔ اور اسی بنا پر اس باب (ص ۲۳۲) کے پچھلے صفحات میں ہم لکھ کر آئے ہیں کہ

"یزید کے پاس آپ کا اس وعدے کے ساتھ جانا کہ اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیدیں، اس کا نیز وقت کے تمام دستیاب شواہد و قرائن کی روشنی میں سوائے اس کے کچھ نہیں ہوتا تھا کہ یزید آپ کا اکرام کرتا..... اور حضرت معاویہؓ کی وصیت کے مطابق انہی کے نقشِ قدم پر صلح حسنؓ جیسا کوئی باب یزید و حضرت حسینؓ کے درمیان بھی ضرور رقم ہوتا۔"

پس ہمارے خیال کے مطابق اس کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا کہ حضرت حسینؓ کی پیشکش کے بارے میں یزید سے رجوع کیا جاتا تو حالات نے زیاد کو اس سوچ اور اس کارروائی کی جانب بڑھا دیا جس کے نتیجے میں سانحہ کربلا پیش آیا۔

ابن زیاد کو سزا کیوں نہیں دی؟

یہ سوال جب کسی عام آدمی کی طرف سے سامنے آئے تو کوئی حیرت کی بات نہیں ہوتی۔ مگر جب پڑھے لکھے لوگ بھی یہ سوال اٹھاتے ہیں تو پھر حیرت ہوئے بغیر نہیں رہتی، اس لیے کہ ناراضمندی اور سزا دہی کا کوئی ایسا لازمی تعلق نہیں ہے کہ ایک حاکم نے اپنے ماتحت کی کسی بات کو ناپسند کیا ہو تو وہ اسے سزا بھی ضرور دے دے۔ بہت سی دفعہ ناخوشی کا اظہار بھی اس آدمی پر کرنا مناسب نہیں سمجھا جاتا ہے۔ اور اس کی کسی قابل لحاظ مثال ہمارے سامنے موجود ہے کہ حضرت علیؓ کی فوج میں بلکہ ان کے نہایت خاص معتمدین میں بھی وہ لوگ شامل تھے جو قاتلانِ عثمانؓ کے سرگروہ شمار کیے جاتے تھے اور خود حضرت علیؓ کو اس الزام سے انکار نہ تھا۔ مگر اس مطالبے کے جواب میں کہ ان کو سزا دی جائے یا ورثاءِ عثمانؓ کے سپرد کیا جائے حضرت علیؓ کو یہی کہنا پڑا کہ حالات اجازت نہیں دیتے۔ یعنی سزا کا مطالبہ کرنے والے بھی موجود تھے، اصولاً حضرت علیؓ کو مطالبے سے اتفاق بھی تھا پھر

کی مصالحِ وقت کا مسئلہ ایسا تھا کہ آپ اس پر عمل درآمد نہیں کر سکتے تھے۔ تو جب اگر ہم یزید کے پیچھے کوئی جداگانہ اصول نہیں بتاتے ہیں تب آسانی سے محسوس کر سکتے ہیں کہ:-

جس ابن زیاد نے یزید کے ہاتھ سے نکلتے ہوئے عراق کو نہ صرف بچا لیا تھا بلکہ جو طوفان وہاں یزید کے خلاف تیار ہو رہا تھا اس کا رخ اس نے تمام تر حضرت حسینؓ کے خلاف موڑ کے دکھا دیا، یزید کیلئے کیسے ممکن تھا کہ اس کا سر قلم کرنے کی بات سوچے؟

اور وہ بھی ایسی حالت میں! کہ کوئی مطالبہ کسی طرف سے ایسا نہیں ہے؟

اور

مزید براں! ایسی حالت میں کہ اس کے ذہن پر اس قسم کا کوئی تقاضہ بھی بظاہر نہیں ہو سکتا تھا؟

اس واقعہ سے رنج ہوا ہو اور افسوس ہوا ہو ایک الگ بات ہے، لیکن یزید اور حضرت حسینؓ کے تعلقات کی جو تاریخ تھی وہ یزید کے والد کے زمانے سے چلی آ رہی تھی اور جس کو ہم پچھلے ابواب میں دیکھ آئے ہیں، اس کے ہوتے ہوئے ایک خاندانی تعلق ہونے کے ناتے یہ توقع تو یزید سے کی جا سکتی تھی اور کی جانی چاہیے تھی کہ اسے واقعہ پر رنج و ملال ہو مگر اس سے آگے بڑھ کر یہ توقع تعلقات کے اس پس منظر میں کرنا کہ وہ ابن زیاد کی اس کارروائی کو ایک قابلِ سزا جرم سمجھے یہ تو ایک بہت ہی غیر فطری قسم کی توقع ہے۔ حضرت حسینؓ کی شخصیت تمام عظمت کے باوجود کسی کی بنا پر ہمیں یہ خیال ہوتا ہے کہ یزید اگر کربلا کے اس واقعہ سے خوش نہیں ہوا تھا تو ابن زیاد کو اس کی طرف سے کوئی سزا یا ملامت ہونی چاہیے تھی، ہم اس فطری حقیقت کو تسلیم کرنے سے قاصر

چونکہ سکے کہ جب سیاسی کشمکش کا پیچ آجاتا ہے تو پھر فریقین کے ذہن سے ایک دوسرے کی قابلیت اور فضیلتوں کا نقش مٹتا چلا جاتا ہے۔

حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔ کشمکش شروع ہوئی تو حضرت معاویہ کو پورا احساس تھا کہ اُن کی اور حضرت علیؓ کی کوئی برابری ہی نہیں ہے یا حضرت علیؓ نے اپنے خطوط میں انہیں اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی تو انہوں نے بے تامل اعتراف کیا کہ آپ بجا فرماتے ہیں۔

فما شرفك في الاسلام و قرابتك من رسول الله صلى الله عليه وسلم فلست ادفعه .	اسلام میں آپ کی بزرگی اور جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے آپ کی قرابت کا جہاں تک تعلق ہے اُس سے مجھے انکار نہیں۔

مگر جب اس کشمکش پر لمبا عرصہ گزر گیا اور تلخی بڑھتی چلی گئی تو پھر حضرت معاویہؓ کے رویے میں اس اعتراف اور احساس کی جھلک بھی نظر آنی بند ہونے لگی اور یہ بالکل فطری بات ہے تاہم ایسی خواہش کے ماتحت کسی جگہ پر ایک اصول فطرت کو ماننے سے انکار کریں تو یہ ہماری مرضی ہے۔ اصول اپنی جگہ اصول رہے گا۔ بہرحال ابن زیاد کو کوئی سزا دینا یا ملامت نہ کرنا، اس سے ہرگز یہ لازم نہیں آتا کہ یزید کو کوئی افسوس اور رنج بھی حضرت حسینؓ کی شہادت پر نہیں ہوا یا وہ خوش ہوا ہو، ہو وہ اس کی اپنی مرضی بھی فی الواقع پوری نہ ہوئی ہو جو ابن زیاد کے ہاتھوں ہو گیا۔

ابن زیاد کیوں لعنتی ہوا ؟

باب کے ابتدائی صفحات میں جو ہم نے لکھا کہ بظاہر تو ابن زیاد کو بہت خوشی سے اس بات پر راضی ہونا چاہیے تھا کہ حضرت حسینؓ اگر یزید کے پاس جانا چاہتے ہیں تو

مزدور چپکے جا بیٹھیں۔ لیکن واقعہ اس کے برعکس ہوا تو کہیں نہیں آتا کہ ایسے عجیب تدبیریں کے اندر کیا کیا جائے، جس میں کہ گویا حضرت حسینؑ کا قرب شہادت یا معاذ ہوچکا تھا۔ ہمارے اس لکھنے کا مقصد یہ نہیں تھا کہ یزید کے ذہن میں بھی اپنے اس رویے کی کوئی وجہ نہ رہی ہوگی اور یونہی تدبیری جبر سے وہ یہ کام کر بیٹھا ہوگا بے شک اس کے ذہن میں کوئی بات اور اپنے اس رویے کا جواز ہونا چاہیے۔ تو ہمیں اس کی تلاش ہے۔ اس تلاش میں کامیابی کی حسرت تو بے شک اتفاقیہ آسکی ہے۔ لیکن اس تلاش اور غور و فکر کے دوران میں بعض باتوں کی طرف نظر جاتی ہے جن کا یقیناً بہت کچھ دخل ابن زیاد کے اس رویے میں ہونا چاہیے۔

ا۔ اس نے اپنے باپ سے وراثت میں ایک سخت گیر منتظم (ADMINISTRATOR) کا مزاج پایا تھا۔ نظم و نسق اور استحکام کا قیام اور اُس کا تحفظ باپ کی طرح ابن زیاد کی نظر میں بھی ایک حاکم کا سب سے بڑا فریضہ اور سب سے بڑی نیکی تھی۔ اس کے باپ زیاد کو جب حضرت معاویہؓ نے بصرے کا حاکم مقرر کیا تو بصرے کے امن و امان کا حال اُس وقت بے حد خراب تھا۔ اس نے وہاں پہنچ کر ایک زبردست تقریر میں اپنی پالیسی کا بیان کیا۔ اس بیان کے ماتحت رات کو عشاء کے بعد سے صبح فجر تک باہر نکلنا ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ اور اس کی خلاف ورزی کی سزا قتل۔ ایک اعرابی یعنی جو شہر سے باہر کا آدمی تھا اس قصے سے بے خبر تھا۔ کسی کام سے بصرے آیا تھا۔ رات میں چلتا پھرتا پایا گیا۔ گرفتار ہوا اور زیاد کے پاس لایا گیا۔ اس نے اپنی صفائی دی۔ زیاد نے کہا میں سمجھتا ہوں کہ تیرا بیان سچا ہے تو بے خبر تھا۔ مگر نظم و نسق کا تقاضہ یہ ہے کہ میں تجھے بھی نہ چھوڑوں۔ چنانچہ قتل کر دیا گیا۔[1] یہ مزاج اور طبیعت ۲

---

[1] طبری ج ۲ ص ۱۲۶ یہ واقعہ کو بیان کر کے طبری لکھتے ہیں۔
" وہ پہلا حاکم تھا جس نے حکومت کی آواز کو قوت دی۔ معاویہؓ کے کاروبار کو تقویت دی"

اقتدار کا وارث تھا۔

۲۔ کوفے اور بصرے کے لوگ ہمیشہ اس قدر ناہنجار رہے تھے کہ ہر حکومت اور ہر حکمران اُن سے عاجز رہا۔ انتظام اور امن و امان کو اہمیت بلکہ ہر چیز پر فوقیت دینے والا آدمی ظاہر ہے کہ ایسے ماحول میں اور بھی زیادہ سخت گیر بلکہ سخت گیری کا ایک "عادی مجرم" بن جائے گا۔ کوئی سخت گیری اس کے لیے سخت گیری نہ رہ پائے گی۔ مسلم بن عقیل اور ان کے میزبان ہانی بن عروہ کے ساتھ جو سلوک اس نے کیا وہ یقیناً اسی قبیل کی چیز تھی۔ امن و امان اور قومی یکجہتی سے بڑھ کر کوئی چیز ان کے یہاں مقدس نہیں تھی۔ اس کو خطرے میں ڈالنے والے افعال اور اشخاص سے بڑھ کر کوئی فعل اور کوئی شخص ان کی نظر میں مبغوض نہ تھا۔

۳۔ حضرت حسینؓ اور یزید کے تعلقات کی ناخوشگوار تاریخ کے باوجود یزید کی طرف سے جس پاس و لحاظ کی توقع ہم مختلف وجوہ سے کرتے آرہے ہیں۔ وہ خود یہ کہ وہ ایک صحابی کا اور ایک بڑے خاندانی صحابی کا بیٹا تھا۔ نیز حضرت حسینؓ سے اُس کی خاندانی قرابت بھی تھی۔ اور پھر اس کے والد کی بڑی تاکید کی وصیت بھی حضرت حسینؓ کے ساتھ نرمی اور نیک حسن سلوک اور حق شناسی کی تھی۔ ۱

حاشیہ بر صفحہ گزشتہ ۱ اقتدار کو [illegible] کر [illegible]۔ یہ حضرت [illegible]
وہی [illegible] تلوار نیام سے باہر نکالی۔ [illegible] نتیجے میں سہولت ہوا [illegible] اس کی حکومت
میں لوگ اس حد [illegible] مخالف ہو گئے کہ ایک دوسرے کی شرارتوں سے [illegible]
ہو گئے۔ کسی کی کوئی چیز گر جاتی تو یہ سوال نہیں تھی کہ کوئی دوسرا اس کو ہاتھ
لگائے۔ حتیٰ کہ اس [illegible] اپنی چیز اُٹھا لیتا۔ عورتیں اپنے گھروں
میں بے کھٹکے دروازہ کھول کر سو سکتی تھیں۔ الغرض وہ سب [illegible] اس نے
کی کہ اس کی مثال نہیں دیکھی گئی . . . ۵ [illegible]

[illegible]

ان میں سے کوئی چیز ابن زیاد کے ساتھ نہیں پائی جاتی تھی۔ وہ ایک ساقط النسب آدمی کا بیٹا تھا۔ حضرت معاویہؓ نے اس (نسبی) سلسلے میں اُس پر اور اس کے باپ پر جو احسان کیا تھا اُس کا یہ اثر عین قرینِ قیاس ہے کہ آدمی کو بادشاہ سے زیادہ بادشاہ کا وفادار بنا دے۔ اور اس لیے قرینِ قیاس ہے کہ حضرت معاویہؓ اور یزید کے ساتھ ان باپ بیٹوں کی انتظامی سختی میں ان کے اپنے سخت گیر انتظامی مزاج کے علاوہ کچھ اس احسان مندی کا بھی دخل ہو، اور خاص طور سے وہ اشخاص ان کے لیے کسی بھی پاس و لحاظ کے مستحق نہ رہ جاتے ہوں جو ان حضرات کے اقتدار کو چیلنج کرتے ہوں۔

ان باتوں سے یہ عقدہ تو حل نہیں ہوتا کہ جب حضرت حسینؓ کی سہ گانہ پیش کش گویا پکار کر کہہ رہی تھی کہ اب کسی سے کوئی خطرہ محسوس کرنے کی ضرورت نہیں ہے تو پھر کون سی انتظامی مصلحت کا یا بادشاہ کی بادشاہ سے بھی زیادہ کون سی وفاداری کا تقاضا تھا کہ اس پیش کش کو قبول کرنے کی نرمی دکھانے کے بجائے وہی سختی دکھائی جائے جو عام عادت بن گئی تھی۔ مگر ان باتوں کی طرف توجہ سے عقدے کی سختی کچھ کم ہو جاتی ہے۔

آہ بے توفیقی!

بہر حال یہ بڑا ہی المناک حادثہ ہے کہ جب اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے لیے وہ جرأت آسان فرما دی جو بہت ہی شاذ و نادر اہلِ جرأت کو بھی نصیب ہوتی ہے کہ حالات کو یکسر بدلا ہوا دیکھ کر اُن کی مطابقت میں وہ فیصلہ فرمائیں جس میں وقت کی اصلاح و فلاح ہے نہ یہ کہ اُن بدلے ہوئے حالات میں ابھی آئین کا مسئلہ مقدم رکھیں، تب ابن زیاد کو یہ توفیق نہ ہو سکی کہ وہ

ملت کی صلاح و فلاح کے لیے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی اس عظیم جذباتی قربانی کی قدر جان لیتا اپنی بے جا ضد سے اس واقعہ کا ذمہ دار نہ بنتا جس نے عالم اسلام پر ایک بار پھر خونی فتنوں ہی کے دروازے نہیں کھول دیئے بلکہ عقائدی فتنوں کی دلدل میں بھی ایک نیا محاذ کھول دیا۔

اللّٰھم احفظنا من شرور انفسنا ومن
سیئات اعمالنا
وصلی اللّٰھم وسلم علی حبیبک ونبیک
سیدنا محمد وعلی آلہ واصحابہ
وازواجہ اجمعین

اختتامیہ

(کتاب کا خلاصہ اور کچھ توضیحات)

کتاب الحمدللہ مکمل ہو چکی ہے۔ اس کے اہم خلاصہ مباحث کو اگر ہم تھوڑے سے لفظوں میں سمیٹ کر بیان کرنا چاہیں تو یوں بیان کر سکتے ہیں کہ

۱۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت علی مرتضیٰؓ کی خلافت کے آغاز ہی سے مسلمانوں میں جو خانہ جنگی کی المناک صورت پیدا ہو گئی تھی، حضرت ﷺ کی پیشین گوئی کے مطابق اس کا خاتمہ حضرت علیؓ کے جانشین سیدنا حسن بن علیؓ کے ہاتھوں سے ہوا۔ اور وہ اس طرح کہ آپ نے خلافت کا معاملہ تمام تر حضرت معاویہؓ کے سپرد چھوڑ کر خود کو اس نزاع سے دستبردار کر لیا۔ یہ اسی صلح کی بات ہے جسے اسلامی تاریخ میں "عام الجماعہ" (جماعت و اتحاد کا سال) کہا گیا ہے۔

۲۔ حضرت حسنؓ کے چھوٹے بھائی حضرت حسینؓ اپنے بڑے بھائی کے اس فیصلہ سے متفق نہ تھے مگر جب حضرت حسنؓ کی طرف سے فیصلے پر عملدرآمد ہو گیا تب سے وہ بھی اس کے احترام کو لازم جانتے رہے اور ان دو حضرات حضرت معاویہؓ کے ساتھ تعلقات میں خوشگواری کی کیفیت بھی پیدا ہو گئی۔

۳۔ مصالحت اور خوشگواری کی یہ فضا چودہ سال تک باقی رہی۔ البتہ اس دوران میں حضرت حسنؓ نویں سال میں انتقال فرما گئے تھے۔ مگر سولہویں سال (۵۶ھ) میں حضرت امیر معاویہؓ نے جب اپنے بڑھاپے کے احساس سے اپنے بعد کے لئے کسی کو جانشین اور ولی عہد مقرر کرنے کے لئے سوچا اور اپنے بیٹے یزید کو اس کے لئے موزوں قرار دیا تو ازسرنو ایک اختلاف کی صورت پیدا ہو گئی۔ اختلاف کرنے والوں میں صرف حضرت حسینؓ ہی نہیں تھے بلکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بیٹے عبدالرحمن بن ابی بکر، حضرت عمر فاروقؓ کے بیٹے عبداللہ بن عمر، حضرت زبیر بن العوام کے بیٹے عبداللہ بن زبیرؓ بھی اس میں شامل تھے۔

۴۔ اس اختلاف کی سب سے اہم اصولی بنیاد یہ تھی کہ آپ اپنے بعد کے لئے بیٹے کو بطور ولی عہد خلافت نامزد کر رہے ہیں۔ اسلامی خلافت کا نہیں قیصر و کسریٰ کی سلطنت کا دستور ہے دوسری ایک بنیاد بظاہر یہ بھی تھی کہ اصحاب نبی ﷺ کی موجودگی میں کسی میں سے کوئی منصب خلافت کے لئے موزوں ہو سکتا تھا نہ کہ بعد میں پیدا ہونے والا ایک نوجوان۔ ان دو کے علاوہ ایک تیسری بنیاد جو اس سلسلے میں بہت مشہور ہے کہ اس اختلاف کی ایک اہم بنیاد یہ بھی تھی کہ یزید فاسق و فاجر ہے۔ یہ بات کہیں اس اختلاف کی بنیادوں میں آغاز تک نہیں پائی جاتی۔ محض تعصب و مخالفت کے طور پر بعد کی بات ہے۔ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ حضرت امیر معاویہؓ کا نقطۂ نظر ان حضرات کے بالمقابل بظاہر یہ تھا کہ خلافت کے سلسلے میں سب سے پہلو نظم و اتحاد مضبوط اسلامی ریاست اور مرکزیت ہے۔ اور اس مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے وہ یزید کی خلافت کی شکل میں امید رکھتے تھے کہ ادارۂ خلافت مضبوط رہے گا اور وہ افراتفری نہیں پھیلے گی جو حضرت عثمانؓ کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ مؤرخین نے اگرچہ یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ حضرت معاویہؓ کے اس فیصلے میں محبت پدری کا بھی دخل تھا مگر خود انہوں نے اس طرح کے کسی محرک سے اپنی برأت کا اظہار کیا ہے۔

۵۔ یہی اختلاف تھا جس سے واقعۂ کربلا کی بنیاد پڑی اور یہ خیال کہ اہل کوفہ تھے جنہوں نے اس اختلاف کا مقصد کربلا کے میدان سے ملا دیا تھا، یہی ہے۔ کوفہ والا گروہ، جو کہ حضرت علیؓ کا دور خلافت پا چکا تھا، سیاسی طور پر حضرت حسینؓ سے قریبی تعلق رکھتے رہے، وہ لوگ جو بلا وجہ رہے تھے۔ اس کے علاوہ عراق کے لوگوں کی ایک مستقل خصوصیت شورش پسندی اور ہنگامہ آرائی اور حکام سے چپقلش بھی تھی۔ اس کی وجہ مختلف گروہ ناچاہ... ان حالات میں بھی اہل عراق کا ایک بڑا طبقہ ان لوگوں کا بعضا چاہتا تھا کہ حضرت امیر معاویہؓ کے خلاف کوئی تحریک قائم ہو جائے گا خواہشمند ہو۔ مزید یہ کہ عبداللہ بن سبا یہودی منافق اور اس کے پیرو گروہ نے حضرت عثمانؓ کی خلافت کے دور سے اسلام میں ایک خفیہ گروہ بنا رکھا تھا جو مرکز خلافت سے بغاوت کر کے اسلام کی خدمت "اسلام" کی تھی۔ ان مقصد حوالوں کے تحت پہلے تو انہوں نے اولاً حضرت حسنؓ کی وفات کے بعد یہی چاہا تھا کہ حضرت حسینؓ کو امیر معاویہؓ کے خلاف تحریک کے لئے آمادہ کریں، مگر جس میں یہ ناکام رہے۔ اس کے بعد ولی عہدی کے مسئلہ میں اختلاف ہوا، ان لوگوں کی توقعات پھر سے زندہ ہو گئیں اور

حضرت حسینؓ سے رابطہ پیدا کرکے چاہا کہ اس مسئلے پر آپ کو حضرت معاویہؓ کے خلاف میدان میں اتار دیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اسلامی جمعیت کی حفاظت فرمائی اور ان کا یہ حربہ کارگر نہیں ہو سکا۔ البتہ اس ضمن میں یہ بات ضرور سامنے آ گئی کہ اس ولی عہدی کے مسئلے سے حضرت حسینؓ کی سوچ کا بھی بہرحال اس رخ پر لگا دیا ہے اور حضرت معاویہؓ کے بعد ٹکراؤ کی صورت پیش آ جانے کے قوی امکانات ہیں۔

۶۔ ولی عہدی کے مسئلے پر جو ایک روایت صحابہؓ سے حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کو ملزم ٹھہراتی جاتی ہے، کہ یزید کی ولیعہدی کی تجویز دراصل ان کے دماغ سے نکلی تھی اور صرف اپنے عہدہ (کوفہ کی گورنری) بچانے کے لئے انہوں نے یہ جانتے ہوئے کہ اس کا انجام ساری جمعیت کے لئے جاں کن ہو سکتا ہے، یہ تجویز دی تھی۔ اس روایت کی جانچ کی جاتی ہے تو یہ ایک خیالی کہانی سے زیادہ کچھ نہیں نکلتی۔ جبکہ حضرت مغیرہؓ خود قرآن پاک کی رو سے اعلیٰ درجے کے فضائل والے صحابی ہیں کہ کوئی مضبوط روایت بھی ہو تو ان آیتوں کے مقابلے میں اس روایت کو ردی میں پھینکنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ ہوگا۔

۷۔ حضرت معاویہؓ نے یزید کی ولیعہدی کے بارے میں مملکت کے ایک بڑے حصے کا رسمی (Formal) اعتماد حاصل کرکے اپنے فیصلے کو قطعیت کا درجہ دے دیا۔ مگر اس اعتماد کے دائرے میں مکے اور مدینے کی کمی رہی۔ تب آپ نے ایک سفر کیا تاکہ اس کمی کو (خاص کر مدینہ منورہ کے اعتماد کی) دور کیا جا سکے۔ جس کی نمائندگی عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ، عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن زبیرؓ اور حسین بن علیؓ کی طرف سے مخالفت کی شکل میں ہو رہی تھی۔

اس سفر کا اور وہاں ان چاروں حضرات سے ملاقات وغیرہ کا جو قصہ تاریخی روایات میں مذکور ہے اس کا بڑا حصہ نہایت مشکوک ہے اور چاروں بزرگوں کے نام کو بٹہ لگانے والا ہے۔ البتہ اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح ہوگا کہ ایک طرف تو یہ چاروں حضرات ـــــ بشرطیکہ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ بھی اس وقت زندہ رہے ہوں تو باقی تینوں حضرات ـــــ اپنے موقف پر قائم رہے اور دوسری طرف حضرت معاویہؓ بھی اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ یہ اختلاف ختم نہیں ہو سکے گا اور یزید کو اقتدار میں آنے پر اس مخالفت کا سامنا کرنا ہی ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی موت کا وقت آنے پر ان حضرات کے سلسلے میں یزید کو مناسب وصیتیں بھی فرمائیں جن میں حضرت حسینؓ سے نرمی خاص طور سے

حسن سلوک کی تاکید تھی۔

ولی عہد کی نامزدگی کے چند سال بعد (۶۰ھ میں) حضرت معاویہؓ نے انتقال فرمایا، یزید نے زمام خلافت ہاتھ میں لے کر حاکم مدینہ کو حکم بھیجا کہ وہ یہ بعد خاص کر حضرت عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، حسین بن علیؓ جنہوں نے ولی عہدی کی بیعت نہیں کی تھی، ان سے طلب خلافت کی بیعت لی جائے (چوتھے حضرت عبدالرحمن بن ابی بکرؓ کا اس وقت انتقال ہوچکا تھا) حاکم مدینہ نے مروان کے مشورے سے طے کیا کہ عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں تو کسی جلدی کی ضرورت نہیں ہے وہ مرد صوفی ہیں۔ البتہ باقی دونوں حضرات کے بارے میں عجلت اور سختی کی ضرورت ہے۔ مگر یہ دونوں حضرات بھانپ گئے کہ وہ اپنی حکمت عملی کی وجہ سے اس بیعت سے بچے اور مدینہ سے نکل کر مکہ پہنچ جانے میں کامیاب ہوگئے۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کا پیچھا کرنے کی کوشش حکومت کی طرف سے کی گئی جو کامیاب نہ ہو سکی۔ مگر حضرت حسینؓ کے معاملے میں کسی تعاقب کی ضرورت محسوس کی جاتی۔

۳ شعبان ۶۰ھ کے پہلے ہفتے میں مکہ معظمہ پہنچ جانے کے بعد ۸ ذی الحجہ تک حضرت حسینؓ مکہ معظمہ ہی میں رہے اور اس درمیان میں رمضان المبارک سے اہل کوفہ کے وفود اور خطوط آپ کے پاس پہنچنا شروع ہوگئے، جن میں کوفہ آکر وہاں لوگوں کی سربراہی سنبھالنے کی درخواست تھی اور یقین دلایا گیا تھا کہ سارا کوفہ آپ کے ساتھ ہے، جیسے ہی آپ آئیں گے ہم سب کے یزیدی حاکم کو نکال کر باہر کردیں گے۔ آپ نے پوری طرح اطمینان حاصل کرنے کے لئے اپنے چچازاد بھائی مسلم بن عقیل کو کوفہ بھیجا اور ان کی طرف سے اطمینان کا خط آنے پر حج سے ایک دن پہلے ۸ ذی الحجہ کو آپ کوفہ کے لئے روانہ ہوگئے لیکن ٹھیک اسی روز یعنی ۸ ذی الحجہ کو جبکہ حضرت حسینؓ کوفہ جانے کے ارادہ سے مکہ کو چھوڑ رہے تھے، مسلم بن عقیل کوفہ والوں کی بے وفائی کا شکار ہوکر حاکم کوفہ عبیداللہ بن زیاد کی گرفت میں آچکے تھے اور دوسرے ہی دن ان کو بےدردی سے قتل کردیا گیا تھا۔ حضرت حسینؓ کو اس کا چند روز کے بعد کئی منزلیں طے کرنے کے بعد پتہ چلا، آپ نے واپسی کا ارادہ فرمایا۔ مگر برادران مسلم کے جوش انتقام آڑے آگئے (جو یہ چاہتے تھے کہ بدلہ لیں گے یا مر جائیں گے۔) چنانچہ آپ سفر جاری رکھنے پر مجبور ہوئے اور پھر دوسری بار جب آپ نے [illegible] قریب پہنچ کر اس وقت کیا جب آپ کو اس بات کی خبر شہادت ملی کہ کوفہ پوری طرح عبیداللہ

ابن زیاد (حاکم کوفہ) کی گرفت میں ہے اور آپ صرف گرفتار ہو کر ہی اندر جا سکتے ہیں، جب وہاں کیسے کوئی گنجائش اور کوئی رہائی نہیں رہ گئی تھی۔ آپ کی گرفتاری کے لئے فوجی دستے حرکت میں آچکے تھے، آپ نے اس وقت فوری طور پر ایک غیر معمولی فیصلہ کیا یعنی اچانک یزید کے دارالخلافہ دمشق کی طرف موڑ دیا۔ مگر ان فوجی دستوں نے پیچھا کر کے آپ کو جلد ہی رک جانے پر مجبور کر دیا جو ابن زیاد کے حکم کے ماتحت چاہتے تھے کہ آپ کوفہ چلیں۔ یہی جگہ جہاں آپ کو قدم روک لینے پڑے اور جہاں آپ کی شہادت کا حادثہ رونما ہوا کربلا کے نام سے جانی جاتی ہے

— فوجی دستوں کے سردار عمر بن سعد بن ابی وقاص جن کے بارے میں روایتیں یہ بتا دیتی ہیں کہ ان کے دل میں حضرت حسینؓ کے لئے نہایت نرم گوشہ تھا، انہوں نے نہ صرف کوئی کارروائی کرنے کے بجائے معاملے کو پر امن طریقے سے سلجھانے کی کوشش کی حضرت حسینؓ سے رابطہ قائم کیا اور آپ کی طرف سے یہ خواہش سامنے آئی کہ آپ کی تین باتوں میں سے کوئی ایک قبول کر لی جائے۔ یعنی:

۱۔ واپس ہونے دیا جائے

۲۔ یزید کے پاس چلا جانے دیا جائے یا بھجوا دیا جائے

۳۔ کسی مملکت کی سرحد پر بھیج دیا جائے جہاں آپ مقیم ہو جائیں اور جہادی مہمات میں حصہ لے کر عمر گزار دیں۔

عمر بن سعد نے ابن زیاد (حاکم کوفہ) کو اس کی اطلاع اس طور سے بھیج دی کہ جیسے ایک نہایت معقول اور قابل قبول بات ہو۔ روایات کے مطابق ابن زیاد تو گویا اس صورت حال سے خوش ہو گیا مگر شمر جیسے مشیران نے اس کی رائے پلٹ دی بلکہ عمر بن سعد سے بھی اسکو بدظن کرا دیا۔ جس کے نتیجے میں شمر ہی کو بھیجا گیا کہ وہ عمر سے اصل حکم کی تعمیل کرائے۔ یعنی ملامت سے یا طاقت سے جس طرح بھی ممکن ہو حسینؓ اور ان کے ہمراہیوں کو یا تو گرفتار کر کے کوفہ لایا جائے اور یہی بات اس قتل و قتال کا موجب بن گئی جس نے کربلا کو امر کر دیا۔

— کربلا کے میدان کا واقعہ بہت سادہ اور بہت مختصر ہے اور جتنے قصے کہانیاں اس سلسلے میں بیان کی جاتی ہیں جب ان کی جانچ اس وقت اور ماحول کے اعتبار سے صحیح روایتوں کے تقابل تنقیدی نظر سے اور حضرت سیدنا حسینؓ اور ان کے اہل بیت کے دینی شعور کی روشنی میں کی جاتی ہے تو

یہ تمام کے تمام قصے ایک ایسی ہی گھڑنت داستان میں کھو جاتے ہیں جسے کسی ابن سبائی یہودی کے
شیطانی منصوبے کے مطابق ہی گھڑ لیا گیا تھا۔

۱۲۔ کوفے کے دروازہ پر پہنچ کر دوبارہ حضرت حسینؓ کی طرف سے واپس یا دمشق یا کسی سرحد کے پاس دور دراز چلے جائیں، اور اس میں رکاوٹ پڑنے کے بعد رکاوٹ ڈالنے والی کوفی فوج کے سردار عمر بن سعد کو ان تین باتوں کی پیش کش جن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ آپ یزید کے پاس بھیج دیئے جائیں۔ اس کے بعد عمر کو اللہ کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں رہتا تھا کہ ان باتوں پر غور کرنے سے پہلے اپنی اطاعت قبول کرنے کی شرط عائد کرے اور کوئی بے جواز وجہ بھی حقیقت میں ایسی نظر نہیں آتی جس سے یہ سوال حل کیا جائے کہ جب بات یزید کے ہاتھ میں جا رہی تھی اور ایک بہت بڑا مسئلہ جیسے قتل و قتال کے طے ہونے کے بارے امکانات پیدا ہو گئے تھے تو ابن زیاد نے یک قلم وہاں کا دروازہ بند کر کے یہ شرط کیوں عائد کر دی تھی ــــ لیکن اس کہانی میں بھی تھا ایک معمہ ہی ہے جس کا حل کرنے سے عقل عاجز رہ جاتی ہے۔ ہم نے حضرت حسینؓ کے عزیز احباب اور خیر خواہ بزرگوں میں کثرت سے کہا ہے کہ وہ کوفے کی طرف آپ کے ارادہ سفر سے شدید متفق نہیں تھے اور اس کی بالکل سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ ارادہ کیسے ایک مناسب ارادہ ہو سکتا ہے؟ اور دنیا میں کسی علم تاریخ پر کوئی ایسا جواب بھی نہیں ملتا کہ جس سے مطمئن ہو سکیں۔ (اور آج بھی آدمی تاریخ میں ہو کر پہلے گئے گزرے ان کے مقاصد سے تجرید نہیں ہو سکتا یہ الگ بات ہے کہ کوئی اس کے اجتہاد کرنے والا سمجھے)۔

حضرت حسینؓ اور یزید کے قصے پر غور کرنے والے اہل علم و فکر میں سے امام ابن تیمیہؒ نے بھی اس مشکل کو بڑی شدت سے محسوس کیا ہے اور پھر وہ یہ خیال پیش کر کے اسے حل کرتے ہیں کہ

> حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کے لئے اللہ کے یہاں سعادت اور بلند مقام کا جو مرتبہ مقرر تھا اس کے لئے کسی نہ کسی طرح کی مصیبت سے گزرنا لازم تھا۔ مگر ان دونوں کو اپنے دیگر اہل بیت کے برخلاف اس کے مواقع حاصل نہ ہو سکے تھے اس لئے کہ ان کی پرورش اسلام کی عزت و راحت کی گود میں ہوئی تھی۔ پس اس نے یہ مہیا ہو کہ ایک بھائی کی موت زہر خورانی سے اور دوسرے کی شہادت قتل سے ہوئی تاکہ اس کے صلہ میں ان کو شہداء کا منصب اور اعلیٰ سعادت کی صورت

یا مجبوراً"

یعنی اس سے کچھ ہی آنے والے ہوئے تھے کہ دوستوں کے خیال کے مطابق ہو گیا کہ حضرت حسینؓ مرتبۂ شہادت پر فائز ہوں اور تب یہ فیصلہ ہونے کی کوئی بات ہی نہ تھی یا تو حضرت حسینؓ اپنے مددگاروں کی رائے کے مطابق کوفے کے سفر سے رک گئے ہوتے اور پھر انہیں یہاں سے وجہ کی ضرور آمادہ ہوا ہوتا۔

۲۔ اس قتل ناحق میں یزید کا کیا کردار ہے؟ — اگر سب لوگ اسباب کی نظر ڈالی جائے اور کچھ کرم طبع کا اکثر معاملہ عزم کر لیا گیا ہے یزید کو بری کیا جائے تو اس کا کوئی کردار اس سانحے میں واضح نہیں ہوتا۔ اور اس کی سب سے بڑی اور سامنے کی دلیل تو حضرت حسینؓ کی آخری وقت کی یہ کوشش اور خواہش ہے کہ آپ کو یزید کے پاس پہنچنے کا موقع مل جائے تاکہ آپ کے سامنے ذرا بھی اس خیال و گمان کی گنجائش ہوتی کہ کوفے کی سرکار (انتظامیہ) کی طرف سے جو کچھ آپ کے ساتھ معاندانہ اور متکبرانہ رویہ اختیار کیا جا رہا ہے اس میں یزید کی مرضی شامل ہے، تو آپ کی طرف سے اس سرکار کوفہ کے نمائندوں کو یہ پیش کش کا مطلب ہی نہ تھا کہ میں یزید کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دینے کو تیار ہوں۔ ابن زیاد کے ہاتھ اور یزید کے ہاتھ میں یہ تفریق تو آپ اسی امید کی بنیاد پر کر سکتے تھے کہ آپ کی طرف سے مصالحانہ رویہ سامنے آنے کے بعد یزید کی طرف سے کسی غیر شریفانہ رویے کا سوال نہیں ہے۔

۳۔ اور یہی حقیقت ان روایتوں کو محض غیر معتبر ثابت کرنے کے لئے بھی کافی ہے جو متعلق ہیں کہ سانحۂ شہادت کے بعد حضرت حسینؓ کا سر مبارک اور آپ کے باقیماندہ اہل بیت کو یزید کے پاس بھیجا گیا تو اس نے توہین اور طعن و تشنیع کا رویہ اختیار کیا۔ ویسے یہ روایتیں فنی معیار پر بھی ثابت نہیں ہوتی ہیں جیسا کہ متعلقہ باب میں ان کی بحث سے بالکل صاف ظاہر ہو جاتا ہے۔

حرف آخر

کتاب کی بحثیں ختم ہوئیں۔ لیکن چند اہم امور اسی ضمن میں درج کر دینے کی ضرورت ہے۔

۱۔ کربلا کے حادثے کے سلسلے میں ایک عام تصور یہ ہے کہ یہ حادثہ یزید کی مرضی سے پیش آیا اور اس کا فیصلہ اسی کی خبر سے طے ہوا اور آپ کے ہاتھ کی یہ کتاب اس کے بر عکس، جیسا کہ ابھی ذکر کیا گیا ہے ظاہر کرتی ہے کہ واقعے کی ساری ذمہ داری کوفہ کے چند مفسد ہیں اور غلط اندیشی ہو کر

(یعنی بیعت سے روگردانی کے مترادف کے کچھ ہے تو بیعت ثابت نہیں ہوتی۔ بلکہ محض قرائن سے اس کے رد ہونے کا اظہار بھی ہوتا ہے۔

منصفانہ روایتوں سے [illegible] واقعے کی اصل حقیقت تو اللہ ہی جانتا ہے ہم اور کہا صرف اپنے مطالعے کے نتیجے کے طور پر ہے جس کا اظہار اس واقعے پر گفتگو کرتے ہوئے ایک علمی اور اخلاقی ذمہ داری تھی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یزید سے ہمارا کوئی رشتہ ناطہ نہیں کہ ہم اس کو بے قصور بنانے کی فکر کریں اور ان بہت سے لوگوں کی طرح جن کی سوچ یہی ہے کہ روایتی تصور کے خلاف بات نکلی ہی کے۔ اللہ اسے حسینؓ دشمنی (معاذ اللہ) گردانتے ہیں۔

۳۔ دوسرا اہم پہلو قصور بھی اس قصے میں اتفاقی اہم ہے وہ یہ کہ مخصوص حالات کی قسم کا تقاضا تھا۔ اور وہ بھی ایک بڑی بنیادی بات تھی کہ حضرت حسینؓ کو ان سے دوسرے اہم جہات ان کی خلافت تسلیم کر لے ہو یزید سے۔ ہمیں اپنے مطالعے میں اس کی کوئی ایسی شہادت نہیں مل سکی کہ ایسی کوئی بات تھی جو خلافت کی بنیاد ہو۔ اس لئے اس نتیجے کا اظہار بھی نہ صرف ایک علمی اور اخلاقی ذمہ داری تھی بلکہ اس امر کا ایک دینی پہلو بھی تھا۔ جس کی بنا پر نہ صرف اس کا اظہار کیا بلکہ واضح طور پر اظہار کرنا ہمیں لازم تھا۔ اور وہ پہلو یہ تھا کہ اہل سنت والجماعت سے اصحاب نبی ﷺ کی عزت کے مرتبوں کے ساتھ ساتھ عدول اور راست بازی ثابت ہے اور یزید کو منصب خلافت کے لئے نامزد کرنے والے حضرت امیر معاویہؓ بلا اختلاف اصحاب نبی ﷺ میں شامل ہیں۔ اس لئے اگر ہمارا مطالعہ تاریخ ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ کم از کم حضرت معاویہؓ کی زندگی تک بلکہ حضرت حسینؓ کی زندگی تک بھی جو حضرت معاویہؓ کے بعد کی [illegible] تھی یزید کے اندر فسق و فجور کہلانے والی بات کی شہادت نہیں ملتی(1) تب ہماری یہ ایک دینی ذمہ داری بھی ہے کہ اپنے مطالعے کے اس نتیجے کا اظہار کر کے واضح کریں کہ ایک صحابیؓ رسول ﷺ کی عدالت و راست بازی پر جو یہ حرف آتا تھا کہ انہوں نے ایک فاسق شخص کو منصب خلافت کے لئے نامزد کیا تھا اس کا ازالہ ہو جائے اور اصحاب نبی کا جو مقام اہل سنت کے دل میں ہے اس میں بھی بال نہ آنے پائے کیونکہ ان کا یہ مقام قرآن اور حدیث سے ثابت ہے۔ رہی یہ بات کہ حضرت معاویہؓ کا یہ کوئی مصلحت کے لحاظ سے کیسا تھا؟ اس میں گفتگو ہو سکتی ہے اور ہم نے بھی اس میں گفتگو کی

---

(1) [illegible]

ضرورت بھی ہے

۳۔ کتاب کی اولین اشاعت (۱۹۵۹ء) میں پر مصنف کے وہم و گمان سے بھی بالاتر جو کامیابی اس کو حاصل ہوئی اس کے پہلو بہ پہلو اس طرح کے تبصرے بھی جو غیر متوقع ہوں گو نہیں تھے سامنے آئے کہ اس میں یزید اور حضرت معاویہؓ کی طرفداری زیادہ ہو گئی ہے۔ ایسے تبصرہ والے حضرات سے اگرچہ ہم بصد خلوص کہہ دیں نہیں معلوم کر سکے کہ ان کا اشارہ کن باتوں کی طرف ہے، لیکن بظاہر اقتباسات کتاب کے انہی دو پہلوؤں کی طرف تھے اور ان کے بارے میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے جس کا حوالہ دیا گیا [illegible] مناسب [illegible] ضرورت تھا

۴۔ ایک بالکل غیر متوقع بات بھی سامنے آئی۔ اور وہ یہ کہ متعدد صاحب نے یزید کے ذکر میں بے احترامی کا شکوہ کیا۔ یعنی یہ کہ [illegible] صاحب کے حسینؓ اور ضمیر [illegible] تھا۔ ایک جگہ (جس) کا استعمال کیا گیا ہے۔ بلکہ ایک صاحب نے تو اس سے بھی بڑھ کر گرفت کی آپ نے یزید کے ان جملے کے حوالے سے جو یہ لکھا ہے کہ:

> "وہ یہ کہ وہ کوئی بڑا متقی و پرہیزگار ہو اس جملے سے نہیں نکالا جا سکتا۔ وہ بھی سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا اور غالب گمان یہ ہے کہ ایسا نہیں تھا" (۱) تو اس "غالب گمان" کی کوئی دلیل دیجئے ورنہ آپ نے اس بدگمانی کا ارتکاب کیے جانے کا [illegible] (۲)

میرے پاس واقعی دلیل نہیں تھی۔ اس لئے اس (تازہ) ایڈیشن میں یہ غالب گمان والے الفاظ نکال دینا ہی مناسب سمجھا اور اس ترمیم کا اعلان یہاں اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ یزید کی طرفداری کا احساس کرنے والے حضرات اس ترمیم کے پس منظر سے واقف ہو جائیں۔

۵۔ طرفداری کا احساس کرنے والے ایک صاحب نے نشاندہی کی کہ یزید کے ایک نائب حاکم کوفہ عبید اللہ ابن زیاد کی طرف سے حضرت حسینؓ کے ساتھ بدسلوکی اور گستاخی کا سلوک ذکر کر (ص ۱۰۷) کا آپ نے نتیجہ نکالا ہے کہ یہ سب یزید کی رضا سے نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر جب عبید اللہ ابن زیاد کو کم از کم [illegible] معزولی یا سرزنش کی گئی ہے جس سے آپ کو بھی اتفاق نہیں تو آپ کیسے کہیں کہ اس میں یزید کی رضا شامل نہیں تھی۔ ایسے کیسے (۳) سوال بظاہر معقول تھا مگر مجھے یہ بھی

---

(۱) پہلا ایڈیشن ص ۱۳۲ [illegible] کی جلد [illegible] کے [illegible]

(۲) [illegible] ایک [illegible] سے [illegible]

اطمینان تھا کہ میں نے کہیں دوہرا اسناد نقل کی ہے۔ کہیں راوی کا واسطہ نقل کی ہے۔ اس لیے عرض کیا کہ سوال آپ کا معقول ہے مگر جواب میں کتاب دیکھ کر دے سکتا ہوں۔ میرے ذہن میں موقع کی پوری عبارت نہیں ہے۔ کتاب دیکھنے کا موقع ملا تو میں نے محسوس کیا کہ مولانا صاحب نے غلط کہا نہ مجھ سے بے احتیاطی ہوئی۔ میرا قلم کوتاہی کر گیا۔ یزید حاکم کے رویے سے متعلق عبارت میں چند الفاظ کی کمی رہ گئی جس کے نتیجے میں یہ سوال کسی بھی ناقد اور کسی دوسرے قاری کے دل میں پیدا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ نسبتاً عبارت میں رہ جانے والے الفاظ بڑھا کر اس طرح کر دی گئی ہے

> "دوسرے حوالوں میں یزید کے بارے میں حضرت حسینؓ کے حق میں مخالفانہ رویے کے پس منظر میں یہ بات نہیں سوچی جا سکتی تھی کہ مقامی حکام اجرام، ریزی اور چشم پوشی کا رویہ مرکزی حکومت دارالاقتدار دمشق کی مرضی کے بغیر کر رہے ہوں۔"

اب یہ سمجھ کے لیے امید ہے کہ کسی کو بھی ان دونوں عبارتوں کا فرق سمجھنا مشکل نہ ہو گا۔ کھلا ہوا فرق یہ ہے کہ یزید کی بابت حضرت حسینؓ کے حق میں مخالفانہ رویے اور اس کی ہمدردی کے وقت سے چلا آتا سامنے رکھا جائے تو یہ ممکن نہیں معلوم ہوتا کہ یزید کی حکومت کا کوئی حاکم بغیر اس کی مرضی جانے کوئی ایسا کام کھلے طور پر اور عام حدود پار کر کے کرے گا جس سے حضرت والا کے بعد سے حکومت کی نرمی اور چشم پوشی کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن حقیقی کارروائی قدم ایسے حالات میں دیکھا جاتا ہے تو اس کے بارے میں یہ سمجھنا بالکل بھی ضروری نہیں ہو گا کہ اس عامل قدم کی بھی اوپر سے ہدایت ملی ہے۔ بلکہ وہ عام کر تاکہ ظاہر طور سے حضرت حسینؓ کے خطرے سے نپٹنے کی لیے ضرور بھی کچھ کیا ہو۔ جیسا کہ ابن زیاد کا تقرر ہونے کے فوراً بعد اسی مقصد سے ہوا تھا۔ اس کے علاوہ حضرت حسینؓ کا ابن زیاد کے ہاتھ میں ہاتھ دینے سے انکار کرنا اور یزید کے ہاتھ میں ہاتھ دینے کے لیے تیار ہونا یہ خود اس بات کی کھلی علامت ہے کہ آپ ابن زیاد کے طرز عمل میں یزید کی مرضی کا عکس نہیں دیکھتے تھے۔

۲- مذکورہ بالا اعتراض ایک دوسرے میں حقیقی معروض تھا اور اس کا ذکر اس لیے مناسب سمجھا گیا کہ کسی دوسرے کو بھی متعلقہ مقام پر یہ خیال گزرے تو اس کا جواب ہو جائے۔ لیکن ایک اعتراض اور بھی قلم و کتاب لکھنے والے ایک ایسے صاحب کے قلم سے سامنے آیا جو نہ صرف خوب نام ور عالم ہیں بلکہ ہماری ایک ہاسور علمی دینی درسگاہ کے نظام تعلیم کے نگران بھی ہیں۔ ان کا اعتراض عبرت کے لیے کہ

مقصود یہ ہے کہ شیعیت نے اور سبائیت نے مسلمانوں کے دل و دماغ پر کیا جادو کر رکھا ہے، کہ جب کسی کے موضوع میں کوئی بات ان کے بنائے ہوئے تصورات کے برعکس آ جائے تو یہ لوگ بھی اپنی حیثیت اور اپنے منصب کے تقاضے بھول کر کیا کیا باتیں کرنے پر آ جاتے ہیں ایک کتاب جس کے بارے میں ابھی آپ نے پڑھا کہ اس پر ایک صاحب کا اعتراض ہو کہ اس میں یہ کیسے لکھ دیا گیا کہ "قاتل کون ہے یہ کہ (۱) یزید (۲) کوفی ہی ہو سکتے ہیں نہ کہ" اور یہی کتاب جس میں مصنف حضرت حسینؓ کے عزیزوں، دوستوں اور خیر خواہوں کی منتیں، ۱۲۰ چٹھیاں، التجائیں اور گزارشیں دیکھتے ہوئے آپ کے قصد اور نظر ثانی کی طالب ہوتی تھیں اور پھر یہ دیکھتے ہوئے کہ آپ اس وقت اگرچہ تھم سے گئے مگر ایک منزل پر راستے سے پلٹنے کا ارادہ فرماتے ہیں تو عجیب عجیب قسم کی رکاوٹیں حائل ہو جاتی ہیں اور پھر یہ دیکھتے ہوئے کہ آپ خلیفہ سے صلح کرنے کے لئے خود ایک مصالحانہ شرطیں بھی یزید کے پاس لے جانا چاہتے ہیں تو ابن زیاد کی جانب سے رد ہو جاتی ہے (یہ سب دیکھتے ہوئے) کہ جب آپ کو عراق اور پر چھوڑا جاتا ہے کہ آخر حتمی قیام، تو ساری کی ہر بات مختلف معنی چاہتے تھے کیا توجیہ کرے اور پھر اس وقت جا کر اسے اطمینان کا سانس نصیب ہوتا ہے جب امام ابن تیمیہ کے یہاں اس کی توجیہ اسے نظر پڑتی ہے جو قارئین نے سب سے آخری باب (۱۲) میں پڑھی ہو گی اور یہ سب غلط جھوٹ روایات کی طرف سے آنکھیں شہادت کا امر واقعہ دینے کی انہی تدبیر تھی) اسی کتاب کے بارے میں ایک تبصرہ نگار نے لکھا کہ:

"کتاب کا مرکزی تحقیقی "نتیجہ بحث" (HYPOTHESIS) یہ ہے کہ یزید ایک مسلمان خدا ترس، پاک سیرت، خلیفہ برحق تھا۔۔۔ اور اس کے مقابلے میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ ایک جاہ طلب اور نااہل، اقتدار کے طالب اور بے جا اپنی جان گنوانے والے شخص تھے۔"

کتاب کے کسی ایک نکتہ کا بھی سہارا لئے بغیر، کسی ایک مستند مطلب تلاش بھی کیا جا سکے تحریر یہ خالص افترا پردازانہ "نتیجہ بحث" کس کے دماغ سے نکلا ہے، یہی تبصرہ نگار کی یا شیعیت کی کہیں پا سکی اس سے بھی آگے بڑھ کر اس نے یہ بھی کہہ ڈالا کہ یہ حضرت حسینؓ کی مخالفت کے پردے میں دراصل رسول اللہ ﷺ سے عداوت کا اظہار ہے

"وہ لوگ جو رسول اللہ ﷺ سے دلی عناد رکھتے ہیں وہ آپؐ سے بیزاری و کراہیت ظاہر کرنے کی جرأت نہ رکھتے ہوئے اس راستے سے اپنے دل کا غبار

ڈالتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا

قد نعلم انه ليحزنك الذي	ہم کو معلوم ہے کہ ان کی باتیں تم کو رنج
يقولون فانهم لا يكذبونك ولكن	پہنچاتی ہیں۔ مگر یہ تمہاری تکذیب نہیں کرتے
الظالمين بآيات الله يجحدون	بلکہ ظالم خدا کی آیتوں سے انکار کرتے ہیں۔

اسی طرح یہ لوگ سیدنا حسینؓ سے [illegible] رسول اللہ ﷺ سے عناد کا اظہار کرتے ہیں۔"

یہ عبارت جو بھی ایک دوسرے تبصرہ نگار نے ایک ایسے مصنف کے حق میں اپنے برہم جذبات کے ماتحت لکھی تھی جس نے حضرت حسینؓ کی شہادت کو شہادت کے بجائے بغاوت کی شرعی سزا بتاتے ہوئے "قتل بسیف جدہ" (وہ خود اپنے نانا کی تلوار سے قتل ہوئے) کے [illegible] مستوجب [illegible] تھے۔ اسی عبارت کو ہمارا تبصرہ نگار اس کتاب اور اس کے مصنف کے حق میں دہرا رہا ہے جس میں کسی ایک لفظ تک کی نشاندہی بھی آج تک کسی ناقد کی طرف سے نہیں ہو سکی جو حضرت حسینؓ کی عالی شان کے بھی خلاف ہو۔ چہ جائیکہ (معاذ اللہ) ان سے عناد کا اظہار ہو(1)

ہمیں یہ کہنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ کتاب کے بارے میں جو اعتراض [illegible] تبصرے کے پہلے اقتباس میں آتی ہے وہ اعتراض بدنیتی کی نیت سے لکھی گئی ہے اور نہ ہی اس کے بعد والے دوسرے اقتباس کے حق میں یہ خیال ہے کہ یہ محض عناد سے محض مصنف کو بدنام کرنے کی ایک کوشش ہو۔ بلکہ یہ محض اس شیعیت کے اثر کا نتیجہ ہے جو [illegible] الرائج ہے جس کی رو سے حضرت حسینؓ اسلام کا [illegible] ہیں کہ [illegible] قول اور فعل [illegible] ہے اور ان سے اختلاف [illegible] اللہ و رسول سے جنگ ہے حالانکہ اسی کتاب میں ظاہر ہے کہ حضرت حسینؓ نے حضرت معاویہؓ سے اختلاف اور پھر یزید سے اختلاف کیا [illegible] شیعی عقیدے کی رو سے خود [illegible] دوسرے فریق کی بات کو بھی سمجھنے کی کوشش کی گئی تھی اور حضرت حسینؓ کے اعزہ اور بعض دوسروں نے آپ کی رائے سے جو اختلاف آپ کی خیر خواہی میں ظاہر کیا اسے بھی بیان میں لایا گیا تھا اس لئے شیعیت کے [illegible] جو اوپر کے اقتباسات میں نظر آتا ہے۔ بلکہ اگر یہ اثر نہ ہوتا تو اس تبصرہ نگار نے کتاب کے مصنف سے بھی پہلے حضرت امام ابن تیمیہؒ [illegible] اس لئے کہ مصنف نے

---

(1) [illegible] ہے کہ اسلام میں مصنف کے حق میں [illegible] مصنف کے [illegible]

[illegible]

ذکر نہیں ملتا۔ اس قضیے میں وہ نتیجہ تھا کہ ان کا قلم بے حد قارئین پر بھاری ہے۔ مگر امام ابن
تیمیہ کا ایک اقتباس جو کتاب میں ملتا آیا ہے اس میں انہوں نے حضرت حسینؓ کے موقف سے شرعاً
اختلاف کا اظہار بھی اس شہید برحق ماننے کے ساتھ ساتھ کیا ہے۔ الغرض یہ حب حسینؓ کے
قائل حرام پرستے ہیں خشیت سے بھی اسی طرح کے رد عمل کو سمجھا دینا بیان لگی ہے

۷ ۱۰۔ اسی ضمن میں ایک خیال آتا ہے جس کے تحت سے یہ دل کو ملا حقیقت اور بھی
روشن ہوتی ہے۔ وہ خیال یہ ہے کہ واقعہ کربلا کو عام طور پر جس سیاسی پہلو کی بنیاد پر تصور
کے تحت بطور ایک معرکۂ حق و باطل پیش کیا جاتا ہے کہ ایک فاسق و فاجر نے اسلامی تخت خلافت پر
قبضہ کر لیا تھا جس سے اسے آزاد کرانے کی خاطر حضرت حسینؓ نے تلوار اٹھانے کی ٹھانی۔ مگر اس
میدان کا ایک اور مرد بھی جس کا نام عبداللہ بن زبیرؓ ہے۔ جس نے نو برس تک عبدالملک بن
مروان تک کے اموی حکمرانوں کے خلاف بھرپور جنگ کر کے چلائی۔ اور جب حق سرخرو ہونے
بیعت ہو گئی تو اس کے ہاتھ سے منہ چھوڑنے پر ان کی شہادت (جمادی الاولیٰ ۷۳ھ) کا وقت آنے پر
اسے دور اس کی معرکہ آرائیوں کو یاد کرنے کا مقصود ہم نے کہیں نہیں دیکھا اور اس کی معرکہ
آرائیوں کے دور میں واقعہ کربلا کے تین سال بعد واقعہ حرہ پیش آتا ہے جس میں ہر طرح کی اختلاف
روایت کے یزید کے حکم سے مدینہ منورہ (مدینۃ اللہ شریف و مکرمہ) کا تاراج ہوا اور ساکنان
مدینہ پر گویا ایک مسلسل قیامت ٹوٹی۔ مگر ہم نے نہیں دیکھا کہ جب ہر سال میں واقعہ حرہ کی
طرح یاد کرنے کے لیے ان کا پیش بھی کوئی رونا دھونا ہوتا ہو۔ البتہ سب نے مدت سے بھی یزید کو
فاسق و فاجر ملعون و مردود بتانے کے لیے جلسوں اور مجلسوں کا اہتمام ہوتا ہے حالانکہ یہی
موقع تھا کہ اس کے حوالے سے یزید کو فاسق و فاجر وغیرہ کہا بھی جاتا تو اس کا جواز فراہم تھا مگر
وہاں تو کسی کو کبھی بھولے سے یاد بھی نہیں آتا۔ شیعہ حضرات کہاں اس کے یاد کرنے والے تھے تو
ان کا ماتم کرتے۔ ہاں اگر حضرت علی بن حسینؓ (زین العابدین) کا مدینہ تو واقعہ حرہ کی ہو جاتا
دیکھیے یہاں بھی مرحوم مولانا صاحب پہلے حکمرانوں کے بارے میں یزید کی اپنے ماتحت کو ہدایت تھی
کہ کسی طرح کا گزند نہ پہنچے۔ معلوم آپ ہی واقف ہیں

۸ ۱۰۔ بہرحال ہم یہ کہتے ہوئے لگتے ہیں کہ جوان مرد عبداللہ بن زبیرؓ کا ایک ایک
سے ہی بچ کے ابھی لوٹے۔ وہ وقت ہی کم ساتھ تھا کہ آزادی نہ تھی۔ جہادی معرکے سے کامیاب

روئی بھری ہوئی تھی، ان کے ذوق عبادت کا بھی عالم یہ تھا کہ شہادت کی خبر پر حضرت عبداللہ بن عمر نے بھی جو ان کی یزید وغیرہ کے خلاف معرکہ آرائی کو پسند نہیں کرتے تھے "صوام و قوام" (شب زندہ دار اور دن کے روزہ دار) کے حوالے سے اظہار افسوس کیا ہے۔ حسب و نسب تو باپ کی طرف سے آپ بیٹے تھے آنحضرت ﷺ کے پھوپھی زاد حضرت زبیر بن العوامؓ کے جو حواری رسول کا لقب رکھتے تھے اور ان دس صحابہ میں سے ایک تھے جنہیں جنت کی بشارت ملی اور ماں کی طرف سے حضرت اسماء بنت ابی بکر الصدیقؓ کی اولاد اور بنت صدیق ہونے کے علاوہ "ذات النطاقین" کا لقب بھی رکھتی تھیں جس سے آنحضرت ﷺ کے سفر ہجرت کی ایک خاص یہ بشارت ہے مرد میدان ہونے کا عالم یہ تھا کہ بہتر سال کی عمر میں بھی بالکل اکیلے رہ جانے کے باوجود دشمن کی فوج کا مقابلہ کرنے سے عاجز نہ تھے اور اس لئے جب وہ شیر مرد حجر اسود کی چھت کا سہارا لے کر اور پھر دشمن کا مقابلہ تو ہوا کی بزدلی کا بہانہ نہیں کرتی کہ نعرہ تکبیر بلند ہوا سے آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر نے جب یہ تکبیر سنی اور وجہ معلوم ہوئی تو فرمایا کہ یہی وہ تھا جس کی پیدائش پر بھی مدینے میں تکبیر بلند ہوئی تھی۔ کیونکہ مہاجرین کے گھر میں یہ پہلی پیدائش تھی اور غیر معمولی خوشی کا سبب یہ تھا کہ یہود نے یہ خبر مشہور کر رکھی تھی کہ ان کے ٹوٹکوں سے مہاجرین کو بے اولاد کر سکتے ہیں۔

الغرض یہ تھے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما جنہیں یزید و دمشق کے حوالے سے بھی کبھی پسند نہیں آئے۔ پھر بھی حجر اسود میں شہادت کا منصب ملا، تو سر ہو کر بجا طور پر یہ کہا جاتا ہے

ع   کہ شہادت ہے مقصود مرد کے اقبال کا

☆☆☆

اشاریہ

(INDEX)

صفحات	موضوعات
از ۲۹۱ تا ۳۰۲	۱۔ اشخاص
،، ۳۰۲ ،، ۳۰۳	۲۔ مقامات و ممالک
،، ۳۰۳ ،، ۳۰۹	۳۔ اقوام، طبقات، قبائل، مسالک، فرق
،، ۳۰۹ ،، ۳۱۷	۴۔ متفرقات

نوٹ

یہ اشاریہ ہمارے محب دیرینہ جناب قطب الدین صاحب (بیکانی) کی محنت شاقہ کا نتیجہ ہے۔ موصوف نے اسے موجودہ شکل سے کہیں زیادہ تفصیلات کے ساتھ مرتب کیا تھا مگر ہمیں بہ حیثیت مجموعی اختصار کرنا پڑا۔

اشخاص

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم [illegible]
[illegible]
[illegible] (حاشیہ) [illegible]
[illegible]
۲۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام [illegible] (حاشیہ)
۳۔ حضرت ابراہیم بن محمد صلی اللہ علیہ وسلم ۲۸
۴۔ ابن ماجہ ۳۳ (حاشیہ) [illegible]
[illegible] (حاشیہ) [illegible]
۵۔ ابن الاحوص (عبدالرحمن) [illegible]
۶۔ ابن الحباب (زید) ۲۷۰
۷۔ (شیخ الاسلام) ابن تیمیہ [illegible]
[illegible]
۸۔ ابن جریر طبری [illegible] (حاشیہ) [illegible]
۹۔ (حافظ) ابن حجر (عسقلانی) [illegible] (حاشیہ) [illegible]
[illegible]
۱۰۔ ابن خلدون [illegible]
[illegible]
[illegible] (دیکھئے [illegible])
[illegible] (حاشیہ) [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] دیکھئے [illegible]
[illegible] دیکھئے [illegible]
۱۶۔ [illegible] دیکھئے [illegible]
۱۷۔ [illegible] دیکھئے [illegible]
۱۸۔ حضرت ابن عباس دیکھئے عبداللہ بن عباس
۱۹۔ ابن [illegible] دیکھئے [illegible]
۲۰۔ [illegible] ([illegible]) [illegible]
۲۱۔ ابن قتیبہ (عبداللہ بن مسلم) [illegible]
۲۲۔ [illegible]
[illegible] (حاشیہ) [illegible]
[illegible] (حاشیہ) [illegible]
[illegible]
۲۳۔ [illegible] دیکھئے [illegible]
۲۴۔ [illegible]
۲۵۔ [illegible] ([illegible]) [illegible]
۲۶۔ (سید) ابوالاعلیٰ مودودی [illegible]
۲۷۔ ابو داؤد ([illegible]) [illegible]
۲۸۔ (مولانا) ابوالکلام آزاد [illegible]
۲۹۔ (حضرت) ابو ایوب انصاری [illegible]
۳۰۔ حضرت ابو بکر دیکھئے [illegible]
۳۱۔ حضرت [illegible] [illegible]
۳۲۔ ابو بکر بن العربی [illegible] (حاشیہ)
۳۳۔ حضرت ابو بکر [illegible] بن عبدالرحمٰن [illegible]
[illegible]
۳۴۔ [illegible] (حاشیہ) [illegible]
[illegible]
۳۵۔ [illegible] (حاشیہ) [illegible]

۲۲۹۔ ابو جعفر دیکھئے حضرت امام باقرؒ

۲۳۰۔ [illegible] علم و مہدیؒ ۴۲۲

۲۳۱۔ ابو جناب الکلبی ۱۸۹

۲۳۲۔ (حضرت) ابو سعید الخدریؓ [illegible]

۲۳۳۔ ابو سفیان ۲، ۳، ۷

۲۳۴۔ ابو حنیفہ دیکھئے حضرت امام اعظمؒ

۲۳۵۔ ابو عبیدہ ۹۵

۲۳۶۔ ابو یوسف [illegible]

۲۳۷۔ ابو مسلم [illegible] ۲۶۷

۲۳۸۔ (حضرت) ابو موسیٰ اشعریؓ [illegible]

[illegible]

۲۳۹۔ (حضرت) احنف بن قیسؓ [illegible]

۲۴۰۔ احمد بن حنبلؒ [illegible]

۲۴۱۔ علامہ احمد [illegible] (حاشیہ) [illegible]

۲۴۲۔ شیخ احمد [illegible] ۲۸

۲۴۳۔ (حضرت) اسامہ بن زیدؓ ۲۰۸

۲۴۴۔ (حضرت) اسمٰعیل [illegible] (حاشیہ) ۲۲

۲۴۵۔ (حضرت) [illegible] (حاشیہ) ۲۲۱

۲۴۶۔ [illegible] ۲۳۱

۲۴۷۔ [illegible] بن قیس ۸

۲۴۸۔ [illegible] (حاشیہ) ۸

۲۴۹۔ [illegible] ۱۲۹

۲۵۰۔ [illegible] ۲۸، [illegible]

۲۵۱۔ (حضرت) انس بن مالکؓ ۲۱۵

۲۵۲۔ [illegible] ۱۲

۲۵۳۔ [illegible] ۲۳

(ب)

۲۵۴۔ [illegible] [illegible]

۲۵۵۔ [illegible] (حاشیہ) ۲۳۱

۲۵۶۔ [illegible] ۴۹

(ج)

۲۵۷۔ [illegible] (حاشیہ) [illegible]

(ح)

۲۵۸۔ حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ [illegible]

۲۵۹۔ حضرت جبرئیلؑ ۱۵

۲۶۰۔ (حضرت) جعفر طیارؓ [illegible]

۲۶۱۔ [illegible] ۲۱۳

(ح)

۲۶۲۔ (حضرت) حبیب دیکھئے حبیب بن [illegible]

۲۶۳۔ [illegible] حبیب ابن حسن [illegible] ۳۰۳

۲۶۴۔ (حضرت) حبیب بن [illegible] [illegible]

۲۶۵۔ حبیب بن مظاہر ۱۹۹، ۲۱۸

۲۶۶۔ حجاج دیکھئے [illegible]

۲۶۷۔ حجاج بن یوسف [illegible]

۲۶۸۔ [illegible]

۲۶۹۔ [illegible] (حاشیہ) [illegible]

۲۷۰۔ [illegible] ۲۰۳

۲۷۱۔ [illegible] [illegible]

[illegible]

۲۷۲۔ (حضرت) حسن بصری [illegible]

۲۷۳۔ (حضرت) حسن بن علی [illegible]

[illegible] (حاشیہ) [illegible]

[illegible]

۲۷۴۔ حسن مجتبیٰ دیکھئے حضرت حسن

۲۷۵۔ (حضرت) الحسینؓ [illegible]

۲۷۶۔ حضرت حسینؓ [illegible]

[illegible] (حاشیہ) [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]۔ (حضرت سیدنا) حسین ابن علی [illegible]
[illegible]۔ حسین بن عبد الرحمن [illegible]
[illegible]
[illegible]۔ حسین بن محمد [illegible]
[illegible]۔ (حضرت) حمزہ [illegible]
[illegible]۔ حمید دیکھئے حمید بن مسلم
[illegible]۔ حمید بن مسلم [illegible]
[illegible]
[illegible]۔ (ڈاکٹر) حمید اللہ (محمد حمید اللہ ڈاکٹر)

(خ)

[illegible]۔ خلیل الرحمن [illegible]

(د)

[illegible]۔ (ابو) داؤد [illegible]

(ر)

[illegible]۔ (حضرت مولانا) رشید احمد گنگوہی [illegible]
[illegible]۔ رفاعہ بن شداد [illegible]

(ز)

[illegible]۔ (حضرت) زبیر بن العوام [illegible]
[illegible]
[illegible]۔ زحر بن قیس [illegible]
[illegible]۔ زہیر بن قین [illegible]
[illegible] (حاشیہ) [illegible]

(حاشیہ) [illegible] (حاشیہ) [illegible]
[illegible]
[illegible] دیکھئے
[illegible]
[illegible]
[illegible]۔ (حضرت) زین العابدین (علی بن حسین) [illegible]
[illegible] (حاشیہ) [illegible]
[illegible]
[illegible]۔ زینب الکبریٰ [illegible]

(س)

[illegible]۔ سعد [illegible]
[illegible]۔ سعد بن مسعود ثقفی [illegible]
[illegible]۔ (حضرت) سعد بن ابی وقاص [illegible]
[illegible]۔ (ابو) سعید (خدری) [illegible]
[illegible]
[illegible]۔ سعید بن العاص [illegible]
[illegible]۔ سعید بن عثمان [illegible]
[illegible]۔ (حضرت) سعید بن المسیب [illegible]
[illegible]
[illegible]۔ سلیمان بن صرد [illegible]
[illegible]۔ سمیہ [illegible]
[illegible]۔ (حضرت) سہل بن سعد ساعدی [illegible]

(ش)

[illegible]۔ شبث بن ربعی [illegible]
[illegible]۔ (علامہ) شبلی نعمانی [illegible]
[illegible]۔ (امام) شعبی [illegible]
[illegible]۔ شمر بن ذی الجوشن [illegible]
[illegible]

شیخ ابیہ (مولانا محمد امین) [illegible]

[illegible]

[illegible] مسعود ثقفی [illegible]

[illegible] علی بن [illegible] [illegible]

(حضرت) علی اکبر (علیہ السلام) [illegible]

(حضرت) علی بن ابی طالب [illegible]

[illegible]

[illegible] (حاشیہ) [illegible]

[illegible]

[illegible]

(حضرت) علی بن حسین دیکھئے زین العابدین

[illegible] علی بن [illegible]

(حضرت) علی بن موسیٰ بن جعفر الصادق [illegible]

[illegible] علی (المرتضیٰ علم الہدیٰ صاحب) [illegible]

[illegible] (حاشیہ)

[illegible]

(حضرت) [illegible]

[illegible]

(حضرت) عمر بن الخطاب [illegible]

[illegible] (حاشیہ)

(حضرت) عمرو بن [illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

(حضرت) [illegible] دیکھئے [illegible]

عمر بن [illegible] [illegible]

(حضرت) عمرو بن العاص [illegible] (حاشیہ)

[illegible]

[illegible] بن [illegible] (حاشیہ) [illegible]

(حضرت) [illegible] سلام [illegible]

ف

(حضرت) فاطمہ [illegible]

(حاشیہ) [illegible]

[illegible] فاروق [illegible]

[illegible] فرد دیکھئے [illegible] حسین

ق

(سید) قطب [illegible]

[illegible] (حسین) [illegible]

[illegible] قیس بن [illegible] (حاشیہ) [illegible]

(حضرت) قیس بن سعد [illegible] (حاشیہ)

[illegible] قیصر [illegible]

ک

(امام) [illegible] کمیل [illegible]

[illegible] کسریٰ [illegible]

م

[illegible] دیکھئے مالک بن انس

(امام) مالک بن انس [illegible]

[illegible] مامون الرشید [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]

(حضرت) محمد صلی اللہ علیہ وسلم دیکھئے آنحضرت [illegible]

(حضرت) [illegible] [illegible]

[illegible] (حاشیہ) [illegible]

[illegible]

[illegible] محمد بن ابی بکر صدیق [illegible]

[illegible] محمد [illegible]: [illegible]

(حضرت) محمد بن حنفیہ [illegible]

محمد بن سعد صاحب طبقات [illegible]

(شیخ) محمد بن عبد الوہاب نجدی [illegible]

محمد بن عمرو بن حزم [illegible]

محمد بن اسحاق [illegible]

(مولوی) محمد حسین [illegible] [illegible]

[illegible] محمد [illegible] [illegible]

محمد [illegible] [illegible] (حاشیہ)

محمود [illegible] [illegible] (حاشیہ) [illegible]

[illegible] [illegible]

مختار: دیکھئے [illegible]

(مولانا) [illegible] [illegible]

مروان: دیکھئے مروان بن حکم

مروان بن حکم [illegible] (حاشیہ) [illegible]

مسعودی (مؤرخ) [illegible]

مسلم بن عقبہ المری [illegible]

مسلم بن عقیل [illegible]

مسلم بن عوسجہ [illegible] (حاشیہ)

(حضرت) مسور بن مخرمہ [illegible]

مصعب بن [illegible] [illegible]

مصعب بن [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] (حاشیہ)

[illegible]: [illegible]

(حضرت) معاویہؓ (بن ابی سفیان) [illegible]

(حاشیہ) [illegible]

[illegible]

[illegible] (حاشیہ) [illegible]

(حاشیہ) [illegible]

[illegible]

(حضرت) مغیرہ بن شعبہ [illegible] (حاشیہ)

[illegible] (حاشیہ) [illegible]

[illegible]

منصور (عباسی خلیفہ) [illegible]

ن

(حضرت) نعمان بن بشیرؓ [illegible]

و

(حضرت) [illegible] اللیثی [illegible]

واقدی: (مؤرخ) [illegible]

ولید (اول) [illegible]

ولید بن عتبہ بن ابی سفیان: [illegible]

ہ

ہانی بن [illegible] [illegible]

ہانی بن عروہ [illegible]

[illegible]

ہرقل [illegible]

ہند (والدہ حضرت معاویہؓ) [illegible]

ی

یحییٰ بن سعید [illegible]

[illegible]

[illegible] ۲۲۲، ۲۱۴

[illegible]

[illegible]

[illegible] ۱۰۹

مقامات و ممالک

(ا)، (ب)، (پ)، (ت)، (ٹ)

[illegible] ۱۹

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ۱۴۳، ۱۴۴

[illegible] ۲۰۳ (حاشیہ)

[illegible]

(ج)، (چ)، (ح)، (خ)

[illegible]

[illegible]

[illegible] (حاشیہ) [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] (حاشیہ)

[illegible]

(د)، (ڈ)، (ذ)، (ر)

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ۱۴

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

۳-اقوام-طبقات-قبائل

مسالک-فرق

(ا)

۱-آزاد [illegible] ۹۹

۲-اعراب ۲۰۴، ۲۴۶

۳-آل [illegible] ۹

۴-اسلام (اہل) [illegible]

[illegible]

۵-اصحاب [illegible]

[illegible]

[illegible]

۶-انصاری [illegible]

۷-انبیاء علیہم السلام [illegible]

پیغمبر ۲۲۱

نبی ۲۳۳ (۲۹۳)

۸-[illegible] [illegible]

۹-[illegible] ۵

۱۰-اہل الرائے ۱۰۴

۱۱-اہل انجیل ۲۲۱

۱۲-اہل بصرہ بصری اہل بصرہ والے [illegible]

۴۳

۱۳-اہل بیت [illegible]

[illegible]

۱۴-اہل تاریخ، مورخین [illegible]

۱۵-اہل حجاز ۱۶۳

۱۶-اہل [illegible] [illegible]

۱۷-اہل حدیث ۱۵ [illegible]

[illegible]

۱۸-اہل [illegible] [illegible]

[illegible]

۱۹-اہل شوریٰ، شوریٰ [illegible]

۲۰-اہل عراق عراقی عراق والے [illegible]

[illegible]

۲۱-اہل عرب ۲۵۹

۲۲-اہل علم [illegible]

۲۳-اہل علم دین [illegible]

۲۴-اہل قبا ۳۹

۲۵-اہل کوفہ کوفی، کوفہ والے [illegible]

[illegible]

[illegible]

۲۶-اہل مدینہ مدنی، مدینہ والے [illegible]

[illegible]

[illegible]

۲۷-اہل مصر مصری ۴۴

۲۸-اہل مکہ مکی، مکہ والے [illegible]

(ب)

۲۹-بدوی اعرابی ۳۸

۳۰-بنو امیہ، بنی امیہ [illegible]

[illegible]

۳۱-بنو طے ۱۵۹ (حاشیہ)

۳۲-بنو عقیل، [illegible] [illegible]

۳۳-بنو ہاشم، بنی ہاشم، ہاشمی [illegible]

۴۴۔ حرث بن عبد المطلب ۱۹۵
۴۵۔ حرث بن عبد مناف ۱۵۷
۴۶۔ حرث بن قطب ۱۲۷

(ص) (ض)

۴۷۔ [illegible] ۲۹۸،۲۰۹،۱۱۵
۴۸۔ [illegible] ۲۰۷
۴۹۔ [illegible] ۲۹۲

(ع)، (غ)

۵۰۔ [illegible] ۱۰۰
۵۱۔ [illegible] ۱۱
۵۲۔ [illegible] ۲۹۷
۵۳۔ [illegible] ۲۲۸،۲۵۵،۲۹۷
۵۴۔ [illegible] ۳۰
۵۵۔ [illegible] ۱۳۸،۱۴۷،۲۹۷
۵۶۔ [illegible] ۱۳۴،۱۴۲،۱۷۴،۲۸۸

(ف)، (ق)، (ک)، (گ)

۵۷۔ [illegible] ۲۰۷
۵۸۔ [illegible] ۸۰،۸۳
۵۹۔ [illegible] ۳۵
۶۰۔ [illegible] ۲۳۲
۶۱۔ [illegible] ۲۳۱،۲۳۲
۶۲۔ [illegible] ۱۵۲،۲۳۵

۶۳۔ [illegible] ۱۵۱
۶۴۔ [illegible] ۲۶۵،۲۵۵،۲۲۸،۲۰۰،۱۳
۶۵۔ [illegible] ۱۲۹،۳۳۰
۶۶۔ [illegible] ۲۵۷
۶۷۔ [illegible]
۶۸۔ [illegible]
[illegible]
۶۹۔ [illegible]
۷۰۔ [illegible]
۷۱۔ [illegible]

(م)

۷۲۔ [illegible]
۷۳۔ [illegible]
۷۴۔ [illegible]
[illegible]

(ن)

۷۵۔ [illegible] ۴۳
۷۶۔ [illegible] ۲۹۷
۷۷۔ [illegible] ۲۹۹
۷۸۔ [illegible] ۱۵۷

(ہ)، (ی)

۷۹۔ [illegible] ۱۹۷

[illegible]: [illegible]

[illegible]: [illegible]

۶۶۔ قانون مسیحی: [illegible]

[illegible]: [illegible]

[illegible] حسینؑ: [illegible]

[illegible] (حاشیہ) [illegible]

۷۰۔ قاتلان حسین کی پالیسی: [illegible]

[illegible]: [illegible]

[illegible]: [illegible]

[illegible]: [illegible]

۷۴۔ قرآن: [illegible]

[illegible]: [illegible]

(م)

[illegible]: [illegible]

[illegible]: [illegible]

[illegible]: [illegible]

[illegible]: [illegible]

[illegible]: [illegible]

[illegible]: [illegible]

[illegible]: [illegible]

[illegible]: [illegible]

[illegible] حسین: دیکھئے [illegible]

[illegible]: [illegible]

[illegible]: [illegible]

(ن) (و) (ی)

[illegible]: [illegible]

[illegible]: [illegible]

[illegible]: [illegible]

[illegible]: [illegible]

[illegible]: [illegible]

۴۔ اہم متفرقات

بیعت، خطبے، خروج، جنگ، احساسات
شہادت، قتل، [illegible]

الف — بیعت

[illegible]: [illegible]

[illegible]: [illegible]

[illegible]: [illegible]

[illegible]: [illegible]

ب — خطبے

[illegible]: [illegible]

[illegible]: [illegible]

[illegible]: [illegible]

[illegible] (حاشیہ) [illegible]

[illegible] (حاشیہ) [illegible]

۲۔ جنگ [illegible]: ۴۳

ط ـــ خروج

۱۔ [illegible] حضرت کے خروج: [illegible]

[illegible]

ی ـــ شرفا صحابہ

۱۔ شرفا حضرت حسن بن علیؓ: [illegible]

۲۔ حضرت حسینؓ کا سر [illegible]: [illegible]

[illegible]

ک ـــ شہادتیں اور قتل

۱۔ حضرت حسینؓ: [illegible]

[illegible]

۲۔ حضرت [illegible] بن زبیرؓ: [illegible]

۳۔ حضرت عبداللہ بن [illegible]: [illegible]

۴۔ حضرت عثمان بن عفانؓ: [illegible]

[illegible]

۵۔ حضرت علی بن ابی طالب: [illegible]

ل ـــ صلح

۱۔ صلح حدیبیہ: [illegible]

۲۔ صلح حضرت حسنؓ و معاویہؓ: [illegible]

[illegible]

۳۔ [illegible]: ۳

م ـــ ولی عہدی

۱۔ ولی عہدی علی بن موسیٰ بن جعفر الصادق: ۳۳۳

۲۔ [illegible] یزید بن معاویہؓ: [illegible] (حاشیہ) [illegible]

[illegible]

[illegible] (حاشیہ) [illegible]

[illegible]

ن ـــ واقعات

۱۔ واقعہ تحکیم: [illegible]

۲۔ واقعہ حرہ: [illegible]

۳۔ واقعہ کربلا: [illegible]

[illegible] (حاشیہ) [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

☆ ☆ ☆

کتابیات

وہ کتابیں جن کا کوئی حوالہ اس کتاب میں دیا گیا ہے

۱- القرآن المجید

ا

۲- الاصابہ فی تمییز الصحابہ (عربی) از ابن حجر عسقلانی
۳- سیر اعلام النبلاء (عربی) از شمس الدین ذہبی

ب

۴- البدایہ والنہایہ (عربی) از حافظ ابن کثیر

ت

۵- تاریخ ابن خلدون (عربی) از عبد الرحمن بن محمد ابن خلدون
۶- تاریخ طبری (عربی) از ابو جعفر محمد بن جریر طبری
۷- تاریخ الکامل (عربی) از ابن اثیر
۸- تقریب التہذیب (عربی) از حافظ ابن حجر عسقلانی

ج

۹- جامع ترمذی (عربی) از امام ابو عیسیٰ ترمذی

ح

۱۰- [illegible]
۱۱- حضرت [illegible] (اردو) از [illegible]

خ

۱۲- خصائص علی (عربی) از امام نسائی
۱۳- خلافت و ملوکیت (اردو) از سید ابو الاعلیٰ مودودی
۱۴- خلافت معاویہ و یزید (اردو) از محمود احمد عباسی

د

۱۵- الدر المنثور (عربی) از [illegible]

ر

۱۶- رحماء بینہم (اردو) از محمد نافع
۱۷- [illegible] از مولانا [illegible]

ز

۱۸- [illegible] (عربی) از [illegible]
۱۹- [illegible] (عربی) از حافظ [illegible]

ش

۲۰- شرح نہج البلاغہ (عربی) از ابن ابی الحدید
۲۱- شہید انسانیت (اردو) از سید علی نقی صاحب مجتہد
۲۲- شیخ محمد بن عبد الوہاب کے خلاف پروپیگنڈہ (اردو) ــــــ از مولانا محمد منظور نعمانی

ص

۲۳- صحیح بخاری (عربی) از امام محمد بن اسماعیل بخاری
۲۴- صحیح مسلم (عربی) از امام مسلم القشیری

ط

۲۵- طبقات ابن سعد (عربی) از ابن سعد [illegible]

ف

۲۶- الفاروق (اردو) از مولانا شبلی نعمانی
۲۷- فتح الباری (عربی) از حافظ ابن حجر عسقلانی

ل

۲۸- لسان المیزان (عربی) از حافظ ابن حجر عسقلانی

م

۲۹- مروج الذہب (عربی) از المسعودی
۳۰- مشکوٰۃ المصابیح (عربی) از خطیب تبریزی
۳۱- مصنف عبد الرزاق (عربی) از ابو بکر عبد الرزاق
۳۲- المعارف (عربی) از ابن قتیبہ
۳۳- معجم [illegible] (عربی) از [illegible]
۳۴- المستدرک (عربی) از ابو عبد اللہ [illegible]
۳۵- مقدمہ ابن خلدون (عربی) از ابن خلدون
۳۶- منہاج السنۃ (عربی) از امام ابن تیمیہ
۳۷- مؤطا (عربی) از امام مالک
۳۸- میزان الاعتدال (عربی) از حافظ ذہبی
۳۹- نہج البلاغہ (عربی) از شریف رضی

☆☆☆

یہ کتاب

ہندوستانی پاکستانی مبصرین کی نظر میں

''اردو تصنیفات میں تحقیق کی ہمیشہ شدید کمی محسوس کی گئی ہے۔ اور اگر اس تحقیق کا تعلق اسلامی تاریخ کے ایک ایسے المناک واقعہ سے ہو جس کے اندوہناک اثرات تنازع، اختلاف اور تشدد آمیز ردعمل کی صورت میں رونما ہوئے ہوں تو اس کی ضرورت اور اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ مولانا عتیق الرحمن نے اپنی اس تصنیف میں، جسے اُن کے وسیع مطالعہ کا شاہکار کہنا چاہیے، اس علمی ضرورت کو پورا کیا ہے۔'' ....

''مولانا عتیق الرحمن کی کتاب فکر انگیز، پُر از معلومات اور تاریخ پر مبنی ہے۔ کربلا کے واقعہ پر تحقیق کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔'' (یونیورسل میسیج۔ کراچی۔ بابت جولائی ۹۳ء سے ترجمہ)

''اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اصحاب رسولؐ کے سلسلہ میں اُمت کے اجماعِ عقیدۂ احترام و اعتبار کو قارئین کے ذہنوں میں راسخ کرانے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے، اور یہی وہ ایک خدمت ہے جو انشاء اللہ اجر اُخروی سے خالی نہ ہوگی، کیونکہ واقعہ کربلا جیسے اہم نزاعی اور ہنگامہ خیز و ہنگامہ پرور عنوان پر قلم اٹھانے کے بعد ''سبائی اور خارجی'' دونوں فکروں سے دامن بچا کر اہلسنت کی معتدل فکر کو اپنا کر نباہ دینا، اور مقام صحابیت کے سلسلہ میں بنو اُمیہ و بنو ہاشم کے درمیان تفریق نہ برتنا، اور یک چشمی و کور باطنی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بنو ہاشم سے اظہار عقیدت کے لیے بنو اُمیہ کو، یا بنو اُمیہ سے اظہار عقیدت کے لیے بنو ہاشم کو مطعون کرنے کی غیر معتدل بلکہ غیر اسلامی فکر سے عافیت کے ساتھ دامن بچالے جانا ہی ایک بہت اہم اور لائق مبارک باد کارنامہ ہے''۔

(ماہنامہ البعث کاکوری، لکھنؤ۔ بابت اپریل، مئی ۹۳ء)

''واقعہ کربلا اسلامی تاریخ کا ہمیشہ ایک نازک مسئلہ رہا اس لیے اس پر قلم اٹھانا بڑا نازک بلکہ تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے۔ اس لیے کہ یہ مسئلہ دو انتہاؤں کے درمیان ایک راہ اعتدال قائم کرنے کے ہم معنی ہے، اور جب کسی مسئلے کے سلسلے میں دو انتہاؤں کے ماننے والوں نے اپنی بات کو حقیقت سمجھ لیا ہو تو پھر درمیانی راہ اختیار کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے............ مولانا عتیق الرحمن صاحب نے اس کتاب میں تلوار کی دھار پر چلتے ہوئے بھی اپنے قلم کو بڑی حد تک انتہا پسندی سے بچائے رکھا ہے۔''

(ماہنامہ الرشاد اعظم گڑھ۔ بابت اپریل ۹۳ء)

''فاضل مصنف نے دو انتہاؤں کے درمیان ایک ایسی راہ اعتدال تک پہنچنے کی کوشش کی ہے جس سے نہ کسی صحابی رسولؐ کے کردار پر حرف آئے اور نہ بے جا تعصب سے کام لیا جائے۔ وہ یقیناً اس کوشش میں کامیاب رہے ہیں۔''

(ماہنامہ تذکرہ لاہور۔ بابت مئی ۹۳ء)

DESIGNED BY FAISAL WAQAR

PRINTED AT : KAROIB OFFSET PRESS, LKO. PH. : 2629616